

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224272

UNIVERSAL
LIBRARY



نیاز تحقیق

قواعد رسالہ نگار

- ۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے
- ۲۔ رسالہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
- ۳۔ خط و کتابت کے وقت اپنا پتہ فریادری ضرور لکھئے جس پر پتہ فریادری نہیں ہوتا ایسے خط و طے قلم کر دیے جاتے ہیں
- ۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا اس کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
- ۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
- ۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ہفت شمائی تین روپیہ۔ بے دردن ہفتہ سات روپیہ سالانہ۔

تقدیر ہفتہ	ایک مہینہ	نصف مہینہ	بارہ مہینہ	نرخہ سالانہ اجرت اشتہار است	تقدیر ہفتہ	ایک مہینہ	نصف مہینہ	بارہ مہینہ
۱۰ روپیہ	۲ روپیہ	۱ روپیہ	۲۳ روپیہ	(۱۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان	۱۰ روپیہ	۲ روپیہ	۱ روپیہ	۲۳ روپیہ
۲۰ روپیہ	۴ روپیہ	۲ روپیہ	۴۵ روپیہ	تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بے حد نقد کمیشن دیا جائیگا	۲۰ روپیہ	۴ روپیہ	۲ روپیہ	۴۵ روپیہ
۳۰ روپیہ	۶ روپیہ	۳ روپیہ	۶۷ روپیہ	(۳) سیما اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر غور کر سکتا ہے	۳۰ روپیہ	۶ روپیہ	۳ روپیہ	۶۷ روپیہ

جو تھائی قیمت پیشگی آئی لازم ہے نگار ایک کنسی لکھنو جو ایکے ٹکٹ ناظرین

مرزا غالب	نات نعش	مولانا شبلی	سفر نامہ ہر و شام	موازنہ انیس دہرہ	محامد خاتم النبیین
۱۰ روپیہ	۱۰ روپیہ	۱۰ روپیہ	۱۰ روپیہ	۱۰ روپیہ	۱۰ روپیہ
۲۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	۲۰ روپیہ
۳۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۳۰ روپیہ	۳۰ روپیہ
۴۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
۶۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۶۰ روپیہ
۷۰ روپیہ	۷۰ روپیہ	۷۰ روپیہ	۷۰ روپیہ	۷۰ روپیہ	۷۰ روپیہ
۸۰ روپیہ	۸۰ روپیہ	۸۰ روپیہ	۸۰ روپیہ	۸۰ روپیہ	۸۰ روپیہ
۹۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۹۰ روپیہ	۹۰ روپیہ
۱۰۰ روپیہ	۱۰۰ روپیہ	۱۰۰ روپیہ	۱۰۰ روپیہ	۱۰۰ روپیہ	۱۰۰ روپیہ

نگار

1952

۵۱۵ م

۱۹۱۶/۷

۱۲

گھنٹے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان کے پبلشرز کے پاس سے

فہرست مضامین جولائی ۱۹۲۸ء

۸۰	موت (نظم)	۲	ملاحظات
۸۱	غزلیت :-	۵	حیات قومی کے اجزاء ترکیبی
	"	۹	عید کی چاند رات (فسانہ)
	"	۱۸	مراثی انیس کا حیدر آبادی آدیش
	"	۲۶	ہندو مسلم اتحاد ہندی علم و ادب کا مطالعہ
۸۳	"	۳۰	بلاوغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے
۸۴	باب الاستفسار	۴۴	ڈائری کا ایک ورق
۹۳	معلومات	۴۹	فلسفہ مذہب
۹۶	اشتہارات	۵۸	من در چہ خیال خاک چہ خیال فشانہ
		۷۸	فردوس محبت (نظم)
			ردش صدیقی

بھکار

۵۵

ادیترز۔ نیاز فنیوری

جلد ۱۲ جولائی ۱۹۲۸ء شمارہ ۱

ملاحظات

اس مہینہ کی اشاعت سے چودھویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور جبوقت اپنی بے سرو سامانی، کم مائیگی، اور ناکسی پر نگاہ کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا قوت تھی جسے باوجود اسباب کی ہر ممکن ناسازگاری کے مجھے اپنے عزم پر ثابت قدم رکھا اور بھکار کو اس منزل تک پہنچا دیا کہ اب میں اپنے سے بہتر قاید کی ضرورت اس کے لئے محسوس کر رہا ہوں۔ سچ ہے

ہر رشتہ باندازہ ہر حوصلہ ریزند
میں تہ تو نینق خسم و جام ندارد

میں بھکار کو جس سطح تک لانا چاہتا ہوں وہ اس سے بہت بلند ہے جو اسوقت نظر آ رہی ہے اور میں معترف ہوں کہ حوادث و موافق کا مقابلہ کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں کہ آج عملاً اپنے نصب العین کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا، لیکن اس کا ضرور قائل ہوں کہ انسان کی ہر تنہا اگر دل کی فطرت ہو کر رہ جائے تو اک "مستقل حاصل" ہے اور غالباً مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ

برہیں یک آرزو برستہ ام تعمیر دل

بہر حال مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجئے کہ ایک دن وہ ساعت آئے گی جب میں حقیقی منزل میں قدم ہر تہوی کہہ سکو گا کہ
شگفتن گل امید را تماشہ کن

سنگین بت کے سامنے سرعہ خرم کر دینا، آفتاب کو دیکھ کر اُس کے سامنے جھک جانا، آگ کے حضور میں اپنی بیچارگی کا اظہار کرنا، حرم کا طواف، سنگ اسود کا استلام، ان میں سے کوئی بات داخل شرک نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے والے سمجھتے ہیں کہ خدائی طاقت ان میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ ذرائع ہیں خیال میں مرکزیت اور تصور میں اشتداد پیدا کرنے کے شرک فی الحقیقت نام ہے، انسان کے پوجنے کا انسان کو، سر نیاز جکا دینے کا اُس تقدّم شخصی کے سامنے جو دوسرے انسان سے اس کی خصوصیات انسانی تو جھین سکتا ہے لیکن عطا کچھ نہیں کرتا، پھر غور کرو کہ آج کتنے ہیں جو اس شرک عظیم میں مبتلا ہیں اور ہر جماعت نے انسانیت کی کتنی عظیم اشان قربانیوں کے بعد اپنے اپنے بت علیحدہ بنا رکھے ہیں میں عام معتقدات کے خلاف عیسیٰ کی تخلیق و مات کو ایک معمولی انسان کی سی تخلیق و مات کہتا ہوں، لیکن کسی زیدی و حینی کے جوش ایمان میں حرکت پیدا نہیں ہوتی، میں یوسف کے غیر معمولی مَن و جمال سے انکار کرتا ہوں، مگر کوئی میرزا منش کوئی خواجہ زہادہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں بہشت و دوزخ کی مادی حیثیات کو نہیں مانتا، میں حشر و جہاد کا قائل نہیں میں تمام مسائل شریعت کو وقت کے لحاظ سے قابل اصلاح و ترمیم کہتا ہوں، لیکن کوئی اسلام پرست اور محب اسلام مومن ان باتوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، لیکن محمد صہین آزاد کے خلاف، یعنی ایک ایسے شخص کے خلاف جو کسی طرح اکابر امت میں شمار نہیں کیا جاسکتا مختصر الفاظ میں اظہار رائے کرتا ہوں، تو یہاں سے لیکر وہاں تک آگ لگتی ہے، در سگا ہوں کے حجرہ سے لیکر صحافت گاہوں کے ایوانوں تک ماتم بپا ہو جاتا ہے۔

گویا کہ تازہ خون زکشت بر جکیدن ست

یہ کیا تماشہ ہے! یہ کیا عجیب و غریب منظر ہے!!

کیا بت پرستی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے، کیا شرک و بدعت کی تعبیر میں اس سے زیادہ کسی اور دشمن مظاہرہ

کی ضرورت ہے؟

کس قدر حسرت ناک ہے اس قوم کی ہتی باگی جو اپنے کسی فرد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکے، صرف اس لئے کہ اس کو ناکارہ ماننے کے بعد کوئی دوسرا اس کی جگہ پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

آزادی کی آبجیات کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا جواب دینے میں جس وسعت ظرف و نظر سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً داد مستغنی ہے۔ کہنے والا کہتا ہے اور تذکرہ و تاریخ، روایت و مورخیت سے ثابت کرتا ہے کہ آزاد نے فلاں فلاں جگہ تحریف و افتاد کی صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح لکھنے میں اُنھوں نے اپنے پورے قصد و ارادہ کو صرف کیا، لیکن جواب دینے والا ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ دلائل بالکل قطعی و اذعان ہیں، بلکہ وہ اپنا دل صرف مجھے گالیاں دیکر ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ اگر مجھے جاہل کہنے سے آزاد کے سرے یہ تمام الزامات اٹھ جاتے تو اس کی توبت ہی نہ آتی، جب کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسر معائب و نقائص پایا اور ظاہر کیا ہے۔ کیا ایک کو گالیاں دیکر دوسرے کی برتری ثابت کرنا یا زبردست کلیہ ہے کہ میں

کوئی اشتنا ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں !
برقنا ہائے عرفی خستہ می آید مرا

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہر چند گناہم کا ہے لیکن کام کا۔ جناب ذوقی کا فسانہ دو عید کی چاند رات ”فن کے اس شعبہ سے متعلق ہے جسے حقیقیات نگاری کہتے ہیں۔ تجربات و جذبات کا دقیق تجزیہ اور بیان کا وہ اسلوب جو پڑھنے والے کے سامنے تمام کیفیات و مناظر کو پیش کر دے آسان کام نہیں، لیکن مجھے مسرت ہے کہ لکھنے والے نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ قدر تا مٹل پیدا ہوئے ہیں۔

مراثی انیس کے حیدر آبادی اڈیشن پر جناب احسن لکھنوی کا مضمون نہایت کار آمد ہے۔ کاش زیادہ محیط ہوتا۔ ہندو مسلم اتحاد اور ہندی اور کچھ مطالعوں پر جناب راج بہادر صاحب ام لے کا مقالہ خوب ہے۔ یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی، معاشرتی، تاریخی اور ادبی لٹریچر کا مطالعہ کرے جس طرح ایک ہندو کا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اُن کے لٹریچر کو دیکھے۔

سیاحت قراس عینے میں بھی ختم نہیں ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ آئندہ ماہ میں اس کا ختم ہو جانا یقینی ہے۔
جناب مجنوں گورکھ پوری کا فسانہ بہت دنوں کے بعد خالص ہو رہا ہے لیکن ”درست آید“ کا پورا مصداق ہے۔ مجنوں نے حسن کے ساتھ ساتھ اس بار ڈی کے فلسفہ ”بندگی و بیچاگی“ کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، اس سے نہ صرف ان کی وسعت مطالعہ بلکہ حد درجہ وقت احساس و تیز آگاہی ثابت ہوتی ہے۔ یہ فسانہ سمبر میں ختم ہوگا۔
اب لا استفسار میں معاذ کے متعلق میں نے اپنے خیالات کسی کی طرح سمیٹ کر اس مرتبہ ختم کر دے ہیں۔ اگر مولوی غلام ربانی عزیز کو اب بھی کچھ شہادت ہوں تو وہ خط و کتابت کے ذریعہ سے مل سکتے ہیں۔

فلسفہ مذہب میں اس مرتبہ بعض خیالات جناب سید مقبول احمد صاحب نے ایسے ظاہر کئے ہیں جسے مجھے اتفاق نہیں ہے ارادہ ہے کہ اس مضمون کے ختم ہونے کے بعد اس پر ایک محاکمہ کروں۔
دوش صدیقی کی نظم فردوسِ محبت بہت پاکیزہ و رنگین ہے۔ غزلوں میں حافظ غازی پوری کے کثر اشعار اور بعض بعض جگہ، اثر ناقلین اور باتسوط کی بھی خوب ہیں۔

عشرت حین صاحب نقوی صاحبزادہ سید جالب دہلوی، ڈیٹر ہوم لکھنؤ نے ایک رسالہ کیا کے نام سے بڑی تقیص پر یہاں سو جاری کیا ہے اور اس میں شک تیس کہ مضامین کے فراہمی اور ان کی ترتیب ذمہ دار کا کافی محنت و سلیقہ سے کام لیا گیا ہے اس وقت ملک کو ایسے برائی جو ہمارے اندر صنعت، حرفت و تجارت کا ذوق پیدا کریں اور صحیح مشورہ دیکیں سخت ضرورت ہے، ہمیں امید ہے کہ جناب جالب ایسے تجربہ کار صحافی کی نگرانی میں یہ رسالہ بہت مفید خدمت ملک کی انجام دے گا۔ منبہ رسالہ کیا لکھنؤ سے نمونہ طلب کیا جاسکتا ہے۔

حیات قوی کے اجزاء ترکیبی

اور

ہیئت اجتماعی کے اصول استبائی

تمہید جو چیز انسان کو کرہ ارض کی اور تمام مخلوقات سے جدا دیمیز کرتی ہے، وہ اس کا ضرورت سے زیادہ محتاج دیکس ہونا ہے۔ لیکن کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ جو مخلوق اپنی فطرت و خلقت کے اعتبار سے اس ”درجہ ضعیف“ اس قدر حقیر اور اس حد تک کمزور ہے اسی کو اشرف مخلوقات اور غایت تخلیق بتایا جاتا ہے!

یقیناً یہ نہایت عجیب بات ہے، لیکن کیا اس کی حقیقت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ ایک طرف اس کی ہیکسی و بجا پرگی کا منظر تو یہ ہے کہ جس وقت وہ عالم وجود میں آتا ہے تو ایک ایسی لالینی شے ہوتا ہے کہ عالم کا ایک ایک حادثہ طبعی دم زدن میں اسکو فنا کر دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس میں اتنی بھی قوت و صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ادنیٰ سی حرکت اپنے تحفظ یا بقا کے لئے کر سکے بر خلاف حیوانات و نباتات کے کہ شروع ہی سے ان کو اپنے بقا کے لئے اپنے اوپر اعتماد کرنا ہوتا ہے اور عطائے قدرت سے فائدہ اٹھانے کی ان میں اہلیت ہوتی ہے۔

پھر اسی انسان کی قوت و جبروت کا دوسرا منظر یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف وہی حیوانات، نباتات، جمادات جو ابتدائیں اس سے زیادہ مستقل و برتر نظر آتے تھے، انکے زیر اقتدار ہوتے ہیں، بلکہ تمام فضا میں اس کی حکومت نظر آتی ہے اور نوامیس فطرت سے وہ اس کام لینے لگتا ہے، گویا اید و ازل کا وجود اسی سے عبارت ہے

بہر حال یہ مناظر اس قدر عام ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی طویل بیان کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کی، لیکن اس سے کیا درس اخلاق پیدا ہوتا ہے؟ یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

انسان کی تخلیقی بجا پرگی اور ارتقائی عظمت کا تقابل ہم کو بتاتا ہے کہ گو وہ پیدا ہوتا ہے تنہا ہی، لیکن اس کی انفرادیت ایک ایسی ناقابلِ توجہ چیز ہے جس کو کبھی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کی خلقی کمزوری ہی دلیل ہے اس امر کی کہ وہ محتاج ہے نظامِ تمدن کا، ہیئت اجتماعی کا، تعاون باہمی کا اور ہر اس بات کا جو ایک کو دد، دو کو چار اور چار کو آٹھ بناتی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک انسان انفرادی حیثیت سے جن خصوصیات کا مالک ہوگا، وہی خصوصیات ہیئت اجتماعی کو بھی حاصل ہونگی اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ”بچہ انسان کا باپ ہے اور ایک“ انسان متقل قوم ہے۔ اگر ایک بچہ کی تربیت خراب ہو رہی ہے تو اسکے یہ سننے ہیں کہ قوم کی ترکیب میں ایک داغدار و میوب عنصر شامل کیا جا رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ صرف ایک فرد کی خرابی سے

قوم کو کسی وقت کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، کیونکہ کسی ایک فرد کی خرابی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک ایسا سلسلہ خرابیوں کا پیدا ہو جاتا ہے کہ صدیوں تک ختم نہیں ہوتا اگر آپ نے کبھی تالاب کے پانی میں کنارے کی طرف ایک کنگری بھینگی ہوگی تو معلوم ہو گا کہ اس سے لہریں پیدا ہو کر کس طرح انکا سلسلہ دوسرے ساحل تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی صرف ایک اینٹ کی خرابی سے ساری عمارت کا گر جانا بھی آپ نے سنا ہو گا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کا نقصان محدود ہو اور صرف ایک ہی شخص کو اس سے نقصان پہنچتا ہو۔ اسی طرح دنیا کا کوئی اچھا فعل ایسا نہیں ہے جس سے جماعت کی جماعت ناپید نہ اٹھاتی ہو

جنگیز خاں ایک ہی شخص تھا لیکن اس کے نقصانات کے بارے میں دنیا جیج اٹھی اور مسیح و محمد کا وجود بھی ایک ہی تھا لیکن دنیا میں امن کا ختم انھیں کی وجہ سے بار آور ہوا۔ صرف ایک نیرونے روم کی تباہی میں جتنا حصہ لیا کسی سے مخفی نہیں اور ایک مارکوئی اور ایک اڈسین کی ذات نے جو اپنی ترقی کی انسان کے لئے کھول دیں، وہ بھی سب کو معلوم ہیں۔ بہر حال فرد کے اصلاح خاندان کی اصلاح ہے۔ اور خاندان کی اصلاح قوم کی اصلاح اور قوم کی اصلاح ملک کی فلاح ہے۔

جس طرح ایک درخت عبارت ہے تنہ، شاخ، پتی، پھول اور پھل سے اسی طرح ہیئت اجتماعی مرکب ہے مختلف افراد سے جسکی خدمت شاخ، پتی وغیرہ کی طرح بالکل علیحدہ علیحدہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس سے ہر ایک شخص کی علیحدہ علیحدہ انفرادی حیثیت بھی ظاہر ہوتی ہے اور من حیث المجموع اس کا تعلق بھی ہیئت اجتماعی سے ثابت ہوتا ہے۔ الغرض فرد اور جماعت کے درمیان ایسا مضبوط تعلق، اتنا شدید ارتباط ہے کہ علمی طریقہ سے ایک کا بغیر دوسرے کے پایا جانا ناممکن ہے۔ آدم کے لئے حوا کا پیدا کیا جانا حقیقتاً استعارہ ہے اس رمز کی طرف اور تعلیم ہے اسی تعاون و اجتماع کی۔

تعاون سے مراد کیا ہے؟ مختلف افراد انسانی میں اعمال کی تقسیم ہر عمل کے طریق کار کی تعیین اور کسی غایت یا غرض مشترک کا وجود جس کے حصول کے لئے افراد تعاون سے کام لیں۔

یہ دونوں اساسی اصول ایسے ہیں کہ نہ صرف جماعت انسانی بلکہ عالم حیوانی میں بھی ان کا وجود پایا جاتا ہے اور خود مختلف اعضاء حیوانی کی ساخت اس امر کی شاہد ہے کہ فطرت بھی انہیں اصول کی کار بند ہے۔ اور اس پر غور کرنے سے ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا تنہا مالک نہیں ہے بلکہ ساری قوم اُس کی مالک ہے اور اس طرح نہ اپنے تجربہ عقل و عمل سے وہ تنہا قایم اٹھا سکتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر خود کشی کا اقدام قانونی جرم قرار دیا گیا اور اشتراکیت سرمایہ داری کی دشمن ہے۔ انسان جو دس وقت تمام عالم پر چھا یا ہوا نظر آتا ہے اُس کا سبب سوائے قوت عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور اعمال ہی کی تفریق سے دارج انسانی متعین کئے جاتے ہیں۔ پھر جب ہم اسباب عمل پر غور کرتے ہیں تو اس کی محرک تین چیزیں نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز تو اس کی طبعی فطری قوت ہے جس میں بچہ، جوان، دیوانہ، عاقل، عالم و جاہل سب برابر کے شریک ہیں اس کو گویا موڑ یا انجن کہنا چاہئے، دوسری چیز جلد منفعت ہے اور تیسری ادا لے فرض۔ یہ دونوں اگر زیادہ وسعت نظر اور بلند خیالی

کے ساتھ کام میں لائے جائیں تو تعاون کی وہی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مقصود آفرینش ہے اور جو ایک قوم و ملک کی ترقی کی ضمانت ہیں اگر توجہ ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ صرف اپنی زندگی آرام سے بسر کر لجائیں، تو اس کو نہ صرف خود غرضی کہیں گے بلکہ غیر فطری بھی اور ایک انسان کا بحیثیت انسان ہونے کے سبب زیادہ ذلیل جذبی یہی ہے۔ ایسے لوگ زیادہ وہ ہوتے ہیں جو بزدلی اور با شانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کا وجود قوم کے لئے مادہ فاسد کا حکم رکھتا ہے جس کو جلد سے جلد نکل جانا چاہئے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے ساتھ اپنے متعلقین یا بیوی بچوں کی راحت و آسائش کا خیال کرتے ہیں۔ اور ان کی تعداد زیادہ ہے، ہر چند یہ قسم اول کے انسان سے بہتر ہیں، لیکن غایت آفرینش ان سے بھی پوری نہیں ہو سکتی ایسے لوگ صرف اس حد تک کہ ان کے عایدہ کا تعلق ہے بہت اچھے، وسیع النظر، ایثار پسند ہوتے ہیں، لیکن گھر کی چار دیواری سے باہر وہ ساری دنیا کے لئے خود غرض سنگدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ بلند مرتبہ والے انسان ہیں جو اپنی ذات، اپنی اغراض کو اپنی قوم کی فلاح کے لئے نظر انداز کر دیتے ہیں، اور ان کے ہر فعل و عمل کا نصب العین قوم کی خدمت ہوتی ہے، لیکن ایک درجہ اس سے بھی بلند ہے اور یہ کہ قوم و ملک کی تخصیص بھی باقی نہ رہے اور تمام اپنا جتنی بلکہ اس سے بھی زیادہ سارا عالم حیات پیش نظر رہے۔ یہ مرتبہ سوئے انبیاء و رسل کے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔

بہر حال انسانی تفوق و برتری کے مدارج اس کے حسن ظاہر کی لحاظ سے قائم نہیں ہوتے بلکہ حسن فطرت کے اعتبار سے ان کی تعین ہوتی ہے اور ایک صحیح تعلیم و تربیت کا مقصود یہی ہونا چاہئے۔

نیٹے کی یہ تعلیم کہ ”قوی“ کمزور کو جذب کر لیتا ہے، فنا کر دیتا ہے، ممکن ہے بہ لحاظ واقعات صحیح ہو، لیکن بہ لحاظ اخلاق نہایت ہلک قسم کی تعلیم ہے۔ یقیناً اس نے یہ نظریہ ڈارون کے اصول ”تنازع لبقا“ سے اخذ کیا ہے لیکن سخت غلط فہمی کے ساتھ۔ ہر چیز اپنی بقا و قیام کے لئے کوشش کرتی ہے، یہ بالکل صحیح بات ہے، قوی و ضعیف کے تصادم میں اکثر دہشتہ ضعیف ہلاک ہو جاتا ہے یہ بھی درست ہے، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ قوی کو ضعیف کے ہلاک کر دینے کا فطری حق حاصل ہو گیا جب کہ قوی اپنے ضعیف انبار قوم کے نبھانے اور ہلاکت سے بچانے کی تدبیر نہ کرے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اصول تعلیم و تربیت نہایت حکم و معیاری ہوں، ہمارے ہاں سب سے زیادہ جس چیز کا فقدان ہے وہ صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ تعلیم و تربیت کا ایک مقصود تو تکمیل فنون ہونا ہے اور دوسرا صحت اخلاق اور بدستوری سے ہمارے ہاں ان دونوں میں کوئی مقصود حاصل نہیں ہوتا، جب جاہل ان دونوں کا شام کہ اس میں مغرب بھی ہنوز کامیاب نہیں ہوا۔

بچہ کی تعلیم و تربیت کی اولین جگہ ماں کی گود ہے، یہ تمام اقوام عالم کا مسلمہ مسئلہ ہے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دنیا بچوں کی تعلیم کا تو درس دیتی ہے لیکن اس کی اصلاح کی طرف مطلق توجہ نہیں جو بچہ کی اولین درس گاہ ہے۔

اس وقت تعلیمی مسئلہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے اور اسی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے بحالت موجودہ جو مدارس یا کالج ان کے پائے جاتے ہیں وہ بالکل غلط اصول پر قائم ہیں اور ان کی تعلیم بجائے اس کے کہ لڑکیوں کو ان کی

ان بننے کا اہل بنائے، سرے سے ماں ہی نہیں بنانا چاہتی اس میں شک نہیں کہ ان مدارس میں لڑکیوں کو خوبصورت معاشرت کا درس ضرور دیا جاتا ہے ان کو یقیناً وہ ادائیں بتادی جاتی ہیں جن سے وہ اپنے شباب میں اک ساحرانہ کیفیت پیدا کر سکتی ہیں، اسی کے ساتھ ان کو ظاہری نمود و آرائش کے بھی تمام طریقے سکھا دئے جاتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان باتوں کو ماں بننے سے کیا واسطہ ہے اور اخلاق کا تعلق ان سے کس حد تک ہے۔

موجودہ تعلیم لڑکیوں کو خوشنما ضرور بتاتی ہے، لیکن نہ خوشنما ہونا اچھا ہونا ہے اور نہ حسین بننا مفید بننا۔ پھر جب ہر حسین چیز مفید نہیں تو کلیہ قائم کرنے کی غرض سے اس حقیقت کو ماننا پڑیگا کہ حسین وہی ہے جو اچھا اور مفید ہو۔

انگریزی تعلیم، لڑکیوں کے لئے ہر چند بُری نہ ہو، لیکن بغیر ضروری یقیناً ہے کیونکہ جہاں تک درستی اخلاق کا تعلق ہے وہ اسے حاصل نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ انگریزی تعلیم بڑی حد تک اخلاق سے بیگانہ بنا دیتی ہے

درستی اخلاق کا تعلق نہ قانون سے ہے اور نہ تحویلوں و تربیت سے، بلکہ وہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق صرف مذہبی روحانیت سے ہے اور انگریزی تعلیم سے مذہبیت کو جس قدر نقصان پہنچ رہا ہے ظاہر ہے۔

اس لئے غور طلب امر یہ ہو کہ لڑکیوں کی تعلیم کن اصول پر ہونی چاہئے اور اگر سب سے پہلے مذہبی تعلیم ان کے لئے ضروری ہے تو اسکی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

اگرچہ صحیح یہ کہ مذہب نام کسی کتاب کا نہیں، بلکہ صرف افعال و اعمال کا ہے تو سب سے پہلے ہم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسی چیزیں کا فروغ کرنا ہے جو اپنے اوقات و شاعغل کے لحاظ سے مذہب کی پابند ہوں اور کوئی حرج نہیں اگر وہ ایک حد تک آزاد خیال نہ ہوں

ہم کو ایسی استانیوں کی ضرورت نہیں جو ریشمی ملبوس میں ملفوف ہوں، زمین و آرائش کی تصور ہوں، لیکن اخلاق کے لحاظ سے وہ نہایت درشت و مکروہ نظر آئیں، ستھر اپن اور صفائی نام نہ خوش ادائی کا ہے، نہ لباس کی اچھی ترامش خراش کا اور نہ

ٹھیکڑی مانگ اور بانگے جوڑے کا، بلکہ اس سے مراد ہے وہ پاکیزگی نفس جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو پسندیدہ بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک نہایت معمولی سی بات کو لے لیجئے کہ وہ عورتیں جو نماز کی پابند ہیں ہمیشہ صاف ستھری رہتی ہیں اور

یہ عادت ان میں چونکہ مذہبی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اس قدر محکم و پایدار ہوتی ہے کہ معمولی اصول معاشرت کے ذریعہ سے استحکام پیدا نہیں ہو سکتا پھر اسی کے ساتھ جب ان کی رفتار و گفتار پر نظر جاتی ہے تو وہاں بھی روحانی خلوص نظر

آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل میں گھر کئے لیتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو ایک بچہ کے دل میں نقش کرتی چاہئے وہ خدا کا خوف اور اپنے انباء و جنس کے ساتھ ہمدردی و رحمت کا جذبہ ہے اور یہی دو چیزیں اخلاقیات کی جہان

ہیں، لیکن کیا موجودہ انگریزی مدارس میں اس تعلیم کی توجہ کی جاتی ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں وہاں ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنی میں خدا کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں اور مدارس کی تعلیم اس درجہ ناقص ہو تو سوائے اسکے کہ کوئی چارہ نہیں کہ لڑکیوں کو مدارس بھیجنے سے باز رکھا جائے اور خود گھر پر انکی تعلیم کا انتظام کیا جائے اس کے لئے جو عصاب میں نے تجویز کیا ہے وہ عام ارتقا و ذہنی کے لحاظ سے باوجود غیر ضروری ہونے کے اسی حد تک محکم ہو گا کہ اگر یہ بحالہ اخلاقی تعلیم کے توفیر اس کو ملنے ہو نا ہی چاہئے کیونکہ اس کی بنیاد بالکل مذہب پر قائم کی گئی ہے۔

پھر اگرچہ تعلیم کی ایک قسم کثرتوں کا اور پھر اسکے جدا جدا اظہار کا اور لڑکیوں کی موجودہ تعلیم میں کیا کیا نقص ہیں اور ان کے مضمرات کے دور کر دینے کی کیا کیا ضرورت ہے اور اگر سب سے پہلے مذہبی تعلیم ان کے لئے ضروری ہے تو اسکی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

عید کی چاندرات

(فسانہ)

تانگہ نہایت تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور چڑے کا جھوٹا لکس جے اسٹیشن پر جلدی کی وجہ سے میں نے تانگہ کے اندر بے ڈھنگے پن سے الٹا سیدھا رکھ دیا تھا، پاؤں کے قریب تانگہ کے ہر جھٹکے کے ساتھ جھکے کھارہا تھا۔ دونوں طرف کی دوکانیں اور مکانات سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹ رہے جاتے تھے۔ اس وقت مجھے اتنا ہوش نہ تھا کہ میں بازار کی کسی چیز کو ابھی طرح نگاہیں جما کر دیکھوں۔ صرف ایک خیال، ایک نشہ میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ بازار میں کافی بیڑے تھے اور بھیڑ کے ساتھ سووے والوں کی بھار، دوکانداروں کی آوازیں، راہ گیروں کی صدائیں سبھی کچھ شامل تھا لیکن جس طرح ایک شرابی کو اپنی ترنگ میں گرد و پیش کی تمام چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح بازار کا تمام منظر میری نظروں میں ایک بے رنگ و دھندلا سا خاکہ تھا جو جلدی جلدی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مجمع کی پیچ بھار بھی میرے کانوں تک پہنچنے پہنچنے اس قدر کمزور ہو جاتی تھی جیسے کچھ نیند میں کوئی شخص بہت دور کی آوازیں سن رہا ہو۔ بازار کے اس بے معنی طے جلے شور میں صرف تلنگے دسے کی ”ہوٹو بھو“ البتہ صاف سنائی دیتی تھی درنہ اس کے علاوہ مجمع کا تمام شور و غل میرے کانوں کے لئے شہد کی مکھیوں کی بھینھنا ہٹ سے زیادہ نہ تھا۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اسٹیشن سے مکان تک پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگی اتنا البتہ یاد ہے کہ جب تانگہ ایک مقام پر جھٹکے کے ساتھ رک گیا تو میرے سامنے وہ گلی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ ایک جہت کے ساتھ تانگہ سے کود پڑا۔ سوٹ لکس ہاتھ میں لٹکایا لکسل کو کاندھے پر ڈالا اور تلنگے دے کو جلدی سے کرایہ دیے ہوئے میں نے گلی کا رخ کیا۔

گلی کے موڑ پر میونسپلٹی کی لائٹیں چاروں طرف اپنی زرد دم روشنی پھیلا رہی تھی۔ میں بے صبری کے لیے لیے قدم رکھتا ہوا گلی میں گھس گیا۔ میری رفتار کے ساتھ گلی کی دیوار پر میرے قدم کا سایہ پڑا ہوتا جاتا تھا اور میں اپنے قدموں میں ایسی بستی محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے جسم کی رگوں میں پارہ بھر دیا ہو۔ گلی کے مکانات میں بات چیت اور قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ بعض کے دروازے بند تھے اور بعض کے ادھ کھلے دروازوں میں سے اندر کی روشنی نکل کر گلی کی روشنی میں تحلیل ہو جاتی تھی آج اس محلے میں معمول سے زیادہ چل پھل تھی۔ دو منزلہ مکانات کی کھڑکیاں عموماً کھلی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے حقے کی گڑ گڑا ہٹ اور برتنوں کی کھڑ بڑکی آوازوں میں شہرے دشمن بچوں کی جھج بھار کی صدائیں آ رہی تھیں۔ آج رمضان کی آخری تاریخ تھی اور یہ تمام رونق و چل پھل اس پر مسرت مبارک دن کا پیش خیمہ تھی جو سال بھر کی طول طویل انتظار کے بعد نصیب ہوتا ہے۔

محلے والوں کی یہ پُر انبساط مصروفیت اور بچوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں میرے لئے اس وقت خاص طور پر بہت پر معنی تھیں

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس گلی کی مدد دیوار تک کو خبر ہے کہ میں آج کیوں اس قدر خوش ہوں۔ مجھے گروہ پیش کی تمام فضا اپنے مسرور خیالات میں غرق نظر آتی تھی۔ میرے دلی جذبات اس وقت کیلئے ہر تفصیل باکل فنون ہے، اور ممکن ہے تفصیل ان کی لطافت بھی ضائع ہو جائے۔ بس اتنا کچھ لینا کافی ہے کہ میری رگ رگ میں مسرت و شادمانی کا وہ نقشہ چھایا ہوا تھا جو ایک ہندوستانی نوجوان کو نئی نئی شادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں عید کرنے کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا امتحان قریب تھا اس لئے اپنی پرانی کاہر ج کر کے اپنی بیوی سے ملنے کے لئے پورے ایک دن اور ایک رات کا سفر کر کے اس کے پاس پہنچنا کافی خطرناک جرات تھی۔ لیکن وہم ہی کیا جس کے سر انجام میں خطرے سے مقابلہ کرنا پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ محض نقصان ہی کے خیال نے اس ملاقات کی مسرتوں کو وہ لذت آخریں بنا رکھا تھا

خدا خدا کر کے یہ مسافت بھی طے ہوئی اور میرے خسر کا مکان آگیا۔ میں دبے پاؤں مردانہ مکان میں داخل ہوا اور سوٹ کیس کو زمین پر رکھ کر ماتھے پر سے پسینہ پونچھنے کے لئے شیر دانی کی جیب میں سے رو مال نکالا۔ توقع کے خلاف آج دیوان خانہ میں باکل سناٹا تھا میرا خیال تھا کہ جس وقت میں یہاں پہنچوں گا حسب معمول میرے خسر صاحب گلو بند لیٹے سیاہ کمائی کی عینک لگائے کمرے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہوں گے۔ وہ ایک بڑے گاؤں تکیہ سے سہارا دئے ہوئے ہوں گے۔ داہنی طرف ایک اونچا سا مراد آبادی گال دان، بائیں طرف تازہ ہرے پانوں سے بھرا ہوا ایک نقش خاصدان رکھا ہوگا۔ قالین پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ان کے ادھر عمر کے دوست بیٹھے ہوں گے ایک کو نہ پر بادامی کا غد پر چھپی ہوئی چند پرانی مذہبی کتابوں کا ڈھیر ہوگا۔ ہوا میں حقہ کی نفیس تبا کوکی خوشگوار خوشبو پھیلی ہوئی ہوگی اور کھانا کھانے کے اپنے دوستوں سے کسی غیر دلچسپ موضوع پر باتیں کر رہے ہوں گے۔ لیکن یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صدومکرہ بند تھا۔ برآمدے کے درمیانی دریں لوہے کی سلاح سے ڈیز کی ایک لائٹن ٹنگی ہوئی تھی جسکی بتی بجھی تھی اور اس کی ہلکی کمزور روشنی نصف صحن تک پہنچ کر غائب ہو جاتی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خیراتی کی کوکھڑی میں بھی سناٹا تھا۔ اندر کے مکان سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی دیواروں پر ایک ناقابل بیان چپ مسلط تھی۔ البتہ باہر گلی میں کتوں کی سسل بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

میں نے سوچنا شروع کیا ”یہ معاملہ کیا ہے؟ آج چاند رات ہے اور کل عید ہونے والی ہے۔ قاعدہ سے یہاں آج خوب جہل پل ہونا چاہئے تھی۔ زنان خانہ سے بچوں کے لڑنے بھڑنے اور غور بجانے کی آوازیں آنا چاہئے تھیں۔ ہر طرف نقل و حرکت، مشغولیت و مصروفیت کی علامات ہونا چاہئے تھے۔ مگر یہاں تو قیامت کا سناٹا ہے۔ میں زنانہ مکان کی طرف بڑبا اور آواز بڑبڑا کر کھنکھار کر گلا صاف کرنے لگا۔ اندر سے میرے خسر کے چھوٹے بچے کی رونے کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی ان کی لوری اڑھٹھنی جھنکار ایک لمحے میں بچہ خاموش ہو گیا اور فضا میں گلی سی ڈراؤنی خاموشی پھیل گئی میرا دل بیٹھنے لگا۔

میں نے بہت ہمت کر کے کمزور آوازیں خاموم کو بکارا جسے سن کر اس کا نو سال کا لڑکا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی بغیر کچھ کہنے کے پھر مکان میں گھس گیا اب میری گھبراہٹ اور زیادہ بڑھنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری سانس سینے میں اڑ رہی ہو۔ تھوڑی

دیر میں شاید اندر میرے آنے کی اطلاع کر کے وہ اچھٹا کودتا باہر آیا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر اور کبیل کا ندھے پر سے گھسیٹ کر خوش خوش اندر بھگتے لگا۔ میں نے اس کے سوتکھے ہونے زرد رنگ کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ شاید اس غیر معمولی سنائے کی کوئی تاویل مجھے اس کے بشت سے حاصل ہو سکے بظاہر میرے آنے کی اسے خوشی تھی اس لئے کہ وہ برابر مسکرا رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس سے کچھ پوچھوں لیکن جب تک میں اس سے کوئی سوال کروں وہ ”میاں اندر آئے“ کہتا ہوا اچھلاوے کی طرح دروازے میں غائب ہو گیا۔

میرے قدم بجا ہی ہو رہے تھے اندر دل میں ان تکلیف دہ خیالات کی بھیر مڑتی جو عموماً امید و بیم کی باہمی کشاکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں آرزوؤں کا ایک طوفان لے کر اس مکان میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں کی براسرا خاموشی نے میرے دل کو موسنا شروع کر دیا۔ درکے کے مسکراتے ہوئے چہرے سے البتہ کچھ ڈھارس بندھتی تھی لیکن اس کا اعتبار ہی کیا آخر بچہ ہی تو ہے۔ میں نے چپکے چپکے دل میں دعا مانگنا شروع کی کہ خدا کرے اس سنائے کی وجہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو اور مجھے ناامیدی کا سامنا کرنا پڑے مجھے طرح طرح کے خیال آنے لگے اور ایک لمحہ میں جس میں نے بدقت مردانہ مکان کے صحن سے لے کر زنا خانہ کے چوکھٹ تک کا فاصلہ طے کیا میرے دماغ کی آنکھوں کے سامنے سیکیوڈس پتیلی مناظر کیے بعد دیکھے گزر گئے۔ ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے زنا مکان کے سامنے دروازے والاں میں تخت کی صاف ستھری چاندنی پردہ بانی رنگ کا ڈوپٹہ اوڑھے میری بیوی اپنی نازک لائبی انگلیوں سے پان بنا رہی ہے۔ دوسرے لمحہ مجھے نظر آیا کہ تمام زنا خانہ خالی بڑا ہوا ہے۔ ہر طرف سنائے اور خاموشی کا دور دورہ ہے۔ دروازہ پر اداسی بھائی ہوئی ہے اور مکان کے کونے کونے سے بے رونقی اور تنہائی کے آثار برس رہے ہیں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ نہیں یہ سب میری نگاہوں کا دھوکہ تھا۔ وہ کیا سامنے چہرے پر میری خوشدامن کھڑی ہوئی کل کے اشتغالات کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہیں دانتے طرف والے کمرہ میں خوب تیز روشنی ہو رہی ہے۔ میری بیوی کا چہرہ پر اجسم خوبصورت نچوڑار کمان کی طرح ایک بڑے سے نرنگ پر جھکا ہوا ہے۔ اور وہ اس میں سے ایک ایک کر کے عید میں پہنے کے لئے پیرے چھانٹ رہی ہے۔ زنا خانہ کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے یہ بیوی بھی خواب کی طرح دھندھلا ہوتے ہوئے آخر غائب ہو گیا اور میں گھبرائے ہوئے قدموں سے مکان کے اندر داخل ہوا۔

صد درالان میں دیرسی روشنی ہو رہی تھی۔ اناچے کو گود میں لے ہوئے ایک پلنگ پر بیٹھی گھٹنا ہلا کر اسے سلا رہی تھی۔ بازو دالے دونوں کمرہ میں اندھیرا چڑھا تھا۔ سامنے والے کمرے کے دروازے بند تھے صرف ایک بیچ والا کبوتر کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانہ میں کھانا پکانے والی خادمہ چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

میں ابھی نصف صحن تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ کوٹھے پر سے میری خالہ کی آواز آئی۔ ”میاں ادھر تیرے پر چلے آؤ۔ اس طرف تمہارا سامان بھی نہیں منگوایا ہے“

میں اپنا رخ بدل کر کھٹ کھٹ کرتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ یہ محنت کچھ زیادہ سخت نہ تھی لیکن اس وقت بدحواسی کی وجہ سے میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچتے پہنچتے میں اچھا خاصہ ہانپ رہا تھا اور سر کے بالوں کی جڑیں پسینہ سے بیگی ہوئی تھیں۔ ”دس بجے والی گاڑی سے آئے ہو؟“ میری خالہ نے سر سے پیر تک مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”جی ہاں آج گاڑی کی قدر

دیر کر کے آئی۔..... میری بے صبری ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مکان کی خاموشی دیکھ دیکھ کر میرا دم اٹھاتا تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے سوال کیا ”آج یہاں اس قدر سناٹا کیوں ہے۔ جیسے سارا گھر خالی پڑا ہوا ہو۔“ میری خالہ بریلین۔

”تمہارے خسر حکم صاحب کہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ تمہاری خوشدامن کاجی نہیں اچھلے۔ تمام بدن میں درد ہے کچھ حرارت بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بچاری اوڑھے پیٹے نیچے کمرے میں پڑی ہیں بجوں نے عید کی خوشی میں اس قدر ادھم بجا رکھا تھا۔ اس قدر آفت برپا کر رکھی تھی کہ خدا کی پناہ! تمام صحن میں کودتے بھرتے تھے چیخ بچا کر سے سارے مکان کو سرسپا اٹھالیا۔ وہ توجہ میں خوب بلی جھکی اور ایک ایک کو کچرہ کر دبر دستی لٹایا ہے تب کہیں کوئی دس منٹ ہوئے سب سب سوئے ہیں۔ تمہاری ساس کی ماندگی کا خیال تھا۔ نہیں تو اشتہر کئے بچوں ہی کی ذات سے تو چاند رات میں جھل جھل رہتی ہے۔ نفیس بوا مغرب کی نماز ہی کے وقت سے اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ کتنی تھیں کہ اُسے عید کے لئے پان پتے کا خرچ دے آؤں۔..... اور میری بیوی؟ میری بیوی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گھر کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کا حال بتا گئیں، لیکن نہ ذکر کیا تو اسی کا جس کے لئے میں نے ان سے یہ بات پوچھی تھی۔۔۔۔۔ خسر دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ خوش دامن کی طبیعت خراب ہے بچے سو گئے نصیباً اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ لیکن آخر میری بیوی کہاں ہے؟ اس کا کیا حال ہے؟ میں نے تو گھر میں سناٹے کا سبب اسی لئے دریافت کیا تھا کہ خالہ میری بیوی کا ذکر بھی اسی سلسلے میں کریں گی لیکن انھوں نے اشارتاً کنایتاً بھی ان کا نام نہ لیا۔ تو پھر کیا وہ ابھی تک فیض آباد سے واپس نہیں آئیں؟ لیکن انھوں نے تو لکھا تھا کہ وہ عید کے دور در پہلے بنارس ضرور پہنچ جائیں گی پھر آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

میری شادی ہوئے ابھی صرف دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اپنی نئی شریک زندگی کے ساتھ شادمانی اور سرشاری کے دو مختصر مہینے گزارنے کے بعد کالج کھلا ہونے کی وجہ سے مجھے مجبوراً اپنی بیوی کو کچھ عرصے کے لئے الوداع کہنا پڑا تھا۔ میری بیوی کو میری والدہ اپنے ساتھ فیض آباد لے گئیں اور میں طالب علمانہ زندگی کی بے ثنی جاکڑ بندیوں کو سیکڑوں کو سنے دیتا ہوا دہلی چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر تنہائی اور جدائی کی کوفت کو دور کرنے کا تہا نہ میری بیوی کے وہ محبت بھرے خطوط ہوتے تھے جن کے ایک ایک حرف سے شریفاتہ سنوائی جذبات کی ہلک آتی تھی۔ میں ان کے خطوط کے لئے دیوانوں کی طرح بے چین رہا کرتا تھا اور اس زمانہ میں کالج کے ڈاکے کی دقت میرے دل میں کسی جگہ سے کم نہ تھی جس کے ہاتھ میں میری قسمت کا فیصلہ دے دیا گیا ہے۔ میری بیوی نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ عید کے دور در پہلے فیض آباد سے بنارس چلی جائے گی اور دے دے بند بندہ نظموں میں یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ میں بھی عید کی تعطیل میں بنارس آجاؤں۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت آرزوؤں اور امیدوں کا سمندر میرے سینہ میں جھکولے کھارہا تھا اور میں یہ معلوم کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا کہ میری بیوی وہاں موجود ہے یا نہیں! خالہ نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اب آخر کس طرح پوچھوں۔ ان کے علاوہ دہان کوئی دوسرا بھی موجود نہیں جس سے کچھ پتہ چلے اور اپنی تمام آرزو و مزا جی اور روشن خیالی کے باوجود مجھ میں ہرگز اتنی ہمت نہ تھی کہ میں جی کڑا کر خالہ سے اپنی بیوی کے متعلق کوئی سوال کروں۔ ہندوستانی معاشرت کی بے ڈھنگی پابندیوں نے میرے بوں پر ایسی

مرنگا دی تھی — جسے میری بیباک جرات بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔

”کھانا کھاؤ گے۔ یا پہلے چائے منگاؤں؟“ میری خالہ نے پوچھا۔

بھاڑ میں جائے چائے، اور جنم میں کھانا! جب دہی یہاں موجود نہیں جس کے لئے اتنے دور دراز کے سفر کی صورتیں چھیلیں پڑ پائی کا ہرج کیا تو بھر دنیا کی ساری راحتیں بیکار ہیں۔ میں یقیناً سفر کی وجہ سے بہت خستہ ہو رہا تھا اور اس مکان کو دور کرنے کے لئے گرم چائے کی ایک پیالی سے بہتر کوئی علاج نہیں تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ مجھے خالہ کا یہ سوال دہر معلوم ہوا۔ میری طبیعت بے اختیار جاہتی تھی کہ کسی طرح ہمت کر کے چلائے لوگوں کو

”سنئے خالہ جانی! نہیں چائے پیوں گا نہ کھانے کی مجھے مطلق خواہش ہے آپ لوگوں کو دوسرے کے احساسات کا بالکل خیال نہیں ہوتا..... دنیا جہان کی باتیں آپ نے کر ڈالیں۔ محلے بھر کا حال بتا گئیں پھر چائے اور کھانے کی صلاح بھی کرنے لگیں لیکن یہ نہ ہوا کہ میری بیوی کا کچھ حال بتائیں۔ آخر اس قدر پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ سنتی ہیں آپ؟.....“

لیکن میں یہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح مجھ میں اس وقت جرات پیدا ہو جائے، لیکن جیسے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جو میری ہوئی آواز میں بے دلی کے ساتھ میں بولا۔ ”چائے! — جی ہاں منگوا دیجئے۔ بی بی لوں گا“

”ہاں بخیر ٹی سی گرم گرم چائے پنی تو تو ذرا جان میں جان آ جائے۔ تم تھک گئے ہو گے۔ اور دیکھو وہ سامنے کونے میں تمہارا کبس رکھوا دیا“

شیر دانی اتار کر ٹانگ دہنہ ہاتھ دھو ڈالو! اور یہ کہتی ہوئی وہ زہرہ پر سے اتر گئیں

اس وقت میری طبیعت اس قدر الجھ رہی تھی کہ جی چاہتا تھا اپنی بوٹیاں نوبچ ڈالوں میری الجھن کی حالت کسی طرح اس مجرم سے کم نہیں تھی جو امید اور مایوسی کی درمیانی حالت میں سر ہلکائے حاکم کے سامنے اپنے فیصلہ کے سنائے جائیکا انتظار کر رہا ہو اور حاکم انتہائی لاپرواہی اور بے خیالی کے ساتھ دوسرے کام میں اس طرح مشغول ہو جیسے اُسے آج کسی مقدمہ کا فیصلہ سنانا ہی نہیں ہے۔ میں نے غصے اور جھجھلاہٹ کی دھیانہ نوبچ کھسوٹ میں شیر دانی اتاری۔ جوتا اور موزہ بھی لیٹھج تان کر بیروں سے علیحدہ کیا۔ شیر دانی کو کھوٹی پرٹانگنے کے بجائے اُسے ٹوپی کے ساتھ پلنگ پر دے مارا، اور ایک بد مزاج ہارسے ہوئے جواری کی طرح حواس درست کرنے کے لئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینے مارنے لگا۔ اتنے میں جڑی خالہ اوپر اٹھ گئیں۔ آگے آگے وہ اور ان کے کچھ ہاتھ میں چائے کی کشتی لئے ہوئے لوٹا۔

میری خالہ ہمیشہ سے بہت باتوئی ہیں۔ اس قدر باتیں کرتی ہیں، اس قدر باتیں کرتی ہیں کہ جان عاجز آجاتی ہے وہ مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ایسی محبت آرام نہ پہنچانے کے بجائے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اخلاق تو واضح کی انکی مذہب میں اس قدر اہمیت ہے کہ چاہے آپ علالت کا عذر کیجئے چاہے شکم سیری کا ان کے آگے ایک بھی نہ چلے گی اور وہ ہمیشہ آپ کے عذر کو مختلف دھرم پر عمل کر کے جہاں تک ان کا بس چلے گا آپ کو ٹھنڈا ٹھنڈا کر کھلا دیں گی۔ پھر چاہے آپ کو بدبھنی ہو جائے چاہے معدہ خراب ہو اس سے انھیں کوئی غرض نہیں، وہ اپنی ماہجہ انہ شفیقت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو گئیں۔ بس، یہ احساس ان کے ضمیر کو مطمئن کرنے

کے لئے کافی ہے۔

میں نے جائے دانی میں سے گھرے سہرے رنگ کی خوشبودار چائے پیالی میں انڈیلنا شروع کی اور حالہ نے حسب عادت اپنے بیٹھ کر ادھر ادھر کے قصے قصے سننے چھیڑ دئے۔

”عظیم صاحب کو لڑکی کے ہمیز کی بڑی فکر ہے کہتے تھے کہ میرے نہ کوئی لڑکا نہ باللا۔ بس بے دے کے ہی ایک لڑکی سارے گھر کا اجالا ہے مجھے اپنا روپیہ کوئی قبر میں تو لے جانا نہیں ہے کہ میں بیاہ میں ہاتھ روک روک کر پیسہ اٹھاؤں۔ اب اس موقع پر بھی ارمان نہ نکالوں گا تو یہ ساری جمع جتنا کس روز کام آئے گی۔ بس میاں اب تم یہ سمجھو کہ سارے کپڑے لئے اگنا پاتا تیار ہے فقط ایک چاندی کی مسہری تو البتہ کارگیر نے ابھی تک بنا کر نہیں دی باقی سب بیاہ کا سامان۔۔۔۔۔ اے میاں شکر اور ڈالو بھلا دو چچوں میں کیا ہوتا ہے؟ پھیلکی چلے پینے سے کیا فائدہ۔ آج کل کے لڑکوں نے عجب رواج نکالا ہے کہ ہر چیز میں موئے فرنگیوں کی طرح مٹھاس کم ہو۔۔۔۔۔ تو بھیا بس نکاح کی تاریخ طرنے کی کڑ ہے۔ باقی تو دونوں طرف سے سب ٹھیک ٹھاک ہے“

مجھے خالکی باتوں سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ میرا جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور جب گرم چائے کی بھاپ میرے ماتھے سے ٹکراتی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا ہاتھ برف کی لپک قاش کی طرح سرد ہے۔ میں سمجھتا رہا تھا کہ عورتیں فنون باتیں کرنے کی کس قدر عادی ہوتی ہیں خصوصاً گھر کی بڑی بوڑھیاں جن کے پاس خانگی جھگڑے رشتہ داروں کی آپس میں شکر رنجیاں، بال بچوں کی علالت شادی بیاہ کے قصے، ہمانوں کے کپڑوں اور زیور کی نکتہ چینیوں کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ مجھے رہ رہ کر تادار رہا تھا کہ میری خالہ تمام بے کار تذکرے جن سے مجھے کوئی سروکار نہیں اڑاتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ مجھ سے کوئی ایسا تذکرہ کریں جس میں میری بوی کا نام آئے۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا نیچے صحن سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ نہ کسی کے باتیں کرنے کی نہ قابو کی آہٹ کی۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میری بوی مکان میں موجود ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی گوشے سے ہلکی ہلکی سرلی آواز میرے کانوں تک پہنچتی۔ یقیناً وہ فیض آبار سے نہیں آئی۔ انورہ مجھے اس وقت کس قدر صدمہ تھا!

میری خالہ نے بھر کتنا شروع کیا۔

”نواب صاحب کے نئے مکان میں کوئی لکھنؤ کے رہنے والے کرایہ دار اتارے ہیں۔ دیسے ہیں تو حیثیت دار اگر ایسی دولت بھی کس کام کی جو راج گاڑ دے۔ گھر کی عورتیں تو اس قدر بددماغ ہیں کہ انڈیا ہاؤس رکھے میں نے تو انہیں باتوں سے جل کر پرسوں کھڑکی اینٹوں سے چنوا دی۔ اے ہاں۔ کون ایسے سر بھروسے میل جول رکھے۔ میاں واہ اتم تو خالی بیٹ میں چائے پئے چلے جا رہی ہو میں کہتی ہوں کہیں گرم گرم چائے خالی بیٹ میں نقصان نہ کر جبے پہلے کچھ کھاؤ پھر چائے چنایا یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نگین سموسوں کی طشتری میری طرف سرکادی۔ مجھے غصہ اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے چائے تنک کر دی معلوم ہو رہی تھی کسی اور چیز کا کیا ذکر دے دیسے تو میں نے پوری پیالی کو چائے سے بھر لیا تھا لیکن ہر گھونٹ بے دلی کی وجہ سے آخری گھونٹ معلوم ہوتا تھا اور میری طبیعت چاہتی تھی کہ پوری چائے ختم کئے بغیر یوں ہی اٹھ کھڑا ہوں لیکن ساقم میں ہی خالہ کی استبداد سے بھی واقف تھا اس لئے عجیب

”اچھا تو اب میں جاتی ہوں عید کی نماز کے لئے تڑکے اٹھنا بھی ہے۔ پھر ماٹا اشد بال بچوں کا گھر۔ وہ اندھیرے منہ ہی غل مچانا شروع کر دیں گے۔ پھر بھلا کوئی سو توڑی سکتا ہے۔ اور ہاں بچوں کے ذکر پر خیال آیا جیلہ نہیں بت یاد کرتی تھی۔ کہتی تھی اب کی دولاہا ہائی آئیں گے تو میں اُن سے کتابوں کے لئے ننھی سی الماری منگواؤں گی۔ اسپر شاہد بولا میں کتابیں کمال کر بیٹک لگا اور اس میں اپنے کبوتر پالو لگا۔ اس پر دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ پہلے تو زبانی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر دھینگا منشی ہونے ہی کو تھی کہ میں نے اُٹھ کر بیچ بچاؤ کر دیا تب کہیں جا کر دونوں الگ ہوئے ہیں جب تک ہمارے خسر گھر میں رہتے ہیں تب تک تو ذرا اس رہتا ہے۔ اور ہر انھوں نے گھر سے قدم نکالا اور ادھر بچوں نے ادھم سے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ بعض وقت تو ایسا تاک میں دم آتا ہے کہ طبیعت چاہتی ہے سب کو بکڑا کر کھڑی میں بند کر دوں اور باہر سے کنڈی لگا دوں۔ لیکن سچ پوچھو تو اشد رکھے انہیں کے دم قدم سے گھر کی بدلتی ہے۔ یہ ادھم شور تو جی کے ساتھ“ میرا بیٹا صبر باکل لبریز ہو چکا تھا، گستاخی کا خیال کئے بغیر میں جلدی سے ان کی بات کاٹ کر چلا اٹھا۔

”بس خالہ۔ اب آپ کو بھی دپر ہو رہی ہے اور مجھے بھی نیند کی وجہ سے جھونکے پر جھونکے چلے آ رہے ہیں۔ اس وقت مجھے سو رہنے دیجئے۔ اب انشوار اشد کل اطمینان سے باتیں ہونگی“

خدا خدا کر کے میری خالہ لیمپ کی روشنی اور کمرے کے بند کرنے کے متعلق کوئی نصف درجن متفرق ہدایتیں کر کے نیچے چلی گئیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے سینے پر سے ایک وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔

اسوقت میرا مزاج درجہ بدرجہ جڑا جڑا ہو رہا تھا اور مجھے اپنے گرد پیش کی ہر چیز پر خواہ مخواہ غصہ آ رہا تھا میں اپنی نظروں کے سامنے تمام خوشنما ہوائی محل ایک ایک کر کے گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا میرے تمام دونوں، تمام پر لطف توفقات کی عمارت ایک کمزور پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خواب میں مینٹار دولت ملنے کے بعد یکایک بیدار ہونے پر مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو کہ کسی عظیم الشان محل کی آراستہ خواہ گاہ میں ریشمی پردوں کی شاہانہ سہری پر سونے کے بجائے میں اپنے بستری پر پڑا ہوا کر دھین بدل رہا ہوں۔ کمرے کی دیوار پر ایک پُرانی وضع کی بھدی گھڑی ٹک کر رہی تھی۔ سامنے دالی چھٹی میں ایک سیاہ بلی کے خرخر کی آواز آ رہی تھی میں اس قدر جلا بھنا ہوا تھا کہ مجھے بالکل یہ معلوم ہو گیا گھڑی اور بلی دونوں میرے منصوبوں کو خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر میری منہسی اڑا رہے ہیں۔

میں جھجھلا کر بستری پر دراز ہو گیا اور مجھے باری باری اپنے اوپر اپنی بیوی پر اور اپنی خالہ پر غصہ آنے لگا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر اپنے کو معطّن کرنے لگا کہ ایسی بھی بے تابی کس کام کی کہ ساری پڑھائی چھوڑ چھاڑ بیوی کی محبت میں دیوانوں کی طرح اتنی دور سے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ پھر مجھے اپنی بیوی پر غصہ آنے لگا کہ عجیب لڑکی ہے بے سوچے بچھے خط میں لکھ مارا کہ میں عید کو دروازے پہلے پہنچ جاؤں گی۔

لیکن سب سے زیادہ برہمی تو مجھے اپنی خالہ سے تھی کہ اتنا سن آگیا۔ زمانہ کے سیکرڈولی تجربے حاصل کئے، اتنی اٹکل نہیں

قدرتاً متحیر ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مولوی صاحب آخر اس کتاب کو اپنی پرستش کی وقت کیوں پڑھتے ہیں۔ ایک خاص وجہ بھی سوال کے پیدا ہونے کی تھی، اور وہ یہ کہ مجھے میرے والد روزانہ شام کو رامائن پڑھنے کی تاکید کرتے اکثر حیرا پڑھاتے تھے۔ میری بیدنی کا ٹھکانا تھا اور اکثر زد و کوب تک برداشت کر لیتا تھا۔ بلاشبہ میری حالت اس وقت بچہ، ملن کی لڑکی کی سی ہوتی تھی۔ جب میں وہی کتاب مولوی صاحب کو پڑھتے دیکھی تو مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے دبتے دبتے سوال کیا کہ مولوی صاحب مجھے تو اسی رامائن کے لئے روز مار کھانا پڑتی ہے اور آپ کا فرد کی وہی کتاب کیوں پڑھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ کافر کے معنی ہیں خدا کی ہستی سے انکار کرنے والا اور رامائن یا ہندو مذہب اس ہستی سے منکر نہیں ہے، اس وجہ سے میں رامائن کو ہرگز کفر کی کتاب نہیں کہہ سکتا۔ تو ہندو ہو کر اس پیاری بھاشا سے کیوں بے بہرہ ہے حسین لطافت کی انتہا نہیں؟ بھائی عربی، فارسی، پھر بھی میرے لئے غیر ملکی زبانیں ہیں اور جو مزہ ہندی میں ہے وہ مجھے ان میں نہیں آسکتا انھوں نے ہندی کی لطافت کی مثال بتلاتے ہوئے۔ تان سین کے گائے ہوئے پد کی تفسیر کی تھی۔ جسودا بار بار یہ بھاکھے، ہے کوئی برج میں ہتھو ہمارا چلت گوپال نہیں روکے انھوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ جب یہ پد اکبر کے دربار میں گایا گیا تو تان سین، بیربل، توڈرل، فیضی اور نواب رحیم خاں غاناہ نے اس پد کے کس طرح جدا جدا معنی بیان کئے جس میں ادبی شغف و مذاق، دونوں کی شمولیت تھی۔ کسی وقت ناظرین نگار کے سامنے اسی تفسیر کو پیش کر دینا۔ یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اُس دن سے میرے دل پر ایسا اثر پڑا کہ میں اب بھی اپنی بوجھ کے وقت تقریباً کل مشہور مذاہب کی کسی نہ کسی کتاب کا کچھ نہ کچھ ضروری مطالعہ کرتا ہوں۔ مثلاً آج کل اپنی پیاری تلسی کیرت رامائن کے ساتھ غنوی مولانا دوم و بدھ کا دھم پد و بائبل و تلک کا گیتا رہسید و سوامی داس شاند کے ادبشنڈوں کی تفسیر و نگور کا ترجمہ کبیر و نگور کی گیتا بھجلی، ان سب کو تھوڑا بہت پڑھا ہوں۔ میرے اکثر دوست اسے ”کچھڑی“ کہتے ہیں مگر مجھے تو اس کچھڑی میں وہ مزہ ملتا ہے جو علیحدہ طریقہ پر دال میں ہے، نہ چاول میں اور نہ مسالوں میں۔ اگر ایک طرف تلسی داس جی لکھتے ہیں۔ جاں سکھو سو جانو نرگن سگن سر و پ۔ تم ہر دینچ بھر تک ایو بسہورام نرود پ۔ (جو شخص ایغور کے حقیقی یا صغاتی حیثیت کو سمجھ سکتا ہو، سمجھے میرے دل کے کنول کے اندر تو ہے رام، تم انسانی شکل میں بھونرے کی طرح قیام کرو) تو دوسری طرف علامہ اقبال بھی فرماتے ہیں۔

کبھی لے حقیقت منظر نظر آباں بجاریں کہ ہزاروں سجدے تڑپتے ہیں میری جینتاریں

پھر اگر ایک طرف سعدی فرماتے ہیں۔ ”یہ علیا بے یوسفی کے مانند“ تو دوسری طرف تلسی داس جی کہتے ہیں۔

تلسی کر (ہاتھ) پر گر کرے، کر تر کر تر کرے۔ جادہ کر تر کر کرے تادہ کر تر کرے۔ اگر کہیں یہ پڑھا کہ *Beauky* تو فوراً نسیم کا یہ شعر یاد آ گیا کہ

جو نکتہ کہوں کہیں نہ حرف آئے مگر وہ کشف مری چو بچ جائے

اس نقطہ خیال سے ابھی حال میں صوبہ کی کونسل کے ایک ممبر کے جواب سے یہ معلوم ہو کر مجھے سخت افسوس ہوا تھا کہ ایک

امتحان میں جہاں ہندوؤں کے صدمہ لڑکے اور دلیک خربک ہوئے تھے وہاں صرف ایک مسلمان لڑکے نے ہندی نی تھی۔ ۱۰، ۱۱ جم

ملک محمد جاسی، رسلخان، مبارک کے قائم مقام کیا اب نہ ہوں گے جنھوں نے ہندی میں ایک لطافت کا دریا بہا دیا؟ کیا وہ مختصانہ جوش سرد ہو گیا جس نے ہندوستان سے علم ہندسہ کو اودھار لینا بجا نہ سمجھا تھا اور جس نے بعد ا میں چرک و شمشرت نامی دیک کتب کے ترجمے کرائے؟ فیضی کی راءائن و گیتا کے فارسی تراجم اب بھی یادگار ہیں۔ بھئی یہ خیال سرا سر غلط ہے کہ دوسرے کی علمی کتاب پڑھی اور پس مذہب تبدیل ہوا۔ مذہب کیا ٹھہرا کوئی کچا گھڑا ہو۔ میں اب بھی ویسا ہی ہندو ہوں جیسا ۲۸ سال قبل تھا بلکہ شاید بہتر۔ میں نے مولوی صاحب موصوف کے سے بچے خدا ترس اور پاک انسان کم دیکھے ہیں۔ آہ، مجھے موصوف کا ایک اور واقعہ یاد آگیا جسے بریہ ناظرین کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میرے ہم سبق بچنا تھ حلوئی کے مکان پر ایک قدم قلمی راءائن معہ تفسیر کے موجود ہے۔ تحقیقات پسند دل بیتاب ہو گیا اور گو اس کے باپ نے بھگل اس شرط پر راءائن کو دینا قبول کیا کہ روزانہ خود اس کا لڑکا راءائن لچا یا کر۔ مگا اور مولوی صاحب کے سامنے دور رکھو نہ مولوی صاحب ملکش تھے نہ، کافر کا کیا مقابلہ انسانی نفرت نے گڑھلے!) اسٹول پر رکھ دیا اور وہی صفحات بھی پلٹا جا لیا (آہ مولوی صاحب کے چھونے سے کہیں کتاب کی روحانیت نہ اڑ جائے) مگر پھر بھی مولوی صاحب ہنس کر کہتے تھے کہ اس شخص کے دل میں اس پاک کتاب کی کتنی عظمت ہے چنانچہ موصوف نے باوجود ان شرائط کے کل کتاب پڑھی۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں ہندی کے پاک خیالات اور خصوصاً تلمی داس جی کی راءائن کے جذبات اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ حال کی ملاقات میں حضرت نیاز فتحپوری نے براہ شفقت برادرانہ میری حوصلہ افزائی کی اور میرے سلسلہ مضامین کو اپنے رسالہ نگار میں شائع کرنا منظور فرمایا۔ مگر ناظرین نگار سے کچھ معذرت خواہی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ لیل و لیلہ راجستھم جنوں بایہ دید کا لحاظ رکھتے ہوئے میری تفسیر میں جہاں موازنہ کی غلطی ہو اُسے کوتاہ نظری سے منسوب نہ کہتے ہوسکتا مگر مجھے ایک خاص پہلو کا شہید ائی یا سودائی سمجھیں۔ دویم یہ کہ بوستان کی ذیل کی روانتیں ہمیشہ یاد رکھتے ہوئے اسے فراخ دل مجھے سے کام میں جو خدا میں ہے یا اُن کے پیغمبر علیہ السلام میں بھی۔ پہلی روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہفتاد سالہ گرسنہ آتش پرست پر رحم کر کے اسے ایک اسلامی قافلہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر جب شام کو سب لوگ معہ اُس آتش پرست کے دسترخوان پر بیٹھے اور اُس نے خدا کی پرستش میں حصہ نہ لیا تو اس بیچارے کو بھوکا پی اٹھا دیا گیا۔ فوراً غیب سے آواز آئی کہ اے مسلوب! تم نے یہ خیال نہ کیا کہ میں نے اس کی پرورش ستر برس تک کی باوجود کہ وہ آتش پرست تھا۔ اور تم کو ایک وقت کا کھانا دینا بھی دشوار ہو گیا۔ دوسری روایت بھی عجیب سبق آموز ہے اور وہ یہ کہ حاتم طائی کے قبیلہ نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ چنانچہ حاتم کی وفات کے بعد محمد صاحب نے اُس کے ملک کو فتح کر کے اس کے قبیلہ کے برگزیدہ اشخاص کو معہ حاتم کے لٹے گرقار کیا۔ اور قتل عام کا حکم صادر فرمایا، صرف لڑکی کو اُس کے پاسے خیال سے چھوڑ دیا۔ مگر لڑکی ہنر بھی حاتم کی اُس نے کہا کہ اگر آپ میری قوم کو تہ تیغ کرنا چاہتے ہیں تو میں حاتم کی لڑکی ہو کر اُس کے نام کو کلنک کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتی۔ مجھے آپ پہلے قتل کیجئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی قوم کو اپنے سامنے اور جیتے جی تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھوں۔ محمد صاحب نے فوراً سب کو سہا کر دیا اور فرمایا کہ اصل وجوہ یہ ہے ”سے خطا نہیں ہوتی جس کا صان مقصد

بتھا کہ اصل ”جوہر“ کسی تنگ مذہبی دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا جاسکتا۔ بحرِ حقیقت بھی ایک غیر محدود چیز ہے اور اس کو ایک جگہ بند نہیں کر سکتے۔

اب دوسرے حصہ مضمون میں رمان کے ایک ضایت برگزیدہ حصہ کی تفسیر پیش کرتا ہوں جس میں تلسی داس کی رمانی اور ہمارا قومی معیار زیرِ بحث ہے۔

(۲)

بنی اس کی رمان اور
مارا قومی معیار

پانچ ۱۹۲۵ء کے رسالہ زمانہ میں ”تلسی داس کا شاعرانہ کمال“ نامے مضمون کے عنوان میں مہاتما گاندھی کا وہ قول میں درج ہے ناظرین کو چکا ہوں جس میں مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ میرے دلی جذبات کا بھار جس قدر تلسی داس جی کی رمان ادا کرتا ہے ہوتا ہے اتنا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ آپ کے تھوڑے ہی دن بعد لاہر دیال جی کا ایک مضمون پڑھا (کا پتہ) میں میری نظر سے گزرا جس میں موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ تلسی داس جی کی رمان ماری ایک خاص قومی تصنیف کا درجہ رکھتی ہے اور جس طرح ڈیوک آف ولنگٹن (مشہور و معروف انگریز سپہ سالار جس نے پولینڈم وائرٹو کے میدان جنگ میں شکست دی تھی) اکتا تھا کہ اس کا تاجی مطالعہ سیکشپیر کے ڈراموں ہی سے ہوا ہے اسی طرح ہم اپنی تہذیب کے اصولوں کا مطالعہ اس مقدس کتاب سے کر سکتے ہیں جو تاجی کا اصل مقصد ہے۔ تلسی داس جی کے سہ صد سالہ یا گکاری بن کے موقع پر پنڈت مدن موہن مالوی نے فرمایا تھا کہ حصول آزادی کی پہلی منزل دہی ہے، جو تلسی داس کے خیال کی آزادی سے ظاہر ہوتی ہے کہ غیروں کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے بھی گویا رام راج میں ہیں ان خیالات کے ذریعہ رام راج کے اصولوں کا شاعرانہ دلکشی کے ساتھ تمام قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ سوامی شردھانند جی مرحوم نے بھی اپنی شردھا (دلی عقیدت) میں اکیڑہ خیال شاعر کے قدموں پر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ اچھوت قوموں کے ساتھ دہی برتاؤ لازم ہے جو رام نے نشاد، سیوری، کول، لرات وغیرہ کے ساتھ کیا تھا اور جسے تلسی داس نے اپنی رمان میں عجیب بھگتی اور پریم کے رنگ میں دکھلایا ہے۔ دچسپتی پنڈت دیندیا ل شرم نے وحدانیت کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تلسی داس جی کے اس استعارہ سے بڑھ کر ایشور اور مادی دنیا کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے کوئی استعارہ ملنا محال ہے کہ ایشور دنیا میں اس طرح بس رہا ہے جیسے حنا میں سرخی کہ نظر نہیں آتی مگر موجود ہے۔ پروفیسر گریسن کو تلسی کے مقابل میں کسی اور مشرقی شاعر کو شاعر ہی نہیں تسلیم کرتے۔ المختصر تمام مختلف انخیال لوگوں کی نگاہ میں اس وقت عجیب امید کے ساتھ تلسی داس کی رمان پر پڑ رہی ہیں اور تلسی داس جی کا خود دعویٰ بھی یہی ہے کہ لکھنے کے لئے رام بھجن اور رمان کے سوا کوئی تیسرا ذریعہ نجات نہیں ہے۔ ”جہم خاناناں بھی تلسی داس جی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک برہمن کی لڑکی کی شادی میں امداد کی سفارش کرتے ہوئے جب تلسی جی نے سفارشی خطیں یہ لکھا کہ ”سُر (دیوتا) تیا (عورت) نر (آدمی) تھا ناگ تیا سب چاہیں اس ہوئے“ تو جہم خاں نے اس پر گہ نگاہ کی کہ تلسی (تلسی داس کی والدہ کا نام) نول (تلسی خوش) پھریں تلسی سوئست (لوکا) ہوئے“ میں بھی اس خزانہ سے ایک انمول موتیوں کا مار ناظرین نگار کی

خدمت میں پیش کرنے کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔ آہ! یہ موقع ہے اور نہ میں ایسا جوہری ہوں کہ اس ہمارے ہر موتی کی آب و تاب کو پورے طور پر دکھلا سکوں مگر ہاں، ہمارے کچھ عام احصائے بیان کرتے ہوئے نہایت ادب سے اپنی ناچیز قدر کو پیش کرتا ہوں۔ انیسویں صدی اپنی تمام مادی ایجادوں کے ساتھ اگر خدا کو بھول گئی تھی تو اس کی ہستی پر شک مزدور کرنے لگی تھی اور مغربی دنیا میں نباتات و حیوانات کے طبقات میں بعض طاقتور کی فتح کے اصول کو اپنی کیر خری نظر سے دیکھ کر اسی کو اپنا معیار مان بیٹھی تھی اور کمزور و فرو یا قوم کے لئے موت یا زوال کی وجوہ کے سوا اور کوئی تحفہ اس کے پاس نہ تھا۔ مسادات کا مسئلہ بھی انقلاب فرانس کے وقت سے نفی آزادی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مزدور ملک کے دشمن، رعایا حکمرانوں کے خون کی سیاسی، عجم قوم کے گلے میں طوق غلامی ڈالنے کو تیار، اور بھر نطف یہ کہ شخص کی زبان زد دہی مسادات ذرا دہی کا رنگ ہی نظارہ کم دیش اس بیسویں صدی میں بھی نظر آتا ہے، ملک انفرانٹیکور اپنی کتاب نیشنلزم (Nationalism) میں مغرب کے خیال قومیت کا ایک عجیب ہیبت ناک نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جو حسب ذیل الفاظ میں ہے:-

”اس قومی خیال والے بھوت کے خوف سے ساری زمین تھر رہی ہے، دیا کے گوشہ گوشہ میں بدگمانی اور خفیہ نقصان رسانی کا نظارہ دکھائی دیتا ہے..... اس قومی خیال کی حرکت کہیں گرد و فواح میں ذرا بھی ہوئی کہ فوراً لوگوں کے کان کھڑے ہوئے اور ایک خوف کا احساس چاروں طرف پھیل گیا۔ خوف ہی انسانی طبائع کے جملہ مڑائیوں کی بنیاد ہے..... لگے، کذب و عیاری پر اپنے آپ کو مبارک باد دیتے ہیں، قرار ہائے صلاح پر محض انکی صلاحیت کی وجہ سے مضحکہ زنی ہوتی ہے۔ اس قومی (خیال) کا خلاصہ منشا صرف یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی کمزوری سے مستفید ہو جس کے لئے استعارہ صرف ان کیڑوں سے لیا جاتا ہے جو مفلوج گوشت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک کہ انکا مقتول صرف اس قدر زندگی قائم رکھے کہ ان کی زبان کے ذائقہ اور انکی شکم سیری کا سامان ملتا رہے“

اس لئے موصوف گزشتہ جنگ یورپ کو اسی گناہ کی سزا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک شرقی اصولوں پر عملدرآمد نہ کیا جائے گا اس وقت تک لیگ آف نیشنس (League of Nations) محض طاقت، ترقاں بنی رہیگی۔ شاعر موصوف فرماتے ہیں کہ ہمیں اُمید ہے کہ یہ مادی طاقت اپنے خون آلود قدموں کے دھونے کی خواہش مزدور کرے گی اور وہ ہندوستان سے استدعا کرتے ہیں کہ اپنی پاک تہذیب کے گنگا جل کا برتن تم بھی صاف کر کے تیار رکھو کیونکہ تمہاری ہی طرف دنیا کی نگاہ ہوگی۔ ایک طبقہ (اگرچہ اس کی تعداد بہت کم ہے) ہندوستان میں بھی ایسا ہے جیسا کہ مغربی عین ملک کے تماشہ کو ہندوستان کے ایشیہ پر بھی دیکھا اور دکھانا چاہتا ہے (اور بجائے اس کے کہ اپنی تہذیب کا گنگا جل مغرب کے گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کرے خود اسی گناہ میں مغرب کا پیرو ہونا چاہتا ہے۔ ایک اور طبقہ مغربی تہذیب سے اس قدر سبزار ہے کہ اس کے معیار زندگی کے علاوہ اس کی علمی تحقیقات اور نظمی اصول پر ہی اسی قومی خود غرضی کا خوین رنگ دیکھتا ہے اور فطرت سے اسے چھوٹا ہی پسند نہیں کرتا۔ ایک گروہ انسا (عدم تشدد) کے اصول کا ایسا گروہ ہے کہ اس کی بزدلی پر ہاتھ کا گاندھی کو بھی شرم آتی ہے اور دوسرا گروہ اپنے کھلونے کے

بنام میں انجان بچوں کی طرح اپنے کھلونے کی تلوار سی کوکھر ٹکڑا رہا ہے اور یہ بھی مغربی اسلحہ جنگ کے دیو کے سامنے ایک فرقہ تندن اور سیاست کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی فکر میں ہے۔ دوسری طرف مذہب کی آڑ میں وہ جوتی پیرزاد کی نوبت ہو رہی ہے کہ باید و مشاید۔ ان بے نرالا ایک تیسرا طبقہ ہے جو ان دونوں پر نظر تفتیحک ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ تندن اور سیاست کے مسائل میں مذہب اور روحانیت کا گور نہیں ہے، انھیں تو خدا نقاد یا آخرم کے حوالہ کرنا چاہئے۔ اور جائے غور یہ ہے کہ ہر طبقہ میں ہندوستان کے برگزیدہ اور قابل اصحاب شامل ہیں جن کی حب الوطنی اور خلوص عقیدت پر شبہ کرنا بھی بجا ہے۔

مادی طاقت اور روحانی طاقت کے تضاد کا نظارہ ایک مرتبہ راون اور رام کی شکل میں آپکا ملک میں پیشتر بھی دکھایا جا چکا ہے راون کو کل سامان جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا، رام کو دوسری طرف دیکھ کر بھی کھینچے جیسے راسخ انخیال اور وقادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ ہمارا راج راجندر سے سوال کرتا ہے کہ ہمارا راج! فتح کیسے ہوگی؟ ہائے کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کبھی جانے ہی کے لئے نہیں ہے؟ اس موقع پر میں ہمارا راج۔ رام کے جواب کو بزرگان قوم اور بالخصوص ہمارا گائتھی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہی نہ صرف ہمارا بلکہ کل دنیا کا معیار ہونا چاہئے یہ وہی نگاہ ہے۔ جسے آپ مغرب کے خونین نگاہ کے کھارہ کے لئے پیش کر سکتے ہیں یا دوسرے استعارہ میں یہی وہ ”نوٹکھا ہار“ ہے جسے مادر گیتی کی پرستش کرتے وقت اُس کے گھر میں پہنا سکتے ہیں۔ ہمارا راج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اس کے اجڑا کی تفصیل، اسے بھی کھینچ سنو:-

सौम्य धीर जाहिराय चाका । सन्ध शलि हव द्वाजायताका

ہمدردی اور استقلال جس رتھ کے پہنے ہیں، مضبوط سجاوئی اور محبت کے جھنڈے اور پھر یہ ہیں۔

बल विवेक दम परहित कोरे । क्रमा दमा समतारज कोरे

طاقت، تمیز، نفس کشی اور پاد و پکار ۔ یہ چار گھڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ دور سے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں

ईश भयन सारथी सुजाना । विन चर्म समतोष कृपाणा

ایشور کا بھجن اوس رتھ کا چلانے والا ہے اور جو بہادر اسپر سوار ہے اسکی ڈھال پیراگ اور اس کی تلوار قناعت ہے

दान परसु बुध्दि रक्ति प्रचण्डा वर विज्ञान कठिन कोडण्डा

فیاضی اس کا بھر سا اور عقل سلیم شکنجہ بان ہے اور افضل ترین علم اسکی مضبوط کمان ہے۔

अमल चल मन त्रौन समान । संजम निधम सिली मुख नाग

ہلک اور مستقل طبیعت جس کا تھکنا ہے اور سنجم (اصل اطلاق ذاتی) اور نیم (اصل اخلاقی) سہ ہیں۔

कवच प्रभे विप्रपद पूजा पति सम विजय उपायन ईजा

زبردستی پر برہن کی خلوص دل سے پرستش ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

सहा अर्थ मय अरंथ जाके जीतम कहैम कवैह रिताके

عجب من، جبکہ پاس اب دھرم کا رتھ ہے اس کی فتح کے لئے کہیں دشمن ہی نہیں ہے۔

یہ سات چوپائیاں ساری مشرقی تہذیب کا لب لباب ہیں۔ میری دلی منشا تو یہ تھی کہ بس انہیں کو پیش کر کے بلا کسی تفسیر کے مہمان توہم کے سلسلے سے ہٹ جا تا مگر چند وجوہ سے کچھ تفسیر لازمی ہے جس کو خاص اصول کے لحاظ سے نمبر وار درج ذیل کرتا ہوں :-

سچائی اور محبت بہادری | پہلی چوپائی کا پہلا ہی لفظ بہادری ہے اور دوسری چوپائی کا بھی۔ پہلا ہی لفظ طاقت کا مترادف ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ انہما کے ادس خیال کی جو بزدل بنانا ہے، گنجائش کسی قومی یا دنیاوی معیار میں نہیں ہے۔

مگر بہادری کے ساتھ سچائی اور محبت پہلی ہی چوپائی میں موجود ہیں اور طاقت کے ساتھ تمیز اور نفس کشی تو ام میں کہ کبھی بہادری محبت اور سچائی کا خون کرتے ہوئے کمزور کے گردن میں طوق غلامی نہ پہنا دے اور دیو کی طاقت رکھتے ہوئے وہ کہیں واقعی دیونہ نہ جاوے۔ ہمارے سام کی زندگی میں برابر یہی اصول کام کرتا رہا کہ کبھی کسی سے لڑائی نہ مول لینا۔ مگر جسوقت کسی نے (مثلاً پرسوں) ”نہ اچیلج دیا تو“ موت سے بھی رکھو ہنسی نہیں ڈرتے، ”اسی ایک صد اکا بلینہ ہونا۔ طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی سے ہمارے راج رام کا صلح کے لئے اٹھ کر آؤں گے“ پر اصرار بھی نہ کرتے، ایسے نمونے موجود ہیں۔

تمثیلت نفس۔ آہ مغربی دنیا کس فخر سے کہتی ہے کہ فرانس کی انقلابی تحریک کے یہی تین الفاظ نئی دنیا کے ترقی اور آزادی کا باعث ہوئے ہیں۔ وہ الفاظ کیا ہیں؟ آزادی، مساوات اور اخوت۔ مگر دیکھو آہ مغربی قوم فرنی آزادی کے ساتھ بچاؤ مساوات کی بھی مٹی پیدا ہوئی ہے۔ مغربی آزادی کے اس خیال کے تو ام ہوتے ہوئے بھی کہ ہم ہر حالت میں کسی نہ کسی قید میں قید کے توڑنے کا خیال ہر وقت غالب رہتا ہے۔ مزدوروں کو مالداروں کے قید سے رہائی کا خیال، رعایا کو حکومت سے آزاد ہونیکا خیال، مذہب کو کثافی پابندیوں سے نجات پانے کا خیال، ایک قوم کو دوسری قوم کے تعلقات کے قید سے نکلنے کا خیال اس قدر دامنگر رہتا ہے کہ ہر طرف توڑ پھوڑ اور کشت و خون برابر جاری ہے۔ غرض کہ اپنی زنجیر کو توڑ کر دوسرے کے بیروں میں جکڑنا، یہی عملی اثر اس آزادی کے خیال نے مغرب میں ہر جگہ آشکارا کر رکھا ہے۔ مغربی اقوام کے خون آلودہ ہونے کی باعث یہی ہے۔ مساوات کا خیال نہایت اچھا تھا مگر وہ بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا کہ اپنے سے بہتر حیثیت میں کسی کو نہ دیکھ سکے۔ آہ، کب مغرب نے اس خیال سے کمزوروں کو اپنے برابر بنانے میں کام لیا؟ اور اخوت بھائی تو تیسرے درجہ پر رہ گئی ہے اور بقول ٹیگور کے قومی خیال میں اُسے وہ جگہ ملی جو مخالف قزاقان میں برادرانہ اصول کو اپنا شیرازہ تنظیم محض اس لئے مستحکم کرنے میں ملتی ہے کہ دوسروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ ہو سکے، کیا کبھی سفید مغرب نے کسی رنگہ اور قوم کو اپنا بھائی سمجھا؟ کیا مغرب کی مختلف اقوام میں ایک دوسرے سے لگاوت قائم رکھنے کا خیال مستحکم ہے؟ کیا مزدور مالدار کو اور محکوم حاکم کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تلسی داس جی کے وقت

بالا میں بھی مساوات ہے مگر اس کے ساتھ عفو اور رحم بھی شامل ہیں۔ عفو خود تجلاتا ہے کہ جس نے ہم پر ظلم کر کے مساوات سے باز رکھا اسے بھی مساوات کے حاصل ہو جانے پر معاف کیا جاوے تاکہ سینہ میں کینہ کی گنجائش نہ ہو سکے۔ ہمارا راج رام نے بال کے مارنے کے بعد بھی عفو کا خیال رکھا اور ایسا ہی ہر وقت کرتے رہے۔ اس میں مساوات بھی مل جاتی ہے اور دوسرے کی مساوات بھی اٹل نہیں ہوتی۔ مگر آج فرانس اپنے انقلاب کے خونیں نقشہ کو جیسے انسانی سرمولی اور گکا جبر کی طرح پیر جی سے بلا کسی عفو و امتیاز کے خیال کے کاٹنے لگے، پھر بطور معیار پیش کرنا باعث شرم نہیں خیال کرتا ہے۔ اس طرح عفو کے ساتھ سزا دینے والا بھی ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ :-

Human power then looks like God's when mercy seasons justice

(انسانی طاقت اسی وقت خدا کی طاقت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے جب انصاف کے ساتھ رحم ہو) دوسرا خیال جو تلمی داس جی مساوات کے ساتھ رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ”رحم بر حال دیگران“ یعنی جو اپنے سے نیچے ہیں انہیں اٹھانے یعنی سیوری و نشانہ کوئی وکرات پر رحم (امداد) کرنا کہ وہ بھی اگر تمھارے برابر نہیں تو کم از کم اپنی موجودہ حالت سے تمھاری امداد اور نصرت کے سہارے اوپر اٹھ سکیں۔

البتہ تلمی داس کے خیال میں ”سب دہاں بائیس پیسیری“ والی مساوات کبھی نہیں تھی۔ ہندوستانی نظام تمدن میں روحانیت کو پہلا، جسمانی قوت کو دوسرا، مال و تجارت کو تیسرا اور دیگر خدمات کو چوتھا درجہ دیا گیا تھا مگر یورپ میں بجز مال و دولت کے اور کسی چیز کی پرستش ہی نہیں ہے۔ روحانیت کو تو کوئی کوری کے مول بھی نہیں پوچھتا۔ انتخاب میں بھی صرف مالی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ مالوی جی نے بڑے لاٹ کی کونسل میں کہا تھا کہ آپ کے قاعدہ انتخاب نے تو ہندوستانی تہذیب کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ لالہ بھگوان داس نے بھی کچھ کوشش کی تھی کہ بیجاری روحانیت کو بھی کوئی جگہ مل جاوے مگر ہنوز کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب تک مختلف طبائع موجود ہیں، یہ اندھا دھند کی مساوات چل نہیں سکتی یہ بات اور ہے کہ آپ حیوانی طاقت یا زبانی شور و غل (Eloquence) یا سرمایہ (Capital) یا غوغا کرنے والی جماعتوں کے اتحاد کو مقدم سمجھیں اور بیجاری روحانیت کو موخر سمجھ کر حکمرانین میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اب کل دنیا کو بجائے آزادی و مساوات و اخوت کی تثلیث نظمی کے تلمی جی کی تثلیث نظمی (اتحاد، اخوت، مساوات) عفو و رحم و مساوات کو قبول کر کے اپنے خون ہاتھوں کو پاک و صاف کر ڈالنا چاہئے۔

قومی جھنڈا قومی جھنڈے کی پکار (کچھ عرصہ ہوا) ہر طرف بڑے زور سے مچی اور اس کے متعلق نئے نئے خیالات کا اظہار ہوا تھا مگر تا گاندھی کا یہ خیال تھا کہ اس میں قومی تنظیم کا شائبہ دکھلانے کی غرض سے مختلف فرقوں کے لئے مختلف رنگ دکھلائے جاویں اور قومی مساوات و مابانی آزادی کا خیال دلانے کے لئے اس میں جبر خد کا نقش ہو۔ مگر صاحبان، قومی جھنڈے کے الفاظ اور نشانات محض مغرب کی نقل ہیں جس کے لحاظ سے کسی بیرونی مادی شے کے تصویر ہونا ضروری ہے۔ کاش

کسی وقت ایک ہی مذہب رہ گیا یا سب کے سب ہم مذہب ہو گئے یا جرحہ سے قوم آگے بڑھ گئی تو یہ جھنڈا بھر بدن پڑے گا۔ دیکھئے، تلمیسی قومی جھنڈے کے لئے کیا بتلاتے ہیں:-

جھنڈے پر **सत्यं शान्तिं धर्मं अविनाशिनम्** لکھا ہو۔ اگر کوئی تنظیم رنگوں کی رکھی جادے تو ستیہ (Satya) کا رنگ سفید اور شیل (Shila) کا سُرخ ہو اور **सत्यं** کا لفظ ہر دو پر بیٹھا ہے۔ اس طرح قومی دماغ کے لئے سچائی کا اصول اور قومی دل کے لئے محبت کا عہدہ بنیادیں گے اور دنیا کے سامنے ایک مرتبہ پھر دہی جان برائٹ (John Bright) کا قول پیش کریں گے کہ جو عظمت اخلاق پر قائم نہیں ہے وہ کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔

مساوات و آزادی و اخوت یہ تین کیا، دنیا کے کل اخلاق کے افرادی صفات انھیں دو الفاظ **सत्यं** اور **शान्तिं** میں شامل ہو سکتی ہیں اور ہیں۔ مگر ہر دو کا مستحکم اور قوام ہونا ضروری ہے کیونکہ راستی ”فتنہ انگیز“ ہو سکتی ہے اور ایسا انسان کو ناراستی کے مقابلہ میں بزدل بنا سکتی ہے۔ اس لئے معیار صرف ستیا گرہ نہ ہو کہ **सत्यं शान्तिं** ہونا چاہئے ورنہ خونین ہنگامے اور جوری چوراکے واقعے ہونا ہر وقت ممکن ہے۔ آہ دنیا ابھی تضحیک کی نظر ستیا گرہ پر ہی ڈال رہی ہے اور نہ معلوم کہ اس اصول کے مروج ہونے کے لئے ابھی کتنا زمانہ چاہئے۔ تلمیسی کا معیار ستیہ شیل اگرہ (सत्यं शान्तिं) تو بیشتر لوگوں کو اجتماع ضدین ہی معلوم ہو گا۔ مگر معیار ہمیشہ بلند ہی ہونا چاہئے۔ اگر کسی قومی جھنڈے پر یہ الفاظ ہوں ورنہ قوم ایک اندازی کے ساتھ اس جھنڈے کے نیچے ہو کر آگے بڑھے تو بجائے اس خوت کے جو مغربی اقوام کو کجا نب سے مشرقی اقوام میں بھینکتا ہے ایسی قوموں کا استقبال ہی ہر جگہ ہوا ویر مسلہ کہ پہلے مذہب (پادری) پھر تجارت اور اس کے بعد قومی سلطنت کا جھنڈا چلتا ہے، دین سے مٹ جاوے اسی معیار کی وجہ سے رام کا استقبال پیا پد میں ہوتا ہے اور (Annexation Policy) کا پتہ نہیں۔ بال کار راج سگریہ کے اور فتح لنکا کے بعد لنکا کا راج بھی بھیکھن کے سپرد ہوتا ہے، مذک دوسری قوم کے مال و متاع سے اپنی شکم سیری اور مرے اڑانے کے خیالات کا پیدا ہونا۔ کیا اچھا ہوتا اگر غیر امتیاز کے مساوات کے بجائے سچائی کا برتاؤ ہوتا۔ مورخ الیرونی ہندوستان کے قومی شیرازہ کی تنظیم کو عدم مساوات مگر راستی کے اصول پر دیکھ کر کہتا ہے کہ گو مساوات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت دوسری جگہ بہت جلدی ہوئی مگر بیاں ہندوستان میں باوجود عدم مساوات کے ہر شخص اپنی جگہ پر خوش ہے اور کوئی خاص پیچینی نہیں پائی جاتی۔

ایشور ایفورد کا خیال تہذیب کا خاص جزو ہوتا ہے۔ مد اصل دہی تہذیب کے رتھ کا چلنے والا رتھ بان ہے۔ ابھی چند ہی روز ہوئے کہ سرا و لیر لاج (Seraul Laj) جیسے زبردست سائنس دان نے

بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ جس روحانیت کی چوٹی پر ایمان اپنے پردوں کے ادھان سے پہنچنا ہو اسی جگہ سائنس بھی اب پہنچ رہی ہے اور روحانیت و سائنس کا تضاد اب مٹا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان جیسے

جیسے مفلس ملک کے لئے سائنس کے ذریعہ بہت سی فلاحی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے کیونکہ بقول تلسی ”بھوکے بھین نہ ہوئے گوبالا“ کوری روحانیت سے بھی کام نہیں چلتا۔ مگر کتنا ہی بڑا سائنسدان یا مدبر کیوں نہ ہو، دنیا اب سمجھتی جاتی ہے کہ بلا خدا کے تہا اپنے برتنے پر ناخدائی کا دعویٰ محض باطل ہے۔

کسی کی پرستش ہو؟ تلسی داس نے **मोक्ष विधि** ۶۶ میں لکھا ہے اور بعض لوگ اس وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ ”کون ہیں؟“ وہ لوگ جنہوں نے روحانیت کے لئے سب کچھ ترک کر دیا ہے اور ایثار کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آج بھی کیا وجہ ہے کہ سوامی دیکانند، سوامی رام تیرتھ، سوامی دیانند سرسوتی، راجہ رام موہن راسے، ہمانگا گاندھی کو دیکھ کر یورپ و امریکہ متحور ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی ملک ایسا ہے جہاں پیغمبر پیدا ہوئے ہیں تو وہ ملک ہندوستان ہے۔ ایسے افراد ہی تو دراصل **विधि** ہیں اور روحانیت و ایثار کی پرستش ہی دنیا کی نجات کا وسیلہ ہو سکتی ہے۔ افلاطون بھی ایسے ہی لوگوں کی تیاری کا اپنے مکالمہ میں سبق دیتا ہے اور انہیں کو **Σωφροσύνη** کہتے ہوئے انکی سلطنت کو سب سے بڑا حکمرانا تھا ہے۔ ہندوستانی نظام میں وادھن قانون ایسے ہی لوگ ہو کر رہتے تھے اور سلطنت کا کام جسمانی اور دماغی قوت رکھنے والے پھرتیوں کے سپرد تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی چیز کی پرستش ضروری ہوتی ہے پارلیمنٹ کی حکومت میں زبان (سائیت) اور مال و دولت کی پرستش ہوتی ہے یا اور طرح کی غیر مذہب حکومت میں مادی قوت کی علانیہ پرستش سرفریڈرک ہرین صاحب مرتے مرتے اس افسوس میں رہے کہ آٹھ سو برس کی ترتیب کے بعد بھی انگلستان میں کاروبار سلطنت کے لئے قابل افراد کا چناؤ ناممکن ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے بھی اپنے انگریزی اخبار پیوہل میں لکھا تھا کہ دلایت میں بھی بے نوٹ اور بے نوع انسان کو یکساں سمجھنے والے شخص کے لئے پارلیمنٹ کے چناؤ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اسی کی نقل مطابق اصل بھی نہیں بلکہ اس سے بھی خراب تر حالت ہندوستان میں ہے۔ بزرگان قوم کو نہایت غور و خوض سے کام لینا چاہئے اور بے نفس، بے نوٹ مگر بے ثروت اصحاب کو اپنے نظام سلطنت میں خاص جگہوں پر مامور کرنے کا انتظام ابتدا ہی سے کرنا چاہئے۔

منزنی دنیا میں سوشلزم کی وہ لہر ہے کہ ”کل مال کل قوم کا ہے“ یہ مسئلہ کتنوں کو متوالا بنائے ہوئے ہے۔ مگر دیکھئے روس میں لینن جیسا شمرہ آفاق مدبر بھی اس مسئلہ کو سال بھر تک بھی نہ جلا سکا، کیونکہ پھر بقول ایک دھقانی مقولہ کے کہ ”ساجھے کی کھیتی کو گدہ با بھی نہ کھائے“ کوئی ترقی کی پروا ہی نہیں کرتا۔ اور کاہلی کے سوا جدوجہد کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ ہندوستانی یا منترتی سوشلزم کیساتھ دان یعنی سخاوت پر زور دینا۔ گو اس اصول کا استعمال فی زمانہ خراب کیا، نہایت ہی خراب طریقہ پر ہوتا ہے مگر پھر بھی ہر بیوہ ہر یتیم، ہر بوڑھے اور ہر لوے، لنگر گھر اندھے کا سہارا ہمیشہ دان ہی رہا ہے۔ کسی غیر ملکی پارٹی نے اس کرشمہ کو کہ یہ کل کام بلا درد گورنمنٹ کے ہوتا ہے، نہایت استعجاب کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو طبقے زیادہ کماتے ہیں انہیں پر سخاوت ایک مذہبی فرض ہے اور اسی لئے غریب کے منہ سے بجائے بدعا کے ایسے نظام کے حق میں دعا ہی مگھتی ہے۔ ہاں سخاوت کا جائز انتظام کرنا اور ادھر قومی فرض بنانا، ایک ضروری ذریعہ اس کی درستی کا ہے۔ مگر یہ نہ ہو کہ کہیں مغرب کی نقل میں کشمکش شروع ہو جاوے اور سخاوت کے بجائے

توجہ کھسوٹ کا بازار گرم ہو۔ میں تو ہندو نظام کو *socialism* (ماطبی سخاوت) کا نام دیتا ہوں جس
جہاں دولت ضرورت سے زیادہ ہوئی کہ وہاں میں تقسیم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ راجہ ہرش جیسے سخی بادشاہ ہر شہر سے برس اپنا
کل خزانہ تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس نظام کے ہونے شخصی کو شش بھی نہیں مسمیٰ اور سوشلزم کا مفاد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

سرقریب لڑکھن صاحب نے جو نوے برس سے زائد عمر کے ہو کر ابھی حال میں راہی ملک عدم ہوئے ہیں، اپنی آخری کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انیسویں صدی کا غلط خیال کہ قدرت میں صرف ”حاکمات کی فتح“ کا اصول کام کرتا ہے اُبھلتا ہوا ہے اور یہ خیال مستحکم ہوتا جا رہا ہے کہ قدرت میں بھی ایثار کا اصول بچوں کی پرورش وغیرہ وغیرہ لا محدود طریقوں پر کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہذا دنیا کا رجحان اب بجائے دوسری قوموں کو زیر کر کے ان سے اپنی شکم پوری کرنے کے، باہمی امداد و اتحاد کی طرف ہونا چاہئے۔ امریکہ کے اخباروں میں یہ بجا برابر سنائی دیتی ہے کہ مادی ترقی کی دیوانہ وار دوڑ میں اسکو دلی اطمینان اور سکون نہیں ملا۔ ایک شخص نے ابھی حال میں امریکہ سے لکھا تھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہمارے تیار کردہ مال کے خریدار کم ہو جائیں تو سادگی کی ترقی ہو تو ہمارے سب مادی ترقی کے سامان، خوشنما باغ، عالی شان مکان اور بڑے بڑے دعوتی جلسے کہاں ہوں گے ؟

کچھ عرصہ ہوا کہ جرمنی اور امریکہ سے ہمارا تعلق گاندھی کو دعوت دی گئی تھی کہ مغرب لڑائیوں اور مشینوں کی حیوانی زیادتیوں سے تنگ آ گیا ہے۔ پس آپ تشریف لادیں اور اپنی پاک ہدایت سے ہماری مدد کریں۔ آہ کیا حسرتناک جواب ہمارا تاجی کو دینا پڑا کہ میرے ساتھ میرے ملک ہی کی تعلیم یافتہ جماعت نہیں ہے اور جب تک یہ جماعت میرے ساتھ ہو کر میرے ملک کی آزادی حاصل کر کے میرے اصولوں کو مضبوط نہ ثابت کر سکے، میں اپنی موجودہ کمزوری کی حالت میں باہر نہیں جانا چاہتا۔

میری یہ منشا نہیں ہے کہ جائز اختلافات بھی باقی نہ رہیں اور نہ اندھے کی سی تقلید ہو بلکہ اگر ان کم قومی معیار کیا ہو، اس پر ضرور اتفاق ہونا چاہئے۔ اور اس معیار کے قائم کرنے میں ملک اور قوم کو تلسی واس جی کی رماٹن سے ضرور سبق لینا چاہئے۔

راج بہادر ملگوڑا۔ ایم اے
الہ آبادی

زنان بازاری

کی پرہیز زندگی کے متعلق جو عجیب غریب ناول

شہید ایک تعلیم یافتہ نوجوان اور ایک بازرگ کے جذبات کا پیش خاکہ، انجامِ خلافتی فلاح کو بکلیاً غماز
شاہدِ عدا۔ پہلی کی ایک زیرہ دارِ طوائف کی خود فروخت و سواغ غری جو کسی کو لیکر لڑا ہے تاکہ
حالاتِ مکر و فریب کی داستان آپ بیتی کی صورت میں عجیب پر طعنت قیمت غیر
اجتماعِ پیش بدکاری اور آوارگی کے مختلف پہلو ہمد کی صورت میں اس قدرِ حیل کے ساتھ
دکھائے گئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتے سوسائٹی کی اصلاح کے لئے
اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفرد و ہی ہے قیمت

۱۱

منیجر نگارہ بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

بلاد مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے

”آئندہ غبرو سلام“ ایک مشرقی ماکھڑا خاتون نے حال ہی میں بلاد انگلستان کی سیاحت کر کے اپنے جوجذبات بیروت کے ۶ بی بجگہ کشان میں شائع کئے ہیں وہ ناظرین نگار کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، اس لئے کہ ان میں بلاد یورپ کی کوئی نئی داستان نہضت و ارتقا پنہاں ہے، بلکہ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب مشرقی خواتین کے زاویہ نگاہ میں بھی کتنا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ حالات بہت دلچسپ ہیں اور متاثر ہونے والے کے جذبات اس سے زیادہ دلکش ہم کہاں ہیں اور دنیا کہاں بنا رہی ہے، ہم کیا سوچ رہے ہیں اور دنیا کیا کر رہی ہے؟ یہ ہے اصل روح اس تاثر کی جس کے ماتحت ”آئندہ غبرو“ نے اپنے تجربات قلب بند کئے ہیں۔

نیاز



جس وقت میں نے بلاد انگلستان میں قدم رکھا، تو سب سے پہلے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، اس کو صرف ”ہیبت و حیرت“ کے الفاظ سے تعبیر کر سکتی ہوں۔ جوڑی سڑکیں، بڑے بڑے مکانات، وسیع تجارتی گاہیں، خاموش ہجوم، نظم و انتظام، صفائی و پاکیزگی، اور سلیط کی اور بہت سی خصوصیات جو ایک وقت انسان کو متاثر کرتی ہیں، ان کا نام ہے بلاد انگلستان اوّل اوّل تو میری حیرت کی کوئی انتہاء تھی لیکن جب چند روز تک قیام کرنے کے بعد میں نے یہاں کی اسلوب زندگی اور اجتماعی روح کا مطالعہ کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ کیوں ایک اجنبی اوّل اوّل یہاں کی فضا اور یہاں کے آسمان و زمین میں ہیبت ہی ہیبت محسوس کرتا ہے۔

انگلستان کی سب سے زیادہ حیرت انگیز خصوصیت وہاں کی حسرت بخشی ہے، جو وہاں کے ذرہ ذرہ سے ظاہر ہوتی ہے اور جس سے ہر شخص اس کے نہایت وسیع معنی میں فائدہ اٹھا سکتا ہے بشرط آنکہ وہاں کے نظام وہاں کے

آداب عامہ اور امن عام میں خلل نہ پیدا ہو۔ وہاں ہر شخص اپنی رائے اور اپنے قول و عمل میں آزاد ہے اور اس کا بیباکی سے اعلان کر سکتا ہے۔ جو چاہو کر دو، جو جی میں آئے کو کیونکہ حریت وہاں کی دیوی ہے اور اس نے اپنے ہر بندہ کو بالکل آزاد و مطلق العنان چھوڑ رکھا ہے۔ ہاؤس بارک میں جاؤ تو تم دیکھو گے کہ اتوار کے دن ہمیشہ اور باقی ایام میں بھی کبھی کبھی خطیبوں کا ہجوم ہوتا ہے، کوئی یہاں کھڑا ہوا سیاست انگلستان پر کتہ چینی کر رہا ہے، کوئی وہاں اشتراکیت پر لکچر دے رہا ہے، کوئی فوضویت کی تعریف کر رہا ہے، کوئی لوکیت کے خلاف زہر اگل رہا ہے، کوئی گلے میں صلیب ڈالے ہوئے تعلیم دینی کی طرٹ لوگوں کو بلاتا رہا ہے اور کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ مذاہب دنیا کے لئے مصیبت ہیں، اس لئے صرف عقل کے کسب پر عمل کر دیکھو کوئی خطیب ایسا نہیں جس کی گرد سننے والوں کا ہجوم نہ ہو اور اس کے لکچر پر اسے نفی نہ ہو رہی ہو۔ پھر پولیس دیکھ رہی ہے، آج رہی ہے، کھرے ہو کر ان تمام مواعظ و خطبات کو سنتی ہے، لیکن کوئی مزاحمت نہیں کرتی۔ البتہ اگر اس کا اندیشہ پیدا ہو تو پھر ادنی سا اشارہ اُسکے

ہاتھ کا سارے خطرات کو دور کرتا ہے اور مجمع اس کی ایک سیٹی سے منتشر ہو جاتا ہے

تنظیم عمل اس سے زیادہ محبوب چیزیں انگلستان کے لئے اور کوئی نہیں۔ گھر کی معیشت میں، گھر سے باہر کی زندگی میں مشاغل معاش میں اور دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے میں ان فرض ہر جگہ اور ہر وقت تم ان کے اندر ایک تنظیم عمل پاؤ گے، ہر کام کے لئے ایک دقت اور ہر دقت پر کام کی پابندی یہ ان کے نظام عمل کو روح ہے جس سے کبھی کوئی انگریز بیگانہ نظر نہیں آ سکتا۔

ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر کے قریب جہاں دو تین سے زیادہ آدمیوں کا ہجوم ہوا اور انھوں نے صف بنالی، پھر ہر رینا آنیوالا اسی صف کے آخر میں شامل ہوتا جائیگا اور کبھی وہ اس کی کوشش نہ کریگا کہ اچک کر یا گھس پل کر پہلے ٹکٹ حاصل کرے، ان کی ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خلاف اصول کیونکر کوئی چل سکتا ہے۔

چوراہوں پر پولیس والے نے ہاتھ اٹھایا اور مسافروں، گاڑیوں اور موٹرروں کا سیلاب دفعہ ترک گیا، اُس نے ہاتھ نیچے کیا اور پھر اسی نظام کے ساتھ آہستہ آہستہ سب چل پڑے، ایسا عجیب و غریب منظر ہوتا ہے کہ بے اختیار دامن سے نکل جاتی ہے۔ باوجود شدید ازدحام اور کثرت آمد و رفت کے وہاں نہ کوئی ہنگامہ نظر آتا ہے نہ کوئی شور و غل، ہر کام سکون کے ساتھ ہو رہا ہے، ہر شخص خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں نہمک ہے، اور یہ سب نتیجہ ہے انتظام معیشت کا اور فرض شناسی کا، ایک مشرقی انسان کی طرح نہ ان کے ہاں کاپلی کی دیر ہے نہ گھبراہٹ کی جلدی۔ تم اگر کسی ضرورت سے ڈاکخانہ میں جاؤ گے تو وہاں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہ جاؤ گے اور تم کو یقین ہو جائیگا کہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی، لیکن اگر تم صبر کے ساتھ صف میں شامل ہو گئے تو پھر دیکھو گے کہ چند منٹ کے اندر تم سے آگے کا ہجوم چھینٹ گیا ہے اور تمہارے بعد اس سے زیادہ لمبی انتظار آدمیوں کی بن گئی ہے۔ وہاں یہ رات دن کا مشغلہ ہے۔ اور ہر شخص اس مکا کی زندگی کا عادی ہے۔

تم کسی بڑے مخزن (اسٹور ہاؤس) یا تجارتی ذخیرہ کی دوکان میں پہنچ جاؤ اور وہاں کے انماک کو دیکھو۔ تم یہ معلوم کر کے حیران رہ جاؤ گے کہ ایک دن میں وہاں ۴ لاکھ آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہاں دو روزہ سے داخل ہوتے ہی تم کو مختلف تختیاں لگی ہوئی نظر آئیں گی جو مختلف سمتوں کا حال بتاتی ہیں اور ہر سمت میں مختلف قسم کے مال کے ذخیرہ کا پتہ بتاتی ہیں پھر تم ذرا آگے بڑھو کہ وہاں کے خوش سلیقہ ملازم (مرد عورت) شگفتہ روی کے ساتھ آئے اور تمہاری ضروریات کے متعلق تمام آسانیاں ہم ہو جائیں۔

ٹیلیفون سڑک پر ہر جگہ تم کو ملین گے اور فوراً تم کو اس مکان کے نمبر سے ملازمین کے جہان سے تم گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ زمین کے اوپر نیچے یہاں ریل کا ایسا ہی جال ہے جیسے جسم انسان میں خراہیں دورید لیکن ہر گاڑی میں تمام تفصیلی نقشے متعدد اشارات و ہدایات موجود ہوتی ہیں جس سے ایک شخص بآسانی منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے، پھر یوں بھی ان نقشوں کے دیکھنے کی ضرورت کس کو ہوتی ہے۔ ریل کے ملازم خود تمہاری مدد کرنے کے لئے ہر دقت ہر جگہ غلاموں کی طرح موجود رہتے ہیں۔

انگلستان کا باسٹنڈہ اپنے قوا کو کبھی بیکار و مہمل نہیں دیتا اور پوری ہمت کے ساتھ وہ ان سے کام لیتا ہے۔ اور یہی نظام عمل ہے کہ وہ حفظ نشاط کے لئے کافی آرام بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھو گے کہ ابتدائی مدارس سے لیکر بڑی بڑی

کالوں تک یہ ستر ہے کہ ۹ بجے صبح سے قبل وہاں تعلیم شروع نہیں ہوتی۔ اور کارخانے والے مجبور ہیں کہ اتوار اور نصف دن پنچر کا تعطیل کے لئے وقف کر دیں۔ اسی طرح ہر طبقہ کے لوگ سالانہ تعطیل چند دن کی نہایت لطف سے مناتے ہیں جس میں مالک و خدام سب برابر ہیں ایک خاتون میری دوست ہیں جن کے ایک چھوٹا بچہ ہے اور خود ہی ان کو گھر کا سارا انتظام اور بچہ کی نگرانی کرتی پڑتی ہے، لیکن اتوار کے دن وہ خود بھی تعطیل مناتی ہیں اور ایک دن کے لئے کسی عورت کی خدمات حاصل کر لیتی ہیں اس راحت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعطیل کے بعد لوگ نہایت نشاط اور تازہ قوت کے ساتھ کام پر جاتے ہیں اور ان کو کوئی تکان نہیں ہوتی۔

ریاضت یہاں کی زندگی کا سب سے نمایاں منظر ان کا شوق ریاضت ہے انگلستان کا ہر باشندہ مرد و عورت دیگر ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ ریاضت کو بھی ضروری جانتا ہے اور کسی نہ کسی ریاضت کے کلب کا ممبر ہے۔ میں نے سانٹا پول کالج میں لڑکیوں کو ایسی ایسی ریاضت کرتے دیکھا کہ کبھی میں خیال بھی نہیں کر سکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی لڑکیاں صحیح و توانا، خوبصورت، اور مستعد ہوتی ہیں۔ لندن اور اس کے قریب وجوہ اس قدر کثرت سے اور اتنے بڑے بڑے میدان ہیں کہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی ان میں آ سکتے ہیں۔ اور روزانہ یہاں کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں لیکن کوئی میدان ایسا نہ ہوگا جہاں تہیں لوگوں کا ہجوم نظر نہ آئے اور ایک خاص اہتمام کے ساتھ اس کا لطف نہ اٹھائیں۔ چنانچہ جب کیمبرج اور آکسفورڈ کے درمیان کوئی مقابلہ ریاضت ہوتا ہے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اپنے سینہ یا موٹر پر کیمبرج یا آکسفورڈ میں سے کسی کا نشان نہ لگائے ہوئے ہو۔ پھر یہ بتیں کہ اس مقابلہ ریاضت کا نتیجہ بددلی یا بے دلال میں ظاہر ہوتا ہو، بلکہ وہ نہایت خوشحالی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے کوئی تنغص پیدا نہیں ہونے دیتے۔ پھر اسی کے ساتھ ایک بڑی جماعت بازی لگانے والوں کی ہوتی ہے اور اس کے یہاں اس قدر کثرت ہے کہ اگر کوئی شخص مری رہا ہے تو بھی آدمی بازی لگانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ گھوڑ دوڑ یا دوسرے کھیل تماشوں کا کیا ذکر ہے۔

تفریح چونکہ یہ قیوم اس قدر نشاط طلب ہے اس لئے فطرت نے ان کے ملک کو بھی ویسا ہی خوشنما اور دلچسپ بنایا ہے یہاں باغوں اور تفریح گاہوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ہر شخص نہایت آسانی سے ہر جگہ کارخانہ کی منہمک زندگی سے نکل کر ان میں ہوج سکتا ہے۔ یہاں کا بڑا پارک ۲۴۰۰ ایکڑ زمین کو محیط ہے جس میں گھاس سے سرسبز تختے، شاداب درخت، فوارے، خوبصورت پھول اور ہر وہ چیز جو روح کو راحت پہنچا سکتی ہے یہاں اور تمام پارکوں میں پائی جاتی ہے، تالابوں کی بھی اتنی ہی کثرت ہے جہیں طیور آبی اور کشتیوں کی تعداد غالباً برابر ہی رہتی ہے۔ یہاں کی چڑیاں اس قدر ناز و نسیم ہیں کہ وہ لوگوں کے ہاتھ سے اپنی غذا آکر لے لیتی ہیں۔

پھر اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھو گے کہ اگر ایک طرف باغ یا پارک، سبزہ، تالاب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے تو دوسری طرف ریاضت گاہیں کھیل کود کے میدان اور سینما و تھیٹر وغیرہ بھی ویسے ہی کھینچ بھرے ہوئے ہیں چنانچہ تم یہ نہ کہو غائباً حیرت کہو گے کہ یہاں ہر سہفتہ ۵۵ ملین (ڈیڑھ کروڑ) آدمی سینما میں جاتے ہیں اور یہی حال تھیٹر ڈاں کا ہے۔ بعض بعض تھیٹر ایسے ہیں جن کا کٹ

تم کو آج مدعو است کرنے پر ایک مہفتہ کے بعد ملیکا، گویا ایک ایک مہفتہ پہلے سے لوگ اپنی جگہ مخصوص کرالیتے ہیں ہی حال رقص و نغمہ کے شوق کا ہے کہ وہاں کی تمام رقص گاہیں آدمیوں سے بھر جاتی ہیں اور روزانہ نئے نئے طریقے رقص کے ایجاد ہوتے رہتے ہیں، بھر یہاں ہر جگہ لاسلی کا بھی انتظام ہے جس سے ہر شخص اپنے گھر بیٹھ گا ناسن سکتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ باوجود اس قدر کثیر مصروف کے وہ اتنا روپیہ بھی بچالیتے ہیں کہ جا کر دوسرے ملکوں کی سیر کریں۔

انگریز جس طرح اپنی خانگی زندگی کو محبوب رکھتا ہے، اسی طرح وہ باہر کی زندگی کا بھی مشید ہے۔ یہ لیکن نہیں کہ کوئی روشن دن گزر جائے اور اس سے لطف نہ حاصل کیا جائے جتنا بچہ گزشتہ عید فصیح کے دن مضائقہ سے لندن میں جانے والوں کی تعداد ۴ ملین تھی اور یہ بھی اُن کی جو گھوڑے گاڑیوں کے ذریعہ سے گئے، ریل، ٹراموے اور موٹر سے یا بیویوں کے علاوہ تھے صرف وائرلوا سٹیشن پر جہاں ۴ پلیٹ فارم ہیں، ہجوم کی یہ حالت تھی کہ دو میل کے طول میں انسانی صف قائم تھی، جتنا حصہ آگے کا ختم ہو جاتا تھا، آخر میں پھرتے ہی آدمی بڑھ جاتے تھے یہاں تک کہ کامل ۴ گھنٹے یہ ذریعہ کی صف قائم رہی۔

خاموش وطنیت | انگلستان کے وطنی مظاہر اس قدر خاموش ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے۔ جس دن یہاں عام ہرنال ہوتی ہے اور ہر کام کرنے والے اپنے کام ترک کر دیتا تھا یہاں تک کہ ذرائع آمد و رفت بھی تمام وہ ہو گئے تھے، وہ دن عجیب و غریب تھا کہ باوجود اتنی زبردست تحریک عمل کے شور و ہنگامہ کا کبھی نام تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے لندن پر سوگ طاری ہے اور ہر جگہ خاموشی قائم ہے۔

خانگی زندگی | انگلستان کا عائکہ یا خاندان ہمارے یہاں کے عاملہ سے مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ خاندان کے افراد یہاں باہم ربط تو رکھتے ہیں لیکن ایک نہیں ہو جاتے۔ میاں بیوی رشتہ ازدواج سے منسلک ہیں، خانگی زندگی کو دونوں ایک دوسرے کی مدد سے بسر کر رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کا پابند نہیں ہے۔ جس طرح مرد کام کرنے کے بعد باہر کلب وغیرہ میں تفریح کا مجاز ہے، اسی طرح عورت بھی آزاد ہے اور مرد کو اس سے باہر اس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے گھر کی سیادت مشرق کی طرح یہاں بھی ماں ہی کے سپرد ہے۔

جب تک بچہ چھوٹا رہتا ہے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داریاں ہی ہی ہے، اور جوان ہونے کے بعد اس کو اپنا گھر علیحدہ بنانا پڑتا ہے اور والدین سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

بچوں کی محبت | انگلستان میں عید میلادِ انتہائی مسرت کا دن ہوتا ہے۔ اور سارا لندن بالکل نئی چیز ہو جاتا ہے، زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس دن ہر چہرہ تبسم نظر آتا ہے۔ یہ عید بچوں سے متعلق ہے۔ اس لئے ماں باپ کی ساری مسرتیں اس دن سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ بچوں کو تحفے دئے جاتے ہیں اور تمام دوکانیں لاکھوں قسم کے کھلونوں اور خوبصورت کتابوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ تھیٹر اور سینما میں بھی مخصوص طور پر وہی کھیل ہوتے ہیں جن کا تعلق اس عید سے ہو۔ چونکہ یہاں بچوں کی حفاظت، تعلیم و تربیت کے لئے ایک بہت بڑی جماعت قائم ہے اس لئے غریبوں کے بچوں بھی

ان نعمتوں سے محروم نہیں رہنے اور نہ ان پر کسی قسم کی سختی ہوتی ہے، چنانچہ ایک عرصہ کسی باپ نے اپنے بچہ کو سخت جسمانی سزا دی تو اس کو بچہ میں سے قید باشتقت اٹھانا پڑی۔

یہاں بچہ کی صحت و تربیت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ گاڑیوں میں بٹھا کر باغوں میں لجانا، کھیل کود کی جگہوں میں پہنچانا، روز کا مشغلہ ہے۔ بچوں کے لئے کتابیں، رسالے اور اخبار بھی خاص طور سے شائع ہوتے ہیں اور نہایت کثرت سے۔ برٹش ٹریس اخباروں میں بھی بچوں کے صفحات جن میں عمدہ عمدہ تصویریں ہوتی ہیں بچوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ روزانہ جولا سسکی پروگرام موسیقی کا شائع ہوتا ہے اس میں ایک حصہ گانے یا قصہ کہانی وغیرہ کا بچوں کے لئے بھی مخصوص ہوتا ہے۔ پہلے سال کے بعد سے بچوں کے سامنے تصویر دار کتابیں ڈال دی جاتی ہیں، لڑکوں کے لئے علیحدہ اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ اور ہر سال ان میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

بچوں کی صفائی و ستھرائی کا ان کے ہاں بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ غریب سے غریب شخص کے ہاں بھی روزانہ بچہ کو غسل دینا ان کی معاشرت میں داخل ہے۔ تربیت کے لحاظ سے دو چیزوں کا درس سب سے پہلے دیا جاتا ہے۔ استقلال شخصی اور احترام غیر ادا کی اصول پر اس کی تعلیم و تربیت میں تدریجی ترقی پیدا کی جاتی ہے۔ پہلے بچہ کو چلنا سکھا یا جاتا ہے، پھر کھیل کود، پھر اپنے لئے ضروری چیزوں کی خریداری، اور پھر مدرسہ اور وہاں کی کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ دنیا میں اپنے ہاتھ پاؤں چلا کر عملی زندگی بسر کرنے کے لئے جھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں کثرت سے ایسی انجمنیں ہیں جو ماؤں کو بچوں کے طریق تعلیم و تربیت کا درس مفت دیتی ہیں۔ بچوں کے ساتھ ان کو نہایت شدید محبت ہوتی ہے، راستہ میں، ریل میں، دوکان میں، بازار میں، الغرض کہیں کسی کا بچہ نظر آجائے وہ اس سے التفات کئے بغیر نہیں رہتے۔ ایک بار میں بکاڈنی کے قریب تھی۔ اور میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ تھی، جہاں بچوں کا وہ عالم کہ ایک انسان اس کو دیکھ کر آسانی سے حشر کا مفہم جان سکتا ہے۔ لیکن باوجود اس ہنگامہ کے جو شخص میرے پاس سے گزرتا تھا، بچی (میری چھوٹی بہن) کو ضرور پیار کر لیتا تھا۔

عہد شباب

سب سے پہلی وہ خصوصیت جو ایک انگلستان کی نوجوان لڑکی کو مرکز توجہ بنا دیتی ہے، اس کا شاندار متناسب قد و قامت ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ملبوس جو ہنڈلیوں کو عریاں رکھ کر جمال قامت میں رعنائی کو بھی شامل کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک انگریز لڑکی کا حسن و جمال کسی کی توجہ کو مائل نہ کر سکے، لیکن اس کے چہرہ کی زندہ تازگی ممکن نہیں کہ گاہ کو اپنی طرف نہ کھینچ لے۔ یہ تو اس کا خارجی پہلو ہے۔ معنوی یا عملی پہلو کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ عجیب چیز ہے۔ صبح ہوئی اور اپنے کام میں تیزی سے لگ گئی۔ تم اسے کام کرتے ہوئے دیکھو گے تو اس قدر جلد اور سبک طریقہ سے کہ معلوم ہوگا کوئی تیزی ہے۔ انگلستان کی عورت درس و تدریس کی جگہ ایک بہترین مدرسہ دہاوتی ہے، تجارتی کارخانوں میں نہایت ماہر ہوتی ہے، اسٹیج پر پیش رقصہ و مہینہ ہے اور پارلیمنٹ میں زبردست ظہیر ہے۔

میں نے ایک عورت کو دیکھا جو بڑا خاندان رکھتی ہے اور اپنے شوہر، اپنی اولاد اور مہمانوں کی تمام راحتوں کی کفیل ہے۔ لیکن اسی کو میں نے کھیل کود میں مردوں سے بازیاں جیتنے، گھوڑ دوڑ میں گھوڑے دوڑاتے، وہ یا میں کشتی چلاتے، انکلی میں موڑ چلاتے، غباروں میں اڑتے، پانی میں تیرتے، ساحل پر ریت میں لوٹتے، رقص گاہوں میں بہترین لباس کے ساتھ رقص کرتے اور سیاسی مجالس میں فصیح ترین تقریر کرتے بھی سنا اور میں حیران رہ گئی کہ اس جامعیت کا کیا ٹھکانا ہے۔ یہاں عورت کی تعلیم بھی بالکل مردوں کی طرح مکمل ہوتی ہے اور دوسرے ممالک میں بھی مخصوص فنون حاصل کرنے کیلئے جاتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آخر کار انتخاب ان کو مل گیا اور اب اس وقت ۱۲۶۹۷۷۹۹ مردوں کے مقابلہ میں۔ ۱۲۸۳۲۹۲۲ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔

کریم النفسی اور تہذیب

انگلستان جانے کے بعد جب پہلے جو لفظ میں نے سنا وہ (ہندوستان) تھا اس کا استعلا ل یہاں کے لوگ بار بار کرتے ہیں، جسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کا جملی پہلو ہی ان کے سامنے رہتا ہے اور مشکل سے کبھی لفظ (ہندوستان) ان کے منہ سے سننے میں آئے گا جو اول الذکر لفظ کا بالکل ضد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں نقائص بھی ہیں اور برائیاں بھی لیکن کریم النفسی کی مثالیں ان میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ وطن پرستی، مفاد قومی، تعاون باہمی، یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک شخص کی کریم النفسی پر دلالت کرتی ہیں اور یہاں کی آبادی کا غالب حصہ (مرد و عورت دونوں کا) ان صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ یہاں کی تہذیب کا یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوکان میں مال بیچنے والا، اسٹیشن پر ٹکٹ دینے والا پہلے شکر یہ ادا کرے گا اور پھر مال یا ٹکٹ دے گا۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ کوکر کا بھی شکر یہ ادا کیا جاتا ہے اور ایک افسر اپنے ماتحت کی خدمت کا بھی اعتراف شکر یہ سے کرتا ہے۔ دوسروں کی خدمت و امداد کے لئے یہاں کے لوگ ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ رشمونڈ پارک میں ٹہل رہی تھی اور میری چھوٹی بہن جو بیمار تھی میرے بھائی کی گود میں تھی جس کو وہ بہت دیر سے لے کر ہوئے تھا ہمارے ساتھ ہی ساتھ ایک اور مرد بزرگ بھی جس کی عمر ۲۰ سال کی ہوگی وہ اپنی بیوی کے ٹہل رہا تھا۔ صورت و لباس سے یہ لوگ بہت معزز معلوم ہوتے تھے میرے بھائی نے تھک کر جا کر کبھی کوکر سے اُتار دے، لیکن وہ اسے زمین تک نہ لایا ہو گا کہ اسی مرضی نے اپنی چھڑی اپنی بیوی کو پی اور بڑ پکڑ آگے آیا اور بولا کہ اب اس بچی کو گود میں لے کر چلنے کی یادی میری ہے۔“ جانوروں کے ساتھ بھی یہاں اسی لطف و درجہ کا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں دو سال انگلستان میں رہی لیکن اس دوران میں کسی کے منہ سے ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جو دل کو مڑا لگتا۔ میں روزانہ صبح کو ریل میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ کے لئے سفر کے لئے نکل جاتی، تاکہ میں یہاں کے لوگوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کروں۔ ریل میں ہجوم کا یہ عالم ہوتا کہ تھل رکنے کو جگہ ملتی، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہاں کے مرد و عورت ریل میں بھی اپنا وقت ضائع کریں جب کوکر کیلئے یا تو وہ کسی اخبار کا مطالعہ کرتا ہو یا کوکر کی کتاب پڑھ رہا ہو گا۔ یہی حال عورتوں کا ہے۔ ایک دور صبحیچے والا انگلستان ہے اور ہر روز روزہ پر دودھ کی بوتلیں رکھتا ہو اچلا جاتا ہے۔ نہ وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ امداد چوری

کا اندیشہ اس کو ہوتا ہے۔ راستہ میں مینے کے اوپر اخبار رکھے ہوئے ہیں، لوگ گزرتے ہیں قیمت دہیں رکھ دیتے ہیں اور اخبار لیکر چلے جاتے ہیں پھر یہ دیانت و آمانت پولیس یا قانون کے خوف سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ان کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی انسان ایسی خفیف و ذلیل حرکت بھی کر سکتا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف ان کی اعلیٰ تربیت ذہنی کا۔ برنارڈ شاہ کہتا ہے کہ ”مدینت نامہ ہر اسکا کہ تم میرا اور میری خصوصیات کا احترام کرو، میں تمہارا اور تمہاری خصوصیات کا احترام کروں گا“ حقیقت یہ ہے کہ اہل انگلستان نے اس کو پوری طرح سمجھا اور نہایت تکمیل کے ساتھ اپنے ملک کے اندر اس پر عمل کر رہے ہیں۔

ادبی جواہر

تذکرہ حبیبی (فارسی) ایک تذکرہ جو میں ہندوستان و اہل ایران کے فارسی گو شعرا کا ذکر ہے مگر مصنف نے اس خوبی اور عمدہ ترتیب کے ساتھ لکھا ہے کہ میا ختمہ منہ سے کلمات آفریں کل جاتے ہیں درمیان درمیان جو حکایات و راج ہیں انھوں نے دیکھی ہیں اور بھی اضافہ کر دیا ہے قیمت ۱۱

سرپا سہن (اردو) یہ بھی ایک تذکرہ جو میں مشرق کے نام نہاد کی تعریف میں، سائنہ معروف و مشہور کے شمار دئے گئے ہیں۔ عمر زندگانی بنظیر (اردو) یعنی سوانح عمری میراں نظیر اکبر آبادی۔ ہندوستان کے مشہور اور مقبول ہر شعر و شاعر کی سوانح عمری نہاد اعلیٰ عبارت میں و راج کی گئی ہو اور ہر شعر و شاعر کی سوانح عمری نہاد سخن شعرا (اردو) ایک جامع اردو کچھپ تذکرہ شعرا۔ مصنف مولوی عبدالغفور شاخ قیمت ۱۱

کلیات النوری (فارسی) محمود غزنوی کے دربار کے سبک پرے شاعر غازی کا کلام مع ہزلیات قیمت ۱۱

دیوان تمس تبریز (فارسی) صوفیانہ بادۂ تصوف میں ڈوبا ہوا کلام ہر نہایت عمدہ کاغذ پر صحت و اہتمام کیساتھ حال ہی میں طبع ہوا ہے۔ عمر دیوان نعمت خاں عالی (فارسی) نعمت خاں عالی وہ شاعر جو کمال نے اسے عالمگیر ایسے بادشاہ کے دبائیں ہر دہرہ بنایا۔ عمر دیوان ملا نور الدین ظہوری۔ (فارسی) ظہوری وہ شاعر ہے جسے غالب نے بھی مانا اور اس کا تہلہ کیا ہے اسکا تمام و کمال کلام یہ قیمت ۱۱

کلیات مرزا اجلال سیر (فارسی) اجلال سیر ان مشہور و مقبول شعرا میں سے ہے جو صاحب طراز گروے ہیں قیمت ۱۱

کلیات ظفر میر جہاں جلد (اردو) آخری تاجدار ادبی کا نظم و کمال کلام فصاحت زبان روزمرہ، محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے ۱۱

کلیات مومن۔ حضرت مومن کا پایہ شعرا میں اتنا بڑا ہے کہ دلی کے بڑے بڑے شعرا بھی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے قیمت ۱۱

دیوان ناسخ۔ اس کتاب کو نہایت صحت کیساتھ چھوٹی تقطیع پر چھاپا گیا ہے جس سے شائع کلام بڑھ گئی ہے قیمت ۱۱

کلیات میر ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر میر کے ہرے کلام کا مجموعہ ہے میر کلیات سودا۔ میر کے حریف ظریف سودا کا وہ کلام جس نے ان کے معاصرین پر ان کی ڈھال بھادی تھی چھٹے شعر میں اتنا کامل ہے قیمت ۱۱

میں منجر نول کشور ایک ڈپو لکھنؤ

ڈاکری کا ایک ورق

چاند کا سفر

(۲)

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدود زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا، چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند، کرۂ زمین کی گرد و چکر نگار رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے، یعنی اس طرح ہم اول اول اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے تھے جو جب وطن رکھنے والوں کے لئے یقیناً آج اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دکھا کرتے تھے، آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا بھول

جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارہ کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اتنی ہی بلند نظر آرہی تھی اور باوجود اس کے کہ کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ بھمایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن میں کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیونکر ممکن ہے اور فوراً مجھے اپنے ایک دوست کا خیال آگیا جو کہتا کرتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اس کے سمندر دل کا پانی کیوں نہیں بہ جاتا۔ واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت ہم کو اوپر نظر آرہی تھی اور اس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی ہم تک نہ پہنچتا تھا۔ عقل قبول نہیں کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اس کی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے میں نہیں کہتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی لیکن آخر کار ایک خاتون چل ہی گئیں کہ مجھے تو مہلکی جلدی سے چاند میں پہنچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو کیونکہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں ——— زمین کے سمندر بہ بہ کر رہے ہیں — تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے۔

سب لوگ ہنسنے لگے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اس نے کپتان سے کہا کہ جلد سے جلد پہنچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو اس نے جواب دیا کہ ”آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہنچ سکتی ہیں لیکن کس عالم میں اسکا حال صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے۔“

خاتون۔ ”کیونکر“

پکستان: یوہ اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچ لے گی جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلہ نیچے کی طرف پھٹکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہنچ جائے اس وقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلہ ہی طرح چاند کی طرف گھٹھا جا رہا ہے لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا رخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لئے وہ جاتو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلہ کی طرح نہیں بلکہ ایک طائر کے مانند۔ اگر آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے وہاں پہنچ جائیں گی لیکن بالکل اسی طرح جیسے عینی کے گلدان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ ٹپک دیا جائے۔“

یہ گفتگو مہر رہی تھی کہ دفعۃً جہاز کی رفتار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی، اور وہ ایک جگہ معلق رہ کر قائم ہو گیا۔ اس جھٹکے کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا، میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے، لیکن بعد کو پکستان نے آکر اصل وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ جہاز کا انجن کشش قمری کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور اسے اندازہ اسی کشش سب سے کیا تھا جو زمین کے لئے متعمل ہے اس لئے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لئے اس کی کشش بھی اسی نسبت سے کم ہے۔ اب سچ گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے۔ اور اس قسم کا تجربہ شاید اب نہ ہو۔“

پکستان نے اس واقعہ پر اظہار افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ اگر جھٹکے کی کسواید اپہونچی ہو تو موافق کیا جائے۔ اب ہمارا جہاز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا سمت کی تعین چونکہ فضا ابدی میں نہیں ہو سکتی اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چونکہ پہلے روزانہ ادبیر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور دشنامی کم ہوتی جاتی تھی اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ چاند سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بوی کو سمجھایا تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ چاند میں خود روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہو۔ اور اسی وقت اس کا ظور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے ٹوٹی ہیں، پھر چونکہ شاعوں کا پورا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور پر جا کر ہوتا ہے اس لئے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ سفر اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ درکار ہوتی تھیں۔ حالانکہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور ایک ادس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرامہ رہ گیا تھا یعنی جو وزن پہلے ایک روٹی کا ہوتا تھا اس میں اب آٹھ روٹی چڑھتی تھیں۔ چونکہ اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا اس لئے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیاجاتا تھا، یہی حال مشروبات کا تھا، اور خراب کے دو ساغر پوری قبل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نملکیاں ناک سے علیحدہ کر کے رکھ دی گئی تھیں، پھیپھڑے

ساکن تھا اور قلب و نبض کے مہزبات نہایت ہلکے ہو گئے تھے۔ کیونکہ کمرہ قمر کی فضا میں ہو اسے زیادہ ایک لطیف چیز ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کر کے خون میں بھجاتی ہے اور رفتار خون کو بہت دہیا کر دیتی ہے۔ اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیمپٹر سے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ایک ”آخری عضو“ ہو کر رہ گیا۔

سردی ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگلیٹھیاں دھک رہی تھیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے لباس، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے، لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیونکہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور کھات کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تھا تو اپنی ایک روئی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب تیر جو میں محسوس کر رہا تھا، وہ یہ تھا کہ جذبات محبت و ہمدردی میں کمی پیدا ہوئی جا رہی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی، یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یورپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے، لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت الفتات باقی نہیں رہی ہے، نہ مرد عورت کے لئے اپنی جگہ خالی کرتا ہے۔ اگر وہ جازکی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھ کر اس کو سنبھالتا نہیں اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔

گفتگو کا ذخیرہ روزہ ہی بند ہو گیا ہے، کیونکہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے، لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بننا اور نہ کانوں تک پہنچتا ہے، ادائے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سنکر کوئی بات بھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کمال ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر میں آیا، کیونکہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں آگیا تھا کہ اس کا دہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیونکہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن و منور عجیب و غریب بات معلوم ہوتی تھی، سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جلتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی۔ اور محض رات ہونے کا علم اعصاب و دماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

ابن ایک ہفتہ کی رات میں دو عجیب و غریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ دفعۃً نہایت سخت گرمی محسوس ہونے لگی اور سب پسینے پسینے ہو گئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سیکرادوں

عبارے جو یکسر شعلہ جوالہ نظر آتے تھے اڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔ کپتان گھڑیا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا اجازت افتاق سے چاند کے نجمیات (جھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہنچ گیا ہے جو ابھی تک گیس کی حالت میں مشتعل ہیں اس کے چہرے سے تشویش کے آثار پیدا تھے۔ لیکن اس نے انجن کی مخالفت سمت کی قوت کو دور کر کے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولہ کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور پھر مشکل سے نیند آئی۔

دوسرا تجربہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھانے کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعۃً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور صفائیں بیشمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر اُنھوں نے نور کا جال بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ سب چاند کے شہاب ثاقب (Shooting Stars) تھے۔ نظارہ اس قدر دلغریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہو گیا اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعۃً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹائیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے محاطے ہزاروں سے کم نہ ہوں گی، جہاز نے عرصہ ہوا اگر گرین اور کوئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہو گئے ان چٹائیوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس میں سپید نقطہ اس قدر کثرت سے تھے جیسے گنی فول (مرغی) کے پر میں نظر آتے ہیں۔ ان کے بہت سے ٹکڑے کر کے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کر دئے گئے اور کچھ اس لئے محفوظ رکھ لئے کہ کرۂ ارض کی کسی عجائب خانہ کو دیدے جائیں گے۔

یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دلکش تھے لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پر لطف وقت وہ تھا جب پورے ۶۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت بصارت آج از سر نو پیدا ہوئی ہے۔ سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر جنوری میں محبوب ہو جاتا ہے۔

سب لوگ کبھل اتار اتار کر عرصہ پر آگئے اور بے اختیار اس طور پر ایک دوسرے سے بتلیکھ بولنے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جن کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ جھگڑے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور ان کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائیگا، چونکہ مس جوزف اپنے جسم کے محاطے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرد رات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ، مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں، اسی سلسلہ نشانی میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا دہنی بید لیکر باہر پھینک دیا یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن ان کی اور میری

حیرت کی حد نہ رہی جب اس میدان کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اڑتے ہوئے دیکھا اور تھوڑی دیر میں وہ جہان سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پر لطف تھا کہ اس جو زف نے اس کے بعد اپنی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری نہ تھیں، باہر پھینک دیں اور اس تماشے کا لطف اٹھایا۔ جس وقت انہوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی، اوردہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بند ہا ہوا ایک جال آگے کر کے ٹوپی کو پھرا نعرہ کھینچ لیا۔ جس جو زف نے اس کو پھر فوراً باہر پھینک دیا اور کپتان نے پھر اسی طرح اس کو لے لیا۔ دیر تک یہ مشغلہ جاری رہا اور غالباً جاری رہتا، اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہو کر رات کا سماں نہ پیدا کرتا۔ دن نہایت مختصر صرف سہ گھنٹے کا تھا اور اس خیال نے کہ اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کر دیا۔ بجلی کی روشنی ہوئی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے گئے، کبیل وغیرہ جسم پر ڈالے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ہر شخص طیارہ گویا اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کال ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا۔ ہم سب سو کر اُٹھے تھے کہ دفتہ“ روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آرہے ہیں۔ جو کرۂ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے وہاں نظر آتے تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر اپنی مادہ گیتی کے آغوش میں پورے دے دیں کیونکہ اپنے اپنے جہاز بڑے بڑے دریا وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان کو معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آباہی کے ہیں تو ہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہر کو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم نیچے کی طرف جارہے ہیں در نہ اس سے قبل تو بلندی و سبکی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا۔ الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اتر آجے وہاں کی زبان میں عو شان یعنی تھمے گل کہتے ہیں۔

باقی ————— باقی

نیاز

رشتہ کی ضرورت

ایک مسلمان (سید) ایم اے ایل ایل بی جو ڈیفنڈ افسر تھو، دار ۷۰۰ روپیہ عمر ۳۷ سال ایک روشن خیال تعلیم یافتہ، سلیقہ مند، خوش مزاج، خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے کسی قومیت یا ذات کی قید نہیں کیونکہ ان اگر کم عداقت و تعاقب (میں خدا کے یہاں عزت والا ہے جو نیک سیرت ہے) فوٹو و خطوط ذیل کے پتہ سے

پتہ

مولوی سراج الدین احمد صاحب نمبر ۳ بی بی روڈ ڈاک خانہ کٹر اشہر الہ آباد

فردوسِ محبت

اے کاش اکھلیں آنکھیں گہوارہ عشرت میں
اے کاش! کہ ہوش آئے میخانۂ الفت میں
اے کاش! اپونچ جاؤں کاشانۂ راحت میں
اے راہ نما بچل

فردوسِ محبت میں

خوابیدہ کاوش تھا بیدار ہوا ہوں میں
شورشِ گہستی سے بیدار ہوا ہوں میں
دنیا سے نکلنے کو تیار ہوا ہوں میں
اے خضرِ وفا بچل

فردوسِ محبت میں

ہے مشغلہ دنیا تو دین و فساداری
ہر ذرہ ہستی ہے تصویرِ دلآزاری
انسان رہے کب تک محوِ غم خود داری
اے مردِ خدا بچل

فردوسِ محبت میں

ادبار کی آوازیں پستی کی صدا ہیں
غم ریز ہیں نظارے خون بارِ خلا ہیں
اندھیر ہے دنیا میں تاریک فضا ہیں
اے شمعِ ہدیٰ بچل

فردوسِ محبت میں

اب شمعِ کلیسا میں تنویر نہیں ہوتی
بت خانے میں الفت کی تصویر نہیں باقی!

اللہ کے گھر کی بھی تو قیسم نہیں باقی

اے میری دعا بچل

فردوسِ محبت میں

اس جنتِ زرین میں انوار کے چشمے ہیں
آرام کے دریا ہیں ”اپکار“ کے چشمے ہیں
تقدیس کی نہریں ہیں ایشوار کے چشمے ہیں

اے بحرِ عطا بچل

فردوسِ محبت میں

اس بزمِ کاہر گوشہ کا شانہ راحت ہے
اس خلد کی ہر محفلِ میخانہ راحت ہے
اس خاک کا ہر ذرہ آسانہ راحت ہے

اے خلدِ نانا بچل

فردوسِ محبت میں

اس دامنِ زرین میں معصوم نظارے ہیں
اس وادیِ رنگیں میں معصوم نظارے ہیں
اس محفلِ تسکین میں معصوم نظارے ہیں

معصوم دعا بچل

فردوسِ محبت میں

ہر باغ میں الفت کی نہریں مترنم ہیں
ہر سرسبز میں عشرت کی موجیں مترنم ہیں
ہر موج میں راحت کی لہریں مترنم ہیں

اے نعمتِ سرا بچل

فردوسِ محبت میں

ریگینی الفت سے گلریز ہے ہر گوشہ
فیاضیِ نطرت سے زرخیز ہے ہر گوشہ

اربابِ محبت سے لبریز ہے ہر گوشہ

اے شوخِ ادا پچل

فردوسِ محبت میں

اُس ”نور“ کو راحت کی کمر توں نے بنایا ہے

اس ”گیت“ کو فطرت کے تاروں نے بنایا ہے

اس خلد کو الفت کے ذروں نے بنایا ہے

اے مست و فانی پچل

فردوسِ محبت میں

اس بلغ کا ہر غنچہ تقدیس کا یوسہ ہے

اس ساز کا ہر نغمہ تسلیم کا سجدہ ہے

اس نور کا ہر شعاع تسکین کی ذیبا ہے

اے ہوشیار پچل

فردوسِ محبت میں

گلزارِ بہاروں سے شاداب ہے ہر کیاری

انوار کی نہروں سے سیراب ہے ہر کیاری

ایک کیف ہے ہر غنچہ ایک خواب ہے ہر کیاری

اے روحِ فزا پچل

فردوسِ محبت میں

تغیر و تبدل سے آزاد ہے وہ دنیا

سرور ہے وہ دنیا، شاد ہے وہ دنیا

آغوشِ محبت میں آباد ہے وہ دنیا

جلِ ابھرِ خدا پچل

فردوسِ محبت میں

موت

فطرت کا انتفات کہیں! یا جفا کہیں!	حیرت میں ہیں کہ موت کے منظر کو کیا کہیں!
انجام ہو رہے کہ یہ آغاز نیست ہے!	کوئے فنا کہیں! دردِ داد بقا کہیں!
سننے ہیں جب عوام کی آہ و بکا کا شور	جی چاہتا ہے موت کو کوسیں برا کہیں
لیکن ادھر ہے فلسفیٰ حال کی پکار	کیوں موت کو نہ خضر رہ ارتقا کہیں؟
خوابِ گراں سے کیوں اُسے تعبیر کیجئے؟	کیوں ہم نہ اس کو بچہ، مشکل کشا کہیں؟
وابستہ گھر نمود ہے بودِ زندگی	پھر تو بجا ہے موت کو آفت بلا کہیں
لیکن اگر ”نمود“ کرشمہ ہے بود کا	کیوں موت کو نہ زیست کا اک شعبہ کہیں“

انما کس زندہ است و ندارد حیات را

در حیرتِ مہرِ چہ طور بداند ممات را

ایمن حزمیں

ہر قسم کی چھپائی رنگین و سادہ ”مکار“ مشین پریس میں وعدہ کی پابندی کیسا تھ ہوتی ہے۔

غزلیت

بآسٹریسوانی

دونوں راہیں چھوڑ دی ہیں ہمیں مشکل دیکھ کر
دیر دیکھ کوں جانے۔ وسعت دل دیکھ کر

۲

کچھ تو لازم تھا خیال اک ناتواں کا دوستو
ساتھ میرا چھوڑتے۔ دوچار منزل دیکھ کر

۳

غور سے دیکھا تو پایا اک جہان آرزو
عجب حیرت ہو گئی ہے۔ وسعت دل دیکھ کر
قیس کو محل سے بلادیکھ کر آہستی رہی
قیس کیوں روتارہا لیلیٰ کا محل دیکھ کر
اشفاق بزم عقبیٰ لیچلا سوسے عدم
جب کوئی اکٹا گیا۔ دنیا کی محفل دیکھ کر
بے بلائے کیوں گئے ہم ان کی بزم ناز میں
بے اٹھائے کیوں اٹھے ہم دگ محفل دیکھ کر
حق بجانب تھا اگر صیاد کو موتی خوشی
بھول کیوں ہنسنے لگے خون عشاں دیکھ کر

۴

بآسٹریسوریدہ سرہنشاہ با بیٹھا ہوا

اور سب روتے تھے اسکی دشت دل دیکھ کر

جگر مر بلوی

کوئی بڑا کچھ مجھ کو ناگوار نہیں
کہ دل کے آگے کسی کا گناہ گار نہیں
ابھی نہیں ہوئی تھیں ضبط جوش جنوں
ٹھہر ٹھہرا بھی خلوت خیال یاد نہیں
دعائے مرگ مفاجات ہو یہ دیر دہ
ہیں زیادہ راحت کا انتظار نہیں
وہ غم تھا داغ کلیجہ میں جس کی باقی ہر
یہ عیش تھا کہ کوئی جس کی یادگار نہیں

۵

نگاہ پھیر نہ مجھ سے کہ دل لرزتا ہو
بشر ہوں میں میری ہستی کا اعتبار نہیں

جو چونک دی نہ کلیں میں وہ آتش گل جو آگ بجے نہ دل میں لگے بہار نہیں
چل اب خدا کے لئے خاکِ فشت پر نہیں چمن میں بے دل ناداں مجھ کو قرار نہیں
جہاں کا شور ہر کاؤں میں نقشِ آنکھوں میں
نہیں جگر تم ابھی مجھ کو انتظار نہیں
حافظ غازی پوری

مرے گریہ میں شبِ تاغم ہی آہ ہے انڑی رہی کہ وہ شمع کشتہ در دہوں جو نہ مل سکی تو دہری رہی
مجھے دوریوں سے گلہ نہیں کہ ہوں بندہ تم آشنا جو خیال ہو تو یہی ہے اب نہ وہ پہلی جلوہ گری رہی

کوئی جلوہ بار جو ہو گیا، مری کائناتِ حقیقہ پر تو ازل سے تابہ اب مجھے ہی ایک بے خبری رہی
یہ تغیرات و حدود کیا، مرے رنگ کو کوشاں کیسے ہوں وہ شمعِ گلشنِ راز میں، جو خزاں میں لڑھکی رہی
کہوں کیا وہ خاص تھی کیفیتِ جوں جوں نیا دکو دی راز دار جو دھتی، دی وجہ بے خبری رہی
نہ وہ فوقِ لطف سحر ہے اب نہ صبیحوں میں شرباب وہ بہار اپنی گد رگی کہ کٹوری گل کی بھری رہی
ترے تو مصافتہ ریزے مجھے محزون کیا مگر مری چشمِ حوص پسند کو دی فکر کم نظری رہی
کسے خاکِ غنچہ دل مرا کہ خزاں کا دود آب آگیا نہ فضا میں اگلی ہے تازگی نہ گلوں میں چل نہ رہی
نہ قرار آیا کوئی گھر ہی، نہ ہوا نصیب مجھے سکون جو بہار آئی تھی باغ میں ہی وجہ دوسری رہی
ترے دل کی شمع بھڑک اٹھی، ہو چل کچھ خاک جگر ترا
مجھے حافظ پیش آشنا کیسی فکر چارہ گری رہی!!

اقرارِ اسپوری

بھگا ہوں سے ہو اچھل چودہ پیشِ نظر ہو کر ہمارے دلی دنیا رگہ گئی زیرِ دہر ہو کر
خدا رکھے تمہاری بزمِ بھی طرہ تماشا ہے جو آتے ہے وہ رہ جاتا ہے سرتاپا نظر ہو کر
زمانہ ہر طرح اہلِ جہان کا ساتھ دیتا ہے کسی کارا ہزن فکر کسی کارا ہسر ہو کر
حقیقت میں نظر سے دیکھ دنیا کی ہر اک شے کو مرہ جب ہے بنے توحنِ مگر صورتِ مگر ہو کر
اثر سے بچ کے جلنے کی کوئی حد نہایت بھی رہے گا ایک دن نالہ پشیمان اثر ہو کر
کمالِ جذبہ الفت اگر ہو جائے گا پسند ا رہیگی ایک دل کی دوسرے دلی کو خبر ہو کر
چھپے دیر نقاب اکا جمالِ روئے تاباں کیا شعاعِ حق پرودہ میں رہی کیوں پرودہ دم ہو کر

معلومات

زلزلہ خدا جانے کتنے نوامیس فطرت اور مظاہر قدرت ایسے ہیں جن کا صحیح علم انسان کو نہیں ہو سکا ہے اور انہیں میں سے ایک زلزلہ بھی ہے۔ زلزلہ کی حقیقت کا علم نہایت دشوار ہے کیونکہ جسوقت وہ آتا ہے تو ہر شخص اپنی جگہ بدحواس ہو جاتا ہے اور اس کو اتنا اطمینان کیسے نصیب ہو سکتا ہے کہ یہ کھڑکاس کے حادثہ کی حقیقت پر غور کرے۔

حال ہی میں ایک پروفیسر نے ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان ایک ہزار زلزلوں کا نقشہ مرتب کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روزانہ دو زلزلوں کا اوسط پڑتا ہے۔ لیکن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان زلزلہ کی کیفیت کو اسوقت محسوس کرتا ہے جب پینچ کی مقدار دو زیادہ زمین میں حرکت پیدا ہو اور یہ حرکت ہر جگہ نہیں ہوتی۔ زلزلہ کی علامتیں کیا ہیں:-

- (۱) آواز۔ اول اول زمین کے نیچے توپوں کے سر ہونے کی آواز آتی ہے اور کبھی دھونسا بجنے کی
- (۲) اس آواز کے ساتھ ہی یا اس کے بعد زمین میں جنبش ہوتی ہے اور کبھی جنبش اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بڑے بڑے مکان گرجتے ہیں
- (۳) اسکی حرکت باقاعدگی ہوتی ہے اوپر کی طرف سے نیچے کی جانب یا اٹتی ہوتی ہے ایک طرف سے دوسری طرف اور کبھی جگہ دار لگائی کی طرح ہوتی ہے۔
- (۴) زمین میں ہر جگہ جنبش نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص مرکزی جگہ پر ہوتی ہے اور پھر چاروں طرف اس طرح پھیل جاتی ہے جیسے ساکن پانی میں ڈھیلا پھینکنے سے لہریں پیدا ہوں۔

زلزلہ کی موج کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ اگر کسی چٹانی یا پتھر ملی زمین میں زلزلہ آئے گا اور زلزلہ کا مرکز عمیق ہوگا تو زلزلہ کی موج کی رفتار ۱۰ میل فی منٹ ہوگی کبھی کبھی ۳۰ میل تک بھی پہنچ جاتی ہے اور یہ رفتار موج کی طرح چاروں طرف یکساں پھیلتی ہے۔ زلزلہ کا مشہور سبب وہ غیرات بیان کئے جاتے ہیں جو زمین کی سطح میں ہوتے رہتے ہیں۔ زمین کا چھلکا یا بالائی سطح بہت بڑی اور وزنی ہے جو مرکز زمین کی طرف کھینچی رہتی ہے اور زمین کا اندرونی حصہ خرمج حرارت کی وجہ سے ہر وقت سکڑتا رہتا ہے اس لئے اس کیفیت سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے اور چٹانیں پھٹ جاتی ہیں، چنانچہ جن مقامات میں پہاڑ نہیں ہیں اور زمین رتیلی ہے وہاں زلزلہ کا اثر بہت کم یا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔

اس سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زلزلہ کا سبب کوہ آتش فشاں کا وجود ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کوہ آتش فشاں کی آتش افشانی خود زلزلہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی شدید آندھی بھی زلزلہ کا باعث ہوتی، چنانچہ امریکہ کے باہر زلزلہ ٹنڈوف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ بحر اوقیانوس میں سخت آندھی چلی جس سے سواصل امریکہ کو ایسی سخت محسوس ہوئی کہ زلزلہ محسوس ہونے لگا، لیکن ایسی

مٹائیں شاد و نادر ہوتی ہیں۔

اگر زلزلہ کامرکز سمندر کی گہرائی میں ساحل سے قریب ہوتا ہے تو نہایت بڑی بڑی لہریں اٹھ کر ساحل سے ٹکراتی ہیں اور تباہیاں پھیلا دیتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قعر بحر مرکز زلزلہ کے قریب موج میں آتا ہے اور یہ موج اس قدر شدید ہوتا ہے کہ بچاس بچاس فٹ کی بلند اور سیکڑوں میل کی لمبی لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

۱۸۵۵ء میں پرتگال میں ساحل سے سو میل کے فاصلہ پر سمندر میں زلزلہ پیدا ہوا اور آدھے گھنٹے کے اندر ساٹھ ساٹھ فٹ کی اونچی لہریں ساحل سے آکر ٹکرائے گئیں۔ جس سے ہم ہزار جانوں کا نقصان ہوا۔ اسی طرح ۱۸۵۴ء میں جب جاپان میں زلزلہ آیا تو اس کامرکز بھی سمندر ہی تھا جو ساحل سے ۱۰۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور جس کا اثر یہ ہوا کہ آئر لینڈ کے ساحل پر بھی ۵ فٹ اونچی لہریں پیدا ہو گئیں۔

اسی طرح ۱۸۶۷ء میں سپرو کے ساحل پر زلزلہ آیا جس کامرکز سمندر تھا اور باغ منٹ کے اندر عام تباہیاں پھیلا گیا۔

ڈاک کے عجائب | لندن کا محکمہ ڈاک ریل سے صدر ڈاک خانہ تک ڈاک کے تھیلے لیجانے کے لئے زیر زمین ریل کا استعمال کرتا ہے تاکہ لوگوں کا ہجوم حاج نہ ہو۔ یہ ریلیں بغیر ڈرائیور کے صرف مکانگی ذریعہ سے چلتی ہیں اور روزانہ بہ ہزار تھیلے ہو جاتی ہیں۔ ریل کی پٹری کی لمبائی ۶ ۱/۲ میل ہے اور وہ فٹ زمین کے اندر سرنگ میں واقع ہے۔ یہ سرنگ گزشتہ جگ کے دوران میں طیارہ کی گئی تھی تاکہ لندن کے عجائب خانہ کی تمام قیمتی چیزیں اس میں محفوظ کر دی جائیں اور ہم کے گولے ان پر اثر نہ کریں۔

فرانس کی ایک خاتون مرگریٹ نے دریافت کیا ہے کہ چیونٹیوں میں ایک خاص جماعت آگ بجھانے کے لئے بھی ہوتی ہے جہاں چیونٹیوں کے بھٹ ہوتے ہیں وہاں ایک لکڑی جلا کر خاتوں مذکور نے ذرا بلند مقام پر رکھ دی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک جماعت چیونٹیوں کی بھلی اور کوئی رقیق سامانہ چھڑک چھڑک کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ ان میں بعض جلا کر مر بھی گئیں یہ بھی دیکھا گیا کہ جو چیونٹیاں آگ میں گر گئی تھیں ان میں سے بعض کو دوسری چیونٹیوں نے نکال لیا اور پھر آگ بجھانے میں مصروف ہو گئیں۔

برقی روشنی کے ذریعہ سے اعلان و اشتہار کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ نیویارک کے ایک جزیرہ

بجلی کے اشتہار | انتہا میں اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ۲۱ ہزار اشتہارات کیلئے تقریباً ۳۱ لاکھ برقی قمعے استعمال کئے جاتے ہیں ایک کمپنی نے یہاں ایک ہوٹل صرف اس لئے خرید کیا کہ اس کو صرف برقی اشتہارات کیلئے کام میں لائے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان اشتہارات کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوگی وہ ہوٹل کی آمدنی سے زیادہ ہوگی۔

انیمیا (خون کی کمی) ایک بیماری ہے جس میں خون کی تولید کم ہو جاتی ہے اور انسان دُکھا ہوتا جاتا ہے۔

انیمیا کا علاج | جرمنی کے ایک ڈاکٹر شنگ نے اس کا ایک عجیب و غریب اور نہایت مجرب علاج دریافت کیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ مریض کو گائے کی کچی کلجی کھلائی جائے

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اُس نے اس طرح ۹۴ مریضوں کا علاج کیا جن میں سے ۹۰ بالکل صحتیاب ہو گئے۔ باقی چار اور بیمار یوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

قطب جنوبی کی برف

جرمنی کے ایک پروفیسر منیاردس کا بیان ہے کہ قطب جنوبی کے چاروں طرف بھی موٹی برف کی مقدار اتنی زبردست ہے کہ اس سے سارے کرہ ارض پر ۱۰۰ فٹ کی موٹی چادر بچھائی جاسکتی ہے اور اگر یہ پگھل جائے تو سمندروں کی سطح ۱۰۰ فٹ بلند ہو جائے۔ اُس کے خیال میں اس کا وزن ۲۰ ٹن ہے۔ اس کا بیان ہے کہ قطب شمالی کی طرف جو برف پوش پہاڑ نظر آتے ہیں، وہ پہاڑ نہیں ہیں بلکہ یہی منہ برف ہے جس کی تھوٹے ایک دوسرے پر چر چکر پہاڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سب سے بڑا جہاز

فرانس کی ایک کمپنی نے سال گزشتہ ایک دھانی جہاز ۲۴ ہزار ٹن وزن کا تیار کیا جو فرانس اور امریکہ کے درمیان چلتا ہے۔ ایک اور کمپنی نے ۴۶ ہزار ٹن کا جہاز بنایا جو جرمنی اور نیویارک کے درمیان سفر کرتا ہے، ہر چند یہ دونوں جہاز انگریزی جہاز بحالک اور بریٹانیا کو نہیں پہنچتے جو ۵۶ ہزار اور ۵۲ ہزار ٹن کے ہیں لیکن یہ دونوں جہاز برطانیہ کے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جرمنی کے ہیں جن پر برطانیہ قابض ہو گیا ہے۔

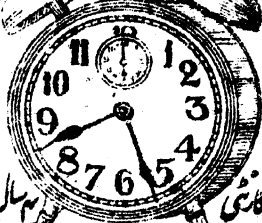
کوئٹہ کمپنی نے اب ایک اور جہاز بنانا شروع کیا ہے جس کا وزن ۶۰ ہزار ٹن کا ہوگا اور اس کی لمبائی ۱۰۰ فٹ ہوگی اس میں ۵ ہزار مسافر آسکیں گے۔ ایک اور جہاز طیارہ ہو رہا ہے جو بحالک جہاز سے زیادہ شاندار اور تیز رفتار ہوگا اور دونوں جہازوں کی لاگت کا اندازہ گیارہ ملین گنی (تقریباً پندرہ کروڑ روپیہ) کیا جاتا ہے۔

دواخانہ شفا فی نظیر آباد لکھنؤ

مسنوف عجائز صرف لندن کے استعمال سے تمام صنعتی ذہن باطل یقینی طور پر آزمائی ہوئی اور اس کا نام ہے۔ اس کی ایک گولی کچھ دیر میں کھائی جائے اور پھر دیکھئے کہ دو اذان جو شب بے بی میں کیا گیا طلسمی اثر پہنچے ہوئے ہیں شیشی ۱۶ گولی قیمت ۵ روغن عجائز مسنوف عجائز کے ساتھ ۱۲ روغن اس روغن کا بھی استعمال صرف اسی روغن کا بھی استعمال اتنی جگہ کہ اس کا نام ہے۔ قیمت ۵ مسنوف خاص وقت میں ایک مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے مسنوف نادر جس کا بیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبع کیفیت کو کسی نوبت

آج کی قیمت ۱۲
مک عجائز معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقتاً جو ان کی کس چیز کا نام ہے قیمت ۵
الایطلسی یہ چیز سوائے ہمارے دھانے کے کہیں نہیں مل سکتی پانچ روغن
الایطلسی معمولی الایطلسی کی طرح استعمال ہوتی ہے اور چودہ دن کے بعد
ایک شخص تمام دواؤں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اگر آپ مایوس ہو چکے ہیں
تو ان کو متاثر استعمال کیجئے۔ قیمت ۵
ملے کا پتہ
منیر دواخانہ شفا فی نظیر آباد لکھنؤ

پروگرام



علاوہ معاشم کے تانے کے ایک باؤنابر کیا اس کا حق کہہ دیتا
 ہے جس نام پر آپ کو سید نامہ نام منظور ہو۔ جس کے نام
 پر آپ کی سید نامہ نام کو سید نامہ نام کہلا جائے
 علاوہ معاشم کے نام چار روپیہ

ولایت کی تجدید و ترقی کے لیے ایک مرتبہ سیاسی بھوکہ فوٹو کے صفحہ لکھنے والے نبیات دہانی



س قدر مقبل گھڑی ہوئی ہے۔ شاید یہ کوئی
میسری گھڑی ہوئی ہو۔ کیونکہ علامہ تمام عربی
بہترین صفت اس میں یہ ہے کہ نہایت سبک
ہوئی ہو۔ قیمت یہ رسول رنگ پانچ سو روپے صم



سگری کا کس ۱۱ کپڑے کو لٹا دینا ہے
وہ جس کی میں نشی۔ نوے۔ یہ کہ معلوم
ہوئی کہ کلاں کی رشتہ و مستورات کیلئے زیور



وہ ملک کی سترہ سو چالیس سال کے
 کے ملک کی سترہ سو چالیس سال کے
 کے ملک کی سترہ سو چالیس سال کے

نوٹ: اس جو حصہ فارمن بن یا چڑیاں دو نوٹیں سو ایک اشیا خریدیں ان کو بقیہ باروں اشیا مبلغ نو روپیہ میں روانہ کیا دیتی۔

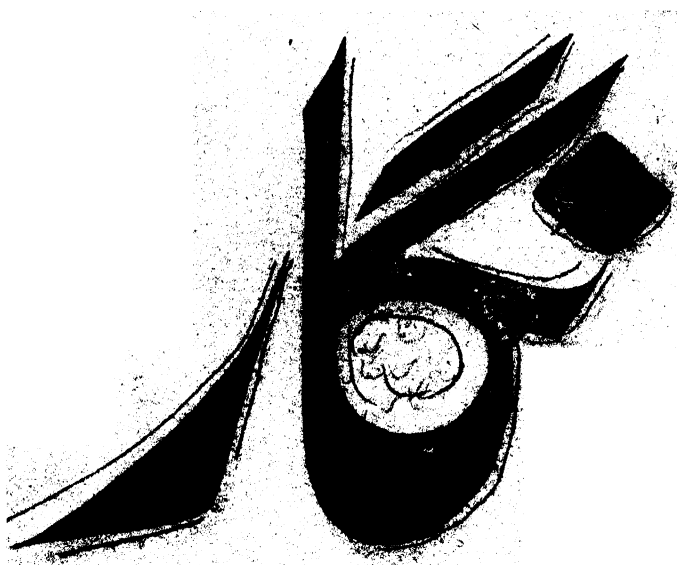
نوٹ ۲۔ جو صاحب فائز بن احمد چڑیاں دونوں استیاء خریدنا چاہیں
موقوفہ تینوں گھڑیاں آٹھ روپیہ میں روانہ کی جاوے گی۔

بہترین ثابت ہوئی کہ قیمت منہ مصدود لاک

نیا چپے لاج باؤں جمیری گیٹ ۵ دہلی

یہ سفر نامہ جس قدیم خطبہ باد مغلوب فخر ہے کہ تم کے بغیر نظر علیہ نہیں ہوتی اس میں ہندوستان، عمان، مصر، اٹلی، فرانس، جرمنی، اٹلی، تاجکستان، روس اور بعض سفیری ملکوں کی سیاست کے حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں اس سفر نامہ کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو شاہان، امان، امدغان کے سرکاپ ہیں اور جو مداخلت پیش آئے گی آپ انہیں کے سامنے پیش آ رہے ہیں۔ یہ سفر نامہ قیمتی معلومات کا ذخیرہ اور پرب گے اندرونی حالات کا آئینہ اور ہر ملک کے تمدن و ترقی کی ایک تصویر ہے۔ اس میں کیا بھی تصاویر ہیں، رنگینی ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ حضرت شاہان، امدغان، امدگورنہ کے عجیب حالات زندگی اور طوائف و افغان انسانوں کی زندگی کی کجائات بھی لکھے ہیں۔ کتاب مطالعت اور کاغذ نہایت عمدہ ہے۔ زیب فخر امت تقریباً دو سو سو فیصد کتب کے درجہ کتاب کا محقق فرست مخلص علیہ السلام

[illegible]



قواعد رسالہ نگار

- ۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔
- ۲۔ رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت دیا گیا جائیگا۔
- ۳۔ خطوط کتابت کے وقت اپنا پتہ فرمایداری ضرور لکھئے جس پر فرمایداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہیں۔
- ۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا اراکائیت آنا ضروری ہے۔
- ۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
- ۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سہ ماہی دو روپیہ سالانہ۔

تقدیر	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	نرخہ	تقدیر	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بلا تہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۲۰ روپیہ	(۱۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان	تین تہ	۳۵ روپیہ	۲۲ روپیہ	۱۲ روپیہ
چھ تہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	تین ماہ سے زائد اشتہار دینے کے ہر کوئی کو ہفتہ کی شرح دینا چاہئے	ایک تہ	۱۰ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ
				(۳) سیاحتی اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر معزوف ہوسکتا ہے				

جو تھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے نگار ایک کتبہ لکھنو جو ایکے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب	بنات انش	مولانا شبلی	سفرنامہ ہندوستان	مواذہ نہیں دیر سے	محاذ خاتم النبیین
۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۱۰
۱۱	۱۱	۱۱	۱۱	۱۱	۱۱
۱۲	۱۲	۱۲	۱۲	۱۲	۱۲
۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳
۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴
۱۵	۱۵	۱۵	۱۵	۱۵	۱۵
۱۶	۱۶	۱۶	۱۶	۱۶	۱۶
۱۷	۱۷	۱۷	۱۷	۱۷	۱۷
۱۸	۱۸	۱۸	۱۸	۱۸	۱۸
۱۹	۱۹	۱۹	۱۹	۱۹	۱۹
۲۰	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰
۲۱	۲۱	۲۱	۲۱	۲۱	۲۱
۲۲	۲۲	۲۲	۲۲	۲۲	۲۲
۲۳	۲۳	۲۳	۲۳	۲۳	۲۳
۲۴	۲۴	۲۴	۲۴	۲۴	۲۴
۲۵	۲۵	۲۵	۲۵	۲۵	۲۵
۲۶	۲۶	۲۶	۲۶	۲۶	۲۶
۲۷	۲۷	۲۷	۲۷	۲۷	۲۷
۲۸	۲۸	۲۸	۲۸	۲۸	۲۸
۲۹	۲۹	۲۹	۲۹	۲۹	۲۹
۳۰	۳۰	۳۰	۳۰	۳۰	۳۰
۳۱	۳۱	۳۱	۳۱	۳۱	۳۱
۳۲	۳۲	۳۲	۳۲	۳۲	۳۲
۳۳	۳۳	۳۳	۳۳	۳۳	۳۳
۳۴	۳۴	۳۴	۳۴	۳۴	۳۴
۳۵	۳۵	۳۵	۳۵	۳۵	۳۵
۳۶	۳۶	۳۶	۳۶	۳۶	۳۶
۳۷	۳۷	۳۷	۳۷	۳۷	۳۷
۳۸	۳۸	۳۸	۳۸	۳۸	۳۸
۳۹	۳۹	۳۹	۳۹	۳۹	۳۹
۴۰	۴۰	۴۰	۴۰	۴۰	۴۰
۴۱	۴۱	۴۱	۴۱	۴۱	۴۱
۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲	۴۲
۴۳	۴۳	۴۳	۴۳	۴۳	۴۳
۴۴	۴۴	۴۴	۴۴	۴۴	۴۴
۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	۴۵	۴۵
۴۶	۴۶	۴۶	۴۶	۴۶	۴۶
۴۷	۴۷	۴۷	۴۷	۴۷	۴۷
۴۸	۴۸	۴۸	۴۸	۴۸	۴۸
۴۹	۴۹	۴۹	۴۹	۴۹	۴۹
۵۰	۵۰	۵۰	۵۰	۵۰	۵۰
۵۱	۵۱	۵۱	۵۱	۵۱	۵۱
۵۲	۵۲	۵۲	۵۲	۵۲	۵۲
۵۳	۵۳	۵۳	۵۳	۵۳	۵۳
۵۴	۵۴	۵۴	۵۴	۵۴	۵۴
۵۵	۵۵	۵۵	۵۵	۵۵	۵۵
۵۶	۵۶	۵۶	۵۶	۵۶	۵۶
۵۷	۵۷	۵۷	۵۷	۵۷	۵۷
۵۸	۵۸	۵۸	۵۸	۵۸	۵۸
۵۹	۵۹	۵۹	۵۹	۵۹	۵۹
۶۰	۶۰	۶۰	۶۰	۶۰	۶۰
۶۱	۶۱	۶۱	۶۱	۶۱	۶۱
۶۲	۶۲	۶۲	۶۲	۶۲	۶۲
۶۳	۶۳	۶۳	۶۳	۶۳	۶۳
۶۴	۶۴	۶۴	۶۴	۶۴	۶۴
۶۵	۶۵	۶۵	۶۵	۶۵	۶۵
۶۶	۶۶	۶۶	۶۶	۶۶	۶۶
۶۷	۶۷	۶۷	۶۷	۶۷	۶۷
۶۸	۶۸	۶۸	۶۸	۶۸	۶۸
۶۹	۶۹	۶۹	۶۹	۶۹	۶۹
۷۰	۷۰	۷۰	۷۰	۷۰	۷۰
۷۱	۷۱	۷۱	۷۱	۷۱	۷۱
۷۲	۷۲	۷۲	۷۲	۷۲	۷۲
۷۳	۷۳	۷۳	۷۳	۷۳	۷۳
۷۴	۷۴	۷۴	۷۴	۷۴	۷۴
۷۵	۷۵	۷۵	۷۵	۷۵	۷۵
۷۶	۷۶	۷۶	۷۶	۷۶	۷۶
۷۷	۷۷	۷۷	۷۷	۷۷	۷۷
۷۸	۷۸	۷۸	۷۸	۷۸	۷۸
۷۹	۷۹	۷۹	۷۹	۷۹	۷۹
۸۰	۸۰	۸۰	۸۰	۸۰	۸۰
۸۱	۸۱	۸۱	۸۱	۸۱	۸۱
۸۲	۸۲	۸۲	۸۲	۸۲	۸۲
۸۳	۸۳	۸۳	۸۳	۸۳	۸۳
۸۴	۸۴	۸۴	۸۴	۸۴	۸۴
۸۵	۸۵	۸۵	۸۵	۸۵	۸۵
۸۶	۸۶	۸۶	۸۶	۸۶	۸۶
۸۷	۸۷	۸۷	۸۷	۸۷	۸۷
۸۸	۸۸	۸۸	۸۸	۸۸	۸۸
۸۹	۸۹	۸۹	۸۹	۸۹	۸۹
۹۰	۹۰	۹۰	۹۰	۹۰	۹۰
۹۱	۹۱	۹۱	۹۱	۹۱	۹۱
۹۲	۹۲	۹۲	۹۲	۹۲	۹۲
۹۳	۹۳	۹۳	۹۳	۹۳	۹۳
۹۴	۹۴	۹۴	۹۴	۹۴	۹۴
۹۵	۹۵	۹۵	۹۵	۹۵	۹۵
۹۶	۹۶	۹۶	۹۶	۹۶	۹۶
۹۷	۹۷	۹۷	۹۷	۹۷	۹۷
۹۸	۹۸	۹۸	۹۸	۹۸	۹۸
۹۹	۹۹	۹۹	۹۹	۹۹	۹۹
۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ ۲۰ روپے ہندوستان سے ماہر لاڈ محصل ہوتا ہے

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۸ء

۴۳	نیاز فچپوری	باب الاستفسار	۲	نیاز فچپوری	ملاحظات
۴۷	نظای بھیرا پونی	حصہ نظم :-	۵	ابوالنعم سیدی بی لے	قائم چاند پوری
	آسی		۱۹	سید مقبول احمد بی لے	فلسفہ مذہب
۷۹	روشن صدیقی		۲۹	جنون گورکھ پوری	من درجہ خیالیم و فلک درجہ خیال (فسانہ)
۸۱	حافظا خان پوری		۴۳	عکلمین کاظمی	شاہاں بہمنیہ
۸۳	امین حزمی، ذوقی		۵۷	فخر نظای حیدر آبادی	قابل رشک خود کشی (فسانہ)
۸۵	نیاز فچپوری	ڈائری کا ایک درش	۶۵	نیاز فچپوری	گرمشتہ ماہ کا مضمون فلسفہ مذہب
۹۴-۸۹		اقتباسات و معلومات	۷۰	نیاز فچپوری	مراتی انیس کا حیدر آبادی ڈیشن

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار ۲

اگست ۱۹۲۸ء

جلد ۱۲

ملاحظات

آج مسئلہ نسائیات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مدرسہ وقافتہ کے گوشوں سے بھی اس پر رائے زنی کی جا رہی ہے اور موج کارمخ یہ ہے کہ وہی کتب خانہ ہی جن سے پہلے عورتوں کے لئے زنجیر سلاسل، قید و بند کے احکام کا استخراج ہوتا تھا، اب انہیں سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ موجودہ پردہ کا اشتداد ایک لعنت ہے اور یکسر تعلیمات اسلام کے متافی۔ اس سے قبل نگاریں بہ مسئلہ ہتھکار میں نے عرض کیا تھا کہ کلام مجید سے پردہ کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:-

(۱) عورتیں چار دیواری کے اندر بند نہ کی جائیں۔

(۲) مناسب ضروری پردہ کے ساتھ وہ باہر نکل سکتی ہیں۔

(۳) پردہ ایسا ہونا چاہئے جس سے آرائش ظاہر نہ ہو۔ اس لئے ہمارے یہاں کا موجودہ برقع عین اسی حکم کے مطابق ہے۔

(۴) اگر کوئی ایسا حصہ جسم کھل جائے جس کا چلنے میں کھل جانا اور اس طرح اسکی زینت کا ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے (جیسے ہاتھ پاؤں) تو کوئی حرج نہیں۔

لیکن میری اسی مسئلہ تحریر پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ آج جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی پردہ کے متعلق ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت کا چہرہ چھپانے کی چیز نہیں اور اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ براؤنگندہ نقاب جہاں چاہے بھرے۔ لیکن یہ حصہ ہی طے ہوا اس دو کی تزیین کا۔

اس کے آگے اب مطالبہ ”ہل من مزید“ کے لئے صرف ایک ہی چیز بچاتی ہے کہ اگر کل کو ثریا بیگم (مکہ افتخارانہ) عیاں لباس رقص میں بخود ہوجائیں، تو عبد الماجد صاحب یہ فتویٰ بھی صادر کر دیں کہ جب چہرہ ہی کھل گیا، جب کوئی بے نقاب نہ آہی گیا، جب کسی نے ہکو اور ہم نے کسی کو یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ ہی لیا اور جب جن انسانی کا وہی حصہ جو سرفتنہ عشق و محبت، کہلاتا ہے چہانے کی چیز نہ رہا تو پھر سینہ و شانہ کی عربانی میں کیا حرج ہے سیم ساقی کے دیکھنے میں کیا نقصان ہے اور کپڑے چڑھائے ہوئے پانچپے اٹھائے ہوئے سر بازار آجائے میں کیا مضائقہ ہے دسے گرد و پس امر و بود و فردائے اختر نے تو رسول کو سورہ احزاب میں یہی ہدایت فرمائی تھی کہ:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَخِصَمَاءِ لِلْوَصْنِينَ يَدْنِينَ عَلَيْهِن مِّن جِلْبَابٍ يَّعْنِي

(اے رسول اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر نقاب ڈال لیا کریں) لیکن یہ محمد اکبر عبد الماجد صاحب کے قلم حسن رقم سے مل جاتا ہے کہ یدنین علیہن من جلابیعہن کے معنی بے نقاب ہوجانے اور چہرہ کھولکر بازار میں بے نقاب آجانے کے ہیں۔ فریاد از تعادل شیش کند تو!

مجھ پر کل ہو کر پیشہ طبابت اختیار کرنے کا الزام تھا آج دنیا اس طبیب عاذی کی صداقت کا بھی مشاہدہ کرے دنیا کا اس قائد اعظم کا ساتھ اس مصلح کبیر اور عالم اسلامی کے اس باقرآن و حدیث کے فتاوائے دینی کو بھی دیکھ لے۔ تاکہ آئندہ وکیل و طبیب کے امتیاز میں کسی کو التباس واقع ہوا ذخیرہ برکت کا وہ دروازہ جو عورت کے چہرہ کو داخل ستر کر کے سے عبد الماجد صاحب کو مل دیا ہے اس کا طرہ امتیاز کسی تمدن و ہریرہ کو نہ حاصل ہوجائے۔

حال ہی میں جناب عبد الماجد صاحب کا ایک افتتاحیہ اخبار ہمدرد میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اگرگریزی ذہنیت کسی طرح ہندوستانی ذہنیت سے بالا و برتر نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ایک اگرگریزی ہندوستانی زبان میں وہ مہارت پیدا نہیں کر سکا جو ہندوستانیوں نے اگرگریزی زبان میں حاصل کی ہے اسی طرح علم و فضل کے سلسلہ میں انھوں نے جہندنام اہل ہندوستان کے شمار کرائے ہیں لیکن کیا اچھا ہو تاکہ اگر فاضل افتتاحیہ نگار اسی سلسلہ میں یہ بھی بتا دیتے کہ جب ایک قوم نہ اپنے ذہنی اکتسابات کے لحاظ سے قابلِ مفاہم ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے لائقِ ذکر تو پھر اس کی ترقی کا راز کیا ہے اور دوسری قوم جو علم و فضل میں بھی تفوق رکھتی ہے اور اخلاق و عادات میں بھی بلند مرتبہ والی ہے اس کے اعظاظ و نوال کا کیا سبب ہے۔

کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفْنَا دَاوُدَ بْنَ

دَاوُدَ (یعنی جو لوگ ایمان لائے اور بچے کام کئے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں دنیا میں قیام عطا فرمائے گا جس طرح اس سے قبل کے لوگوں کو قیام عطا ہوا) پھر اگر استخلاف فی الارض سے مراد وہی ”چہ خورد بادا و فرزندم“ ہے تو یقیناً ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی مفتوح اس کا نہیں ہے اور یقیناً ممکن فی الارض انہیں کو حاصل ہے لیکن اگر استخلاف سے مراد حکومت و ثروت و جاہ و دولت

فرانسیسی وغیرہ کی اور ہر وہ چیز ہے جس کو ”جنت عدن“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو پھر یہ ممکنہ کیونکر حل ہو سکتا ہے کہ اختلاف اور عمل صلح میں باہم کیا نسبت ہے۔ اگر اختلاف بغیر عمل نیک کے بھی ممکن ہے تو وعدہ الہی بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو پھر وہی صورتیں ہیں یا تو اختلاف کا مضمون دنیاوی نکتہ و ذلت قرار دیا جائے یا انگریزی قوم کو ممکن فی الارض کے لئے صلح تسلیم کیا جائے؟ تاہم اجراء سے لیکر اس وقت تک سچ کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں اگر ان کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ یورپ کے فلاں ملک میں اتنے جہاد ہوئے فلاں مقام پر سال میں اتنی ملاقاتیں ہوئیں، فلاں لارڈ کی لڑکی عریاں رقص کرتی ہوئی پانی لگی دہاں شراب کا اتنا صرف ہے، قمار بازی میں اتنا روپیہ ضائع ہوتا ہے، وہ تہمید یہ ظلم توڑ رہے ہیں، لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی یہ بھی جانتے کہ فلاں عالم نے یہ ایجاد کی، فلاں ڈاکٹر نے یہ اختراع پیش کی، دہان ظلم و فساد کی کیا خدمت ہو رہی ہے، فلاح قومی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ ہمارے مظلوم ہونے کے کیا اسباب ہیں ہم میں کیا نقصان ہیں اور ہم ان کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

کیا کلام عہد میں ”استخلاف فی الارض“ کے لئے جس عمل صلاح کی شرط قرار دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ دوسروں کی عیب چینی کی جائے اور اپنے معائب کو بھی محاسن کی صورتیں پیش کیا جائے، شکے عبدالماجد صاحب بجائے اس سطحی مقالہ کے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرماتے اور غور کرتے کہ کیا ہندوستانی دماغ کی برتری ان حالات کے ماتحت سراہے جانے کے قابل ہے اور کیا سورہ احتاف میں خدا نے یہ کلیہ قائم کر کے کہ۔

فصل یصلح الا القوم الفاسقون ط

ہم کو یہ نہیں بتا دیا کہ ایک قوم کی دماغی ذہنی بلندی کا ثبوت اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس کی ترقی ہے اور جو قوم ہلاک ہو رہی ہے وہ یقیناً فاسق ہے، ناقابل ہے اور اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو برتر کہہ سکے جناب عبدالماجد کی صحافت اور انشاء کا انحصار صرف اس پر ہے کہ اہل یورپ کے معایب کو نمایاں کیا جائے اور اس غلو کا نتیجہ ہو کہ ان کا لٹریچر ہی حاسدانہ نکتہ چینی ہو کر رہ گیا حالانکہ حقیقت واضح ہے کہ دنیائے عمل میں اس طرز تحریر کو صرفت کو سنا سکتے ہیں اور اسی لئے اس کو صرف اس جنس کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے جس کے لبوں کی جنبش اس زہر کو بھی شیریں بنا کے پیش کرتی ہے عبدالماجد صاحب یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ باوجود سعی بسیار کے بھی کبھی اس نوع کی جاذبیت اپنی جنبش لب میں پیدا کر سکیں گے۔

جولائی کا مہینہ تقریباً نصف سے زائد علالت میں بسر ہو گیا، اس لئے میں کاپیوں کی صحت کی نگرانی بالکل نہیں کر سکا۔ ہر چند حالیہ صحت میں جب میں اس کا اہتمام کرتا تھا اسی وقت کیا کامیابی ہوتی تھی لیکن خیر کم از کم میرے دل کو تو اطمینان دیتا تھا کہ اپنے امکان میں جو کچھ تھا اس سے دریغ نہ کیا گیا۔ اس مرتبہ مجھے یہ کاذب طمانینت قلب بھی حاصل نہیں ہے

نیاز فیموری

قائم چاند پوری

شعر کے حالات کی ترتیب میں بڑی مدد تذکروں ہی سے مل سکتی ہے لیکن ان تذکروں میں بڑا نقص یہ ہے کہ صحت اور شاعر کے ذاتی حالات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے جس کی وجہ سے ہم صحت کیساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے کردار پر اچھی طرح بحث نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کس سہ میں پیدا ہوا کن کن سے کسب سخن کیا، کہاں کہاں کی خاک چھانی اور بالآخر کب عالم جاودانی کی راہ لی، اس وجہ سے ہم کو شاعر کے حالات ترتیب دینے میں زیادہ تر اشعار کی زبان سے مدد لینا پڑتا ہے، عام طور پر تذکروں میں پہلے تو صحیح نام ہی درج نہیں ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو مختلف تذکروں میں اس قدر بدست اختلاف ہوتا ہے کہ کسی خاص نام کو صحیح قرار دینا مشکل ہو جاتا ہے یہی حال تاریخ وقات کا بھی ہے، چنانچہ قائم کے نام کے متعلق بھی زبردست اختلاف ہے، گارسان دی تاسی نے تذکروں کے انہیں نقایص و معایب پر اس طرح روشنی ڈالی ہے: ”اہل ایران اور ان کے نتیجے میں ہندی مسلمان سوانح (اور خاص کر ہمعصر لوگوں کے سوانح) لکھنے کے بعد شوقین تھے، اور جیسا کہ ہمارے ہاں کا حال ہے ان میں صرف تاریخ وقات منقود نظر آتی ہے لیکن یہ تذکرے بجائے تجارتی مفاد کے ادب کا اہم جز ہیں“ ان تذکروں میں مولفین، مشور اور ملاقاتی شاعروں کی مدح سرائی دل کھول کر کرتے ہیں اور حیلہ سے انہیں اپنی مضامین و بلاغت اور افتخار پر دازی دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے اور عمدہ عمدہ اشعار انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں، درحقیقت یہ تذکرے ایک قسم کے منتخبات ہیں جنہیں شعرا کی زندگی کے حالات پر شکوہ اور شاندار مدح سرائی تک محدود ہوتے ہیں، بعض اوقات کئی کئی صفحات تک چلے جاتے ہیں اور اکثر ان میں سوائے شاعر کے نام کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا، بعض اوقات مدح کے بعد دس، بیس، تیس صفحات تک انتخابات ہوتے ہیں اور کبھی صرف دو تین شعری نمونہ کے دیدے جاتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے، تذکرہ نویس ان تذکروں میں اپنی روشناسی اور شہرت کا پہلو نکال لیتے ہیں، بعض مصنفین یا شعرا کا ذکر کرتے کرتے اپنا نام بھی کہیں نہ کہیں آتے ہیں، یورپ میں سوانح عمری کے مولف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مصنفین یا شعرا کے ذاتی حالات تفصیل سے بیان کئے جائیں اس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں ذاتی حالات کی تفصیل مطلق نہیں ہوتی صحت کا بھی بہت کم خیال کیا جاتا ہے ان شعرا کو قدیم کہا جاتا ہے جو کسی دوسرے سے پہلے گورے ہوئے مولف اپنے معصروں کو شعر اے جدید کہتا ہے، تاریخ اور سہ اور خاص کر تاریخ پیدائش ان تذکروں میں شان و نادر ہی ہوتی ہے اسلئے اس کے اشعار کی زبان و لہجہ یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ کس زمانہ یا کس صدی کا شخص ہے لیکن اس میں بھی دشواری واقع ہوتی ہے کیونکہ کتابوں کی نقل میں بہت سے الفاظ کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں“ (رسالہ اردو باہرہ جنوری ۱۹۲۵ء)

اس شاعر کے بیان میں سب سے پہلا مختلف فیہ سلسلہ اس کے نام کا ہے، مختلف تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس کا نام شیخ محمد قیام الدین، شیخ محمد قائم اور قیام الدین علی تھا، تذکرہ گلشن بخارا گلستان پنجواں، بزم سخن اور سخن شعر اور تذکرہ کریم الدین میں اس شاعر کا نام شیخ محمد قیام الدین مذکور ہے اور تذکرہ میر حسن، شمع انجمن، گلشن ہند، نکات الشعراء طبقات الشعراء میں شیخ محمد قائم تحریر ہے۔ ان سب سے ہنگر مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے تذکرہ گل رعنائیں قیام الدین علی لکھا ہے ہماری رائے میں اس شاعر کا نام دراصل شیخ محمد قیام الدین اور تخلص قائم تھا، رزمہ کی بول جال میں چونکہ کثرت کیساتھ قائم ہی کہا جاتا تھا۔ اس لئے بعض تذکرہ نویسوں نے تخلص کے ساتھ شیخ محمد کا حضافہ کر کے اس کا نام ہی شیخ محمد قائم لکھ دیا، تخلص کی شہرت نے اصل نام کو گمناہی میں ڈال دیا، چنانچہ اصلی نام کی جگہ بھی تخلص ہی نے سلی،

قائم کا وطن چاند پور ضلع منہل ضلع مراد آباد تھا، والد کا نام کسی فارسی یا اردو کے تذکروں میں نہیں ملا البتہ کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست مرتبہ ایستے میں ان کے والد کا نام علی درج ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ڈاکٹر سپرنگر نے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں ”محزن نکات“ کے تحت یہ لکھا ہے کہ قائم کی خود نوشت مختصر سی سوانح عمری بھی اس کتاب کے ساتھ منسلک ہے، اس میں قائم نے اپنے والد کا نام لکھا ہو، بہر حال یہ امر متفقہ ہے کہ قائم نے ابتدائی زندگی چاند پور میں بسر کی اور ادیل عمر میں تلاش و نگار میں وطن سے روانہ ہوا اور مردم خیز خطہ مہلی جہاں کی علم پروری کی بہت شہرت سنی تھی پہونچا، شاہ عالم بادشاہ کے ہاں سلسلہ ملازمت میں داخل ہو گیا۔ اور داروغہ اسلحہ خانہ بادشاہی مقرر ہوا، ملازمت کے تعلق سے عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا، تحصیل علم کا حال معلوم نہیں مگر اس قدر استعداد و حضور تھی کہ ان کی انشا پر رازی میں غفل واقع نہ ہوا اور یہ جوہر اس زمانہ کے شریف خاندانوں کے لئے عام تھا، دلی اس زمانہ میں آج کی سی دلی نہ تھی خواجہ میر درد، سودا، میر وحکم ہدایت الدہ وغیرہ جیسے ارباب کمال کا جگھٹا تھا، اور شاعری کا ہنگامہ گرم، قائم نے طبع موزوں اور ذہن رسا پایا تھا، شاعری کی طرف فطری میلان تھا، صغر سنی ہی میں تصنیف و نظم کا شوق پیدا ہوا، شعر و سخن کے ہنگاموں نے طبیعت میں ایک جوش پیدا کر دیا خواجہ میر درد کی خدمت میں آنے جانے لگے، چند کدز ان سے فیضیاب ہو کر مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد ہوئے اور ایسی مشق ہم پہونچائی کہ ان کے مرزا داد کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

آپ کی خوش بیانی و قادر الکلامی نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ آپ ایک مسلم الثبوت استاد مانے گئے، تمام تذکرہ نویس آپ کے مداح ہیں، آپ کے پاکیزہ و خیرین کلام نے استادان فن سے خراج تحسین حاصل کیا، میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

”نقل حدیث نصاحت و خجہ بتان بلاغت، شمع بزم خندانہ، جوارغ نکتہ رانی، ترقی فکرش دایم شیخ عوفام

شاعریت خوش گو شاہیں طبعش تیز بال و شہباز فکرش یہ اوج کمال، خوبی اشعار چوں حسن

محبوبان دلپذیر رابطہ الفاظش مسلسل مانند زلف خوباں بے نظیر“

مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

”بجلی کلام و چنگی معراج غنڈل در قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق روح زمانہ دوش بدوش
استاد راہ میرفت بلکہ در بعضے مقام رحمانی جہت“
مولف طبقات الشعراء قلمطراز ہے۔

”بسیار آدم بامزہ و اہل درد، متواضع، خلیق، ہند ب صورت، پاکیزہ سیرت، نہایت پرگو و
خوش مقال در فنون سخنوری بالکمال، از خوشحالان زمان و بلند نظر ان جہاں فکر صائب دار و درنازک
خیالی و معنی یابی و اد سخنوری میدہد“
مرزا علی لطف ”گلشن ہند“ میں لکھتے ہیں۔

”نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے، ساتھ طبع بلند اور ذہن رساکے موصوف، مضمون جراحی اور
معنی بندی میں معروف، کچھ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے
راقم آئٹم کو طور گو یابی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے“
شیفۃ تذکرہ گلشن ہند میں تھریئر فرماتے ہیں۔

”شاعریت خوش گفتار بلند پایہ موزونیت عالی مقدار گر انما یہ در پنجہ بعض ناشناسان سخن
یہ مکانست سودا می شمارند حرف در دیوانگی شان از جنون است بہر حال قائم در سخن دستگاہ
دہندہ دارد گو بہ پایہ سودا سببش، لاسیمہ در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوقی فکر و کرد
از طبعش تراویدہ“

شاعر کی حیثیت سے قائم اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں خیال کئے جاتے تھے، قائم نے جیسا کہ مصحفی کی عبارت سے معلوم
ہوتا ہے اگرچہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بعض تذکرہ نویسوں کی رائے میں ان غزل اور مثنوی سے زیادہ
مناستہ تھی، قطعات و رباعیات میں وہ یگانہ خیال کئے جاتے ہیں لیکن جس طرح ہم نے اوپر بیان کیا ہے شیفۃ کی رائے
میں ان کی بہترین نظمیں قطعات و رباعیات ہیں، لیکن کمال (جس نے ایک تذکرہ بنام ”مجموعہ انتخاب“ قائم کے دس سال
بعد لکھا ہے) لکھتا ہے کہ سودا کے سوا جو مہدی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہے وہ سب بڑھا ہوا ہے، وہ قائم کا بجد و ملح
چنانچہ اس قول کی تائید میں وہ اپنے تذکرہ میں قائم کے دیوان سے اس کا بہت سا کلام نقل کرتا ہے جس میں بیانیہ، ہجویہ اور
دوسری قسم کی نظمیں ہیں جو قوی تضامیں کے نقطہ نظر سے بہت دلچسپ ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ قائم ابن شعرا میں سے ایک
جو مصلح اور رواج دینے والے اس زبان کے تھے اور جنہوں نے الفاظ کریمہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کیا
قائم کی تعریف و توصیف اور ستائش میں تذکرہ نویسوں نے بہت کچھ مدح سرائی کی ہے جناب فاضل کریم الدین اپنے
تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

”عجب طرح کا شاعر خوش گنتا رہے اس کی برابری اچھے اچھے شاعر تیس کر سکتے کیونکہ وہ شخص اس رتبہ کا ہے کہ دیوان دیکھنے سے اس کی قدر کھلتی ہے بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں حق یہ ہے کہ بچے ہیں اور بعض کم مایہ دبے استعداد جو اس کو برابر سودا گننے میں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ آگ رشک میں جلتے ہیں کیونکہ مثل اس کے شعر نہیں کہہ سکتے ہیں خصوصاً قطعات و رباعیات اس کی ایسی ہیں کہ باریک بین آدمیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں جب اس کو مطالعہ کرتے ہیں“

نکات الشعرا میں میر صاحب ارقام فرماتے ہیں، -

”جوانے است، خیرہ و طرہ چون پرست، نوکر بیشہ، با فقیر نیز آشنا است“

میر صاحب کا یہ لکھنا کہ حُسن پرست تھا کچھ تعجب خیز نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت یہ روش عام تھی اور اس زمانہ کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی تھی، شاعر کے لئے حُسن پرست ہونا ضروری تھا کہ انظار جذبات احساسات میں دلکیت کا رنگ آسکے جنانچہ دلی کے متعلق بھی امر پرستی ثابت ہے، خود میر صاحب بھی نگاہ ناز کے گھائل تھے۔ اپنے حُسن و عشق کی داستان کو پوشیدہ رکھنے کے لئے مشق سخن شروع کی بالآخر اسی فن میں ان کو ناموری حاصل ہوئی، مردوں پر بھی جان دیا کرتے تھے، مولانا عبد السلام ندوی نے شعر المند میں اس کے متعلق وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

قائم نہایت متواضع اور خلیق و صغیر اس تھے، طبیعت میں سوز و گداز تھا، اپنے خصائل پاکیزہ کی وجہ سے لوگوں کو گرویدہ کر لیا، سخن گوئی کی وجہ سے وہ قدر و منزلت اور شہرت حاصل کر لی کہ استادان وقت کے ہمسر خیال کے بجانے لگے، معاش کی بیفکری نے کسب سخن کا اچھا موقع دیا۔ دہلی میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں شرکت کرتے تھے، سودا۔ درد اور حیر سے اچھے تعلقات تھے ان کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے،

دہلی کی تباہی کے بعد یہ بھی وطن چلے گئے جنانچہ خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

”سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد جب کہ وہ رشتہ جہیں تمام ملازمین منسلک تھے ٹوٹ گیا اور وہ

مثل گمراہ بدادر دلت و خواری کی زمین پر گر پڑے اور ہر شخص نے اس طرف کی راہ لی جہاں قدر دانی

کی امید ہو سکتی تھی تو میں مجبور ہو گیا کہ اپنی مرضی کے خلاف ہجر و کراہ نقل مقام کروں“

کچھ دنوں نواب محمد امیر کے ساتھ ٹانڈہ میں زندگی بسر کی، جب ان کا بھی کام بگڑا تو رامپور چلے گئے، وہاں احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اسی پر قناعت کی جب تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آئے اور صدارت اعلیٰ کی راسخہ اپنے وطن کے عامل کے نام لے گئے۔ یو۔ پیے اور ملکیتیں جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا، اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے۔

طبقہ متوسطین کے دور اول کے شعرا میں سے ایک قائم ہیں، سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی اور بہت سے الفاظ رواجاً نہیں دئیے اور اس کے ہم عصر کے مختلف کام میں لاتے تھے کمال ڈالے، تاہم کچھ ایسے الفاظ رہ گئے جو ان کے زمانہ میں فصیح خیال کئے جاتے تھے مگر آج ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، اس حمد کے شعرا نے دلپذیر اور دلکش و پسندیدہ محاورات اور ترکیبیں جو فارسی میں دیکھیں انھیں کہیں ترجمہ کر کے اور کہیں بھننے لے لیا اور انھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا اور دور جدید میں فارسی زبان کی ترکیبیں اردو کے گونئی کا زیور بھی جاتی ہیں (مذکرہ گل رعنا) فارسی زبان میں کسی چیز کی کثرت کا بیان الفاظ کی تکرار سے کرتے ہیں، چنانچہ قائم نے کہا ہے

کبھی موج پہ اپنی آگئیں چشم دریا دریا ہوا گئیں چشم

آنکھوں سے جاے اشک گریں گل چمن چمن منظور گریہ گریں ترانگ بو کردوں
شاخین شعر کی فارسی کی دلا دیز ترکیبیں جو شعراے دلی کے کلام کا زیور ہیں اسی دور کی یادگار ہیں، قائم نے یوں باندھ لیا ہے۔
لے ابر اپنے گریہ میں جھوٹ جوش تھا جو قطرہ اشک کا تھا سوطوفاں بدو تھا
کسی بھاؤ گرم غمی گلشن پہ اے نسیم شبنم سے برگ گل لب تھلا جوش تھا
ہر دم شراب برق سے کیا ارض کیا سما ہر ایک تیر منہ پہ تبسم فرودش تھا

ابن حن نیکنگ کے صدرے کے تھکے پنج ہلکی سی ایک خوشی کی تہ ہوجا کے ساتھ

دیواں سراے سینہ سے آتی ہر نوکس گویا کھو یہ خانہ تراجلوہ گاہ ہفتا

قبول عذر تو دے ہو جہاں ٹال بھی ہو بجان پاک صفایاں جو کچھ خیال بھی ہو
تکیوں سے گور کر اس دور کے شعراے خالص فارسی طرز ادب میں بھی بعض اشعار کہے ہیں، قائم نے کہا ہے
ہو خواجہ آج نام کے پیچھے یہ سب تراب غافل کہ کل نشان بھی پایا نہ جاے گا
اے وہ کہ تو کوئے ہو ہزار کا علاج جز مرگ کچھ بھی ہو توے بیمار کا علاج
ہے اشک بھونام ہر یک کو تجھ سے کسری زبانی
کوڑہ گر کہ خاک پہ میرے ہو گرم شور تھا اک چراغ گور سوہ بھی خوش تھا

فارسی محاوروں کے ترجمے اس عہد کے شعرا کے کلام میں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، چنانچہ قائم اس طرح طبع آزمائی کرتے ہیں۔

دل کو کیا بانٹتے گلزار جہاں سے بیل
حسن اس باغ کا اک روز خزانہ دیکھا
کچھ لکھوں سو ندل اپنے سوا سے اوقاصد
جہاں کا غز ہوں اگر بال دہر پروانہ
ناچاستی میں ناخوش دل اجا کریں
یکد و جام اور بھی سانی کہیں ناخج اب کریں
ہر طرف غم و غم بھرتے ہیں اعظا ہوئی صبح
سانی اور غم بھی صراحتیں تاب کریں

(شعر الہند جلد دوم)

اس دور کے شعرا نے یہ بھی بڑا کام کیا ہے کہ جو عا شقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھے چلے آتے ہیں ان کو یہ تبدیل الفاظ و تغیر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھتے اور مزہ لیجئے، انکی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلانیز اور دلکش ہیں، علاوہ اس کے قدیم جذبات و خیالات میں اپنے مبلغ فکر کے موافق جو نزاکتیں اور لطافتیں انھوں نے پیدا کی ہیں وہ بُرائے روزمرہ اور محاوروں کے بدل جانے پر بھی اب تک ایسی ہیں کہ لوگ ان کو پڑھتے اور سر دہنتے ہیں ملاحظہ ہو۔

قائم ضرور کیا ہے اب اس تجور سے صلح
مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مہر حد، عہد فوج دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا (متذکرہ گل رعنا)

ان بزرگوں نے تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے مگر اعتدال کیساتھ، متاخرین کی طرح صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کر کے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی، تشبیہ و استعارہ کو محاوروں کی رنگینی سے اس طرح کھپایا ہے کہ شعر سنکر اس کی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا اور یہی بات اُن کی شاعری کی جان ہے۔

قائم کہتا ہے۔ مجھسا جہاں میں کوئی بھی شفتہ نہیں ہے یوں تو دولت یا پڑا اس قدر نہیں

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرکب العجبی ہے اک ڈھیر ہے یاں را کھ کا اور آگنی ہے (متذکرہ گل رعنا)

تشبیہ و استعارہ کا موزوں و مناسب استعمال شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تشبیہ محسوس چیزوں سے دیکھئے تاکہ اُن کے عوارض و اوصاف زیادہ نمایاں ہو کر نگاہ کے سامنے آئیں اور اس طرح ہر ایک چیز انھوں کے سامنے پھر جائے دیکھئے قائم نے سادگی کے ساتھ تشبیہ کے استعمال میں جدت و ندرت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو،

دردم داغ ہر اک کا ہے مجھے پاس مزاج
جوں کوئی شخص نے شہر کو آباد کیا ہے

مرکب تشبیہیں بھی زیادہ نادر اور بلیغ خیال کجاتی ہیں کہونکہ دخیزوں کے اوصاف کی مجموعی ہیئت سے ایک حالت کا نقشہ زیادہ

وضاحت اور رنگینی کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتا ہے،

موج نفس سے ناداغِ نقل نہ ہو کہ تری یہ ہستی دورِ مذہ نقل کنار جو ہے
 وہ گو یا زخم ہے چہرہ کے اوپر جو بے لطف سخن کوئی دہن ہے (شعر الہند جلد دوم)
 اس دور کے شعرا کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ تناسبِ لفظی اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذومنین جو قدما کی شاعری کا مایہ ناز ہے ان کے دور کرنے میں انھوں نے بڑی کوشش کی ایہام گوئی کو ترک کر کے شعر کو بلند مضامین اور لطیف جذبات کے قابل بنانا اس دور کے شعرا کا بہترین کارنامہ ہے جو بھولنے کے قابل نہیں، مذکورہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے علویاں تاثیراتِ قلبی، سادگی، نزاکت اور لطافت کی داد دیجئے،

بریز شوق میرا از بسکہ موبو ہے بھمانہ میں یہ اب تک میں ہوں یا کہ تو؟

غجنے کس کے بوسہ کو یہ لب کئے ہیں جع گل کیوں نہ لبے باغ میں صورت کنار کی

کچھ طرہ مرض ہے زندگی بھی اس سے جو کوئی جیا سوسر کر

بار عمر ہے قاسم کوئی دن اسے جو گل پیارے کا ٹہنسا

اس دور سے پہلے شعراے ریختہ غزل، ثنوی، رباعی، قطع وغیرہ سب کچھ کہتے آئے ہیں اور قصیدے بھی بولے نام لکھے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو قصیدہ نہیں کہہ سکتے، دو چار شعر میں کسی کی مدح کر دینے یا تشبیب، گریز، مدح اور دعا جو قصیدہ کا اہم قرار پائے ہیں ان سے تعرض نہ کرنے سے کوئی کلام قصیدہ نہیں بن سکتا، سب سے پہلے اسی دور کے شعرا نے قصاید دہم دھام سے لکھے اور ان کو اعلیٰ درجہٴ فصاحت و بلاغت پر پہونچایا، اس سلسلہ بیان میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اصنافِ سخن میں ہر چیز کو جس سلیقہ سے اس دور کے بزرگوں نے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ تھا، قصیدوں میں پر شوکت الفاظ، بلند مضامین اور جست ترکیبیں استعمال کیں، غزلوں میں بے تکلف، زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات و صل کارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انھوں نے کی اس کی نظیر قدام کے کلام میں نہیں مل سکتی، اور جوش و خروش کلام کی گرمی، اور دلاویز و دلچسپ و دلپند بحروں میں جن میں سے اب تک بہت سی ادویں نہیں آتی تھیں اور پھر سنگلاخ زمینوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیوں میں شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو سودا و قاسم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو کہ اس کا دھندلا سا عکس بھی قدام کے کلام پر نہیں پڑتا، (دگل رعنا) جس طرح ہم نے پہلے لکھا ہے اس عمدہ کے اساتذہ قصداً سنگلاخ زمینوں میں زور طبع دکھایا کرتے تھے اور اس کو باعثِ سرمایہٴ افتخار سمجھتے تھے ہم کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی ردیفوں کا نباہنا انہیں بزرگوں کے

دل و دماغ کا کام تھا، ایسی ردیفوں کو بھی اس خوبی سے نبایا کہ سررشتہ مضمون کو ہلکا سے جانے نہیں دیا، چنانچہ قائم نے اس طرح طبع آزمائی کی ہے۔

جی بھی لے، دل لیا ہر تو چل یک نشد و شد تا پھر وہ ناز ہوے مثل یک نشد و شد
وعدہ جو کل کا آج یہ تھا سو ہوا خلاف پھر آج آپ کہتے ہیں کل یک نشد و شد
کل صبر و طاقت اسکی غلی میں ہو گئے کم خالی ہر آج دل ہر غل یک نشد و شد

مسابقت یا ایک کا دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی جدوجہد کرنا عموماً عمدہ نتائج پیدا کر لیتے، جولانی طبع دکھانے کا موقع ملتا ہے محنت و کاوش، دماغ سوزی، اشتدادِ فکر و غور و تدقیق، جستجو و تلاش اور مہنی آزمائی کی کوشش کرنا پڑتی ہے، چنانچہ شعرا کی ہم عصرانہ چٹنگ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ زبانِ ثقیل الفاظ اور فارسی الفاظ کے بجا استعمال سے آزاد ہو کر نہایت صاف اور شستہ اور مقبول عام ہو گئی، زبان کی اسی شستگی و پاکیزگی نے اس دور میں فنوی کو اعلیٰ پایاد پر پہنچا دیا، چنانچہ مصحفی، میر حسن کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

”بعد ازاں کہ دور مرزا رفیع سودا شد و زبان ریختہ چنانچہ بود زیادہ دریں دیار رواج یافت بحکم قوت
ممیزہ قدم بجا دہ استیقام رساندہ و سلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی و میاں
محمد قاسم گزشتہ کلام خود را بر تہ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ دیوان ضخیم و فنوی ہاے متعددہ
در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در فنوی آخر کہ سحرالبیان نام داد یہ بیضاً نمودہ الحق کہ کاو کا راست قطع نظر
از بلاغت شاعری زبانیں بسیار پر مرزہ و شیریں و عالم پسند افتادہ“

اسلئے اردو شاعری نے جواب تک فارسی شاعری کے مقابل میں کم درجہ اور اہل کمال کی شان کے خلاف بھی جاتی تھی ایک مختصر تجزیہ اختیار کرنی، اور اس دور کے شعرا کو خود فارسی شاعری کا حریف مقابل سمجھنے لگے، چنانچہ قائم کہتے ہیں۔

قائم جو کہے ہیں فارسی یار اس سے تو ریختہ ہے بہتر

فارسی کہنے پر افتاد ہو گئی قائم رفتہ رفتہ جو ترے شعر مفلحان گئے

محمد شاہی دور تک اگرچہ دلی میں اردو شاعری کا عام رواج ہو چکا تھا تاہم شاعری کا جو انداز تھا وہ بہت کچھ نیم و اصلاح کا محتاج تھا، آبرو، حاتم اس طبقہ میں شامل ہیں جنہوں نے صنعت ایہام کو مستقل فن بنالیا تھا مگر اس صنعت کی باندی نے ان کے کلام کو سبک بنادیا تھا، اس لئے اس دور کے بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا تو مرزا مظہر جانجاناں خواجہ میر درد، فقیر دہلوی، مرزا سودا، میر تقی میر، قائم اور میر حسن جیسے مصلحین فن پیدا ہوئے تو سب سے پہلے مرزا مظہر جانجاناں نے اس طرف توجہ کی، اور ایک مستقل دور جدید و اصلاح کی بنیاد ڈالی چنانچہ قدرت اللہ شوق، طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں،

”ی گویند کہ ادل کے کہ طرز ایہام گئی ترک نمودہ ریختہ راہد زبان اردو دے سلی شاہجاں آباد کہ احوال

بہند خاطر عوام دخواص گردیدہ و مروج ساختہ زبده العارفين، قدوة الواصلين، واقف رموز جناب
اکبر، کا نصف کنوز طریقہ پیغمبر را جلہ نجا ناں تخلص بہ منظر مریدیت فرشتہ صفت“

چنانچہ اسانہ نے غزل کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور اردو شاعری کے عیوب مٹا دیئے ان کو اپنی اس خدمت پر بڑا ناز تھا۔
قائم نے اس طرح قلی کی ہے۔

قائم میں رکتہ کھد یا خلعت قبول ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا احوال تھا

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ اک بات پھر سی بزبان کنی بقی

قائم نے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں جو دعویٰ کیا ہے وہ صرف شاعرانہ نقل ہے اُسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، اردو زبان کا اصلی وطن دکن ہے جہاں تک تحقیقات بتاتی ہیں اردو زبان میں سب سے پہلے شمالی ہند کے شاعروں میں حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور اس طرز کو اپنی نظموں کے لئے اختیار کیا، اس سے قبل تک وہاں فارسی مستعمل تھی، اس کے برخلاف دکن میں ہم سوہوہیں صدی عیسوی و سترہویں عیسوی کی ابتدا میں بہت سے نامور شعرا کے نام پاتے ہیں، مثلاً شاہاں گوگندہ، محمد قلی قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ ابوالحسن تانا شاہ، الوری، ابن نشاطی، افضل، غواصی، رستی، نصرتی اور ولی وغیرہ شمالی ہند کے شعرا نے کہیں اٹھارویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی، چنانچہ گارسان دی تاسی لکنتلہے ”حاتم جو سترہویں صدی کے آخر میں ہوا، دہلی کا غالباً پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں لکنا شروع کیا، اور اس کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے عام زبان (اردو) میں لکھنے کا اسوقت فیصلہ کیا جب کہ دلی کا دیوان دہلی پہونچا اور پھر (شمال کے) دیگر شعرا نے اس کی تقلید کی“ مولوی سید امداد امام صاحب اثر کا شرف الحقائق جلد دوم میں لکھتے ہیں ”جب شاہان دکن کو اورنگ زیب نے زیر و زبر کر ڈالا تب اردو نے اپنے مولد سے جلا وطنی اختیار کر کے دلی کو اپنا مسکن بنایا، دلی کا دیوان پہلے پہلے اس دار الخلافہ میں ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۹ء میں رحلت فرمائی اردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم کی گزشتگی شروع کی، شاہ حاتم ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۹ء میں رحلت فرمائی اردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم کی گزشتگی یہ صحیح ہے کہ اس دور سے پہلے تک اردو زبان میں سنسکرت، بھاشا، اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے اور عربی و فارسی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی چنانچہ جبکہ پہلے شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے اردو زبان کو پاک و صاف اور شستہ بنا اچھا اور اس کے بعد شعرا مصباحین نے اس ابتداء کی اصلاح کی نیگل میں پڑا حصہ لیا، لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکے کہ جو زبان ان سے تقریباً سو دو سو سال پیشتر سے دکن میں مروج تھی ”پھر“ قرار دیجئے، عام قاعدہ ہے کہ ہر زبان کی ابتداء کی حالت کمپرسی کے عالم میں ہی زبانوں کی سرگزشت بر غویہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ جب تک کہ ارتقائی منازل طے کئے کہ مصباحین کی رہیں منت نہ بنیں انھوں نے موجودہ اصلاح یافتہ زبان کی شکل نہ اختیار کی، انگریزی زبان چھوٹا

غور کیجئے کیا چوسر، کلفت اور بن جانسن وغیرہ کے وقت کی زبان اب رائج ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ میر، سودا و قائم نے مصلح ہونے کا دعویٰ کیا اور اصلاح یافتہ زبان کا اپنے آپ کو موجود ثابت کیا ہے کیا ان کی اصلاح شدہ زبان اب زمانہ حال میں رائج ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے، بہت سے الفاظ اور محاورات جو اس وقت معنی خیز اور مناسب و موزوں سمجھے جاتے تھے اب مسترد ہو چکے ہیں، ممکن ہے کہ ایک سو سال بعد زبان اور بھی ترقی کر جائے۔ فنون کی اصطلاحات کا جو قطعہ الرجال تھا وہ انظرین انش ہے، والہ ترجمہ حیدر آباد نے زبان کو سائنٹفک اور فنی اصطلاحات سے مالا مال کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جس طرح پہنے پہلے کہتا ہے ایک سو سال بعد زبان کا اور ہی کچھ رنگ ہو جائیگا کیا اس وقت حیدر آبادی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ میر و سودا و قائم کی اصلاح کردہ زبان بالکل ”بکر“ تھی اور دراصل زبان جدید کے موجود ہم ہیں؟

جس طرح پہنے اوپر لکھا ہے محمد شاہی دور کی مشہور خصوصیت ایہام گوئی تھی جس کی منظر وغیرہ نے سختی کیساتھ مخالفت کی اور اس دور کے تمام اساتذہ نے اس داغ سے اپنے کلام پاک کیا حتیٰ کہ شاہ حاتم نے بھی اس طرز کو ترک کیا، قائم اسی ایہام گوئی کے متعلق کہتے ہیں۔

ہو دم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بہت چین
یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سرشام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہونے شعر میں ایہام

وہ شعر جو پہلے اس رنگ میں کہتے تھے انھوں نے بھی اپنی روش بدل دی اور اسی جدید طرز میں لکھنے لگے، ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس دور میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ اصلاح زبان کا تھا کیونکہ قدامت کے پہلے دور تک سنسکرت، بھاشا اور قدیم کئی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے، اور فارسی و عربی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی، لیکن اس دور میں سب سے پہلے شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے اردو زبان کو دہلی کے محاورے کے مطابق بنانا چاہا مگر اس اصلاح کی تکمیل تیر مرزا اور درد و قائم نے کی، ان بزرگوں نے قدیم محاورات و الفاظ میں تغیرات پیدا کئے، ان اصلاحات کے بعد اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی، اور ہمارے شعرا نے بالکل ایرانی طرز میں کہنا شروع کیا، جن لوگوں کی طبیعت کو مضمون آفرینی سے نسبت تھی انھوں نے ناصر علی، جلال، آسیرو کلیم و بیدل کے رنگ میں کہنا شروع کیا لیکن خوش مذاق شعرا نے طالب آملی اور شغائی وغیرہ کی روش اختیار کی، چنانچہ میر حسن اپنے تذکرہ میں قائم کی نسبت لکھتے ہیں۔

”طرز شبظ طالب آملی ماند“

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہمارے شعرا نے فارسی کی طرز ہی کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ ان کے کلام کو پیش نظر رکھ کر شاعری شروع کی، چنانچہ بعض نے شعراے فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور مقطع میں ان کا پورا مصرع نقل کر دیا، بعض نے انہیں ردیف و قافیہ میں غزلیں لکھیں بعض نے اساتذہ فارسی کے اشعار کا ترجمہ کیا اور یہ بات اس وقت نہایت عمدہ سمجھی جاتی تھی کہ اردو شاعری کو فارسی کی تازہ بخالی

مضمون آفرینی اور لطیف جذبات سے مالا مال کر دیا جائے۔

نظری کا ایک شعر ہے

دیدہ ام دفتر بیان و فاحر حرف بہ حرف نام خواباں بہ ثبت بہت بہن نام تو نیست

قائم نے اس کا بالکل لفظی ترجمہ کیا ہے

فہرست میں خوابان و فادار کے پیارے دیکھا تو کہیں اس میں تیرا نام نہ پایا (شعر اشد جملداول)
جدید تعلیم یافتہ گروہ کا یہ اصلاحي مطالبہ ہے کہ اردو زبان کی غزلوں میں عموماً بسیط خیالات ادا نہیں کئے جاتے ہیں یعنی ہر شعر کا مضمون جدا ہوتا ہے اور اس میں صرف ایک ہی خیال ادا کیا جاتا ہے اس لئے غزل کو قطعہ بند ہونا چاہیے جس میں دل سے آخر تک مسلسل طور پر اسی کیفیت یا جذبہ کا اظہار کیا جاسکے، قائم نے اس مطالبہ کو بھی بہت کچھ پورا کیا ہے، چنانچہ قائم کے قطعات درباہیات کی تمام تذکرہ نویسوں نے داد دی ہے شیفہ تحریر فرماتے ہیں۔

”لا سیما درقطعات درباہیات معنایہ کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش ترا دیدہ“

قائم کے عاشقانہ قطعات ملاحظہ ہوں

کان تک یار کے قائم مرے اس عالم سو رفتہ رفتہ جو گزر جانے کا مذکور گیا
سن کے اتنا تو کما حیف کہ اس دنیا سے ناز برداری معشوق کا دستو گیا

یا لکھوں بکتے ہو بیفاۓ مجھے جاؤ اتنی کہتے ہو مجھے اتنی اسے سمجھاؤ
وہ نہیں تو کہتے غم ہو کسی عاشق کا یا کوئی جیو نصیبوں سستی یا مر جاؤ

میں کہاں خلق تمہاری جو کہہ سکتے ہیں تم بھی کچھ اس کا کہیں نہ کہو بیاں سنو ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا غیر گہریہ بات ہو دیگی دیسی جیسی کہ وہاں سنو ہو

خوب بچکے ہم اس کے کوچہ سے در نہ آئے تھے اک عذاب میں رات
ایک خالی سی کچھ لگے ہے بغل دل گر شاید اضطراب میں رات

رباعی کا نمونہ ملاحظہ ہو:—

دیکھ حال مرا اٹھاکے سو سو چیلے
ساتھی بھاگے ہر اک طرف کوجی نے
اکتسی تھی جو کشمیر میں نہ چوڑوں کی قدم
سوئے گئے بھی ہو چکے ہیں ٹانگے ڈھیلے

کیا ایشم ہیں دنیا کے یہ سب اہل نعیم
بقدر کر کریں ہم کو جو دیکر زرد سیم
سجد میں خدا کو بھی نہ کیجئے سجدہ
محراب جو ختم نہ ہو برائے تعظیم

کسی تمدن قوم اور تمدن زبان کا دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کے اثر سے محفوظ رہنا اصول تمدن کے خلاف ہے، اسلئے یہ بات عام طور پر شاہدہ میں آتی ہے کہ اردو شاعری نے ایک طرف فارسی زبان کے سرمایہ سے مدد لی ہے تو دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کی بھی خوشہ چینی کی ہے اور ملکی خصوصیات اور ملکی رسم و رواج نے بھی اپنا اثر ڈالا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ملکی اور مذہبی خصوصیات کا اثر ہر دور کے شاعر کے کلام میں نظر آتا ہے، چنانچہ قائم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، مل میر تقی کو تو لٹکا ہے دوسرے کی تباہی غلبے سال بھر اسکی جوئے لئے گا

بھری آتی تھی قائم ہے بے پئے آنسو سے
کسے تو جیتم کو میری کہیں یہ ہٹ کی گھر چل

یہ امر مسلم ہے کہ علم و ادب کو ہمیشہ شاہانہ سرپرستی و مربی گری کی ضرورت رہی، علوم و فنون نے اس وقت ترقی کی جب کہ علم و دست سلاطین نے اپنی علم دوستی کا ثبوت کا مادی عزت میں لیا یعنی علما و فضلا کو کسب معاش و ذکر و روزگار سے نجات دلائی جب تک کہ ”نقاع حیات“ کی حمد و جہد سے ان کو اطمینان رکھ سوتی حاصل نہ ہوئی، وہ اپنی پوری توجہ علم و فن کی طرف مبذول نہ کر سکے، خلفائے عباسیہ کے عہد میں فنون نے جو ترقی کی وہ محتاج بیان نہیں، مغلیہ شاہنشاہوں کے سایہ عاطفت میں جیسے بالکمال اہل علم کا مجمع رہا تاریخ کا ثبوت دیتی ہے، دکن کی اسلامی سلطنت بھی نے اپنی علم دوستی کے اظہار میں جامی و حافظ کو ایران سے مدعو کیا تھا، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی علمی فیاضیاں زبان زد عام ہیں، مختصر یہ کہ اہل علم اپنے کمالات کا اظہار بخوبی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کو اطمینان قلب حاصل نہ ہو، حیب تک دہلی کی دولت و ثروت، علما کے اخراجات کی مصل ہوسکی علاء و خضلا و ادبا مثل بردانہ جمع رہے اور جب تباہی آئی تو ایک ایک کر کے دہلی سے رخصت ہوئے اور تلاش روزگار میں سفر اختیار کیا، کوئی کسی کو اب کے دربار تک پہنچا اور کوئی کسی امیر کے محل تک، کسی کو وزیر اور دھ کے دربار تک رسائی حاصل ہوئی، الغرض تمام شعر اور اہل کمال نبات النض کی طرح منتشر ہو گئے، چنانچہ قائم بھی دلی سے رخصت ہو کر وطن آئے اور کچھ دنوں میں رہے۔

اردو شاعری کی ترقی کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ دکن کی اسلامی سلطنتیں کمال عروج کو پہنچ چکی تھیں، چنانچہ اردو شاعری نے انہیں سلطنتوں کے سایہ عاطفت میں نشوونما حاصل کیا، سلطان ابراہیم عادل شاہ، سلطان محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور قطب شاہ و محمد قلی قطب شاہ و عبدالنض قطب شاہ و ابوالحسن ثانی شاہ کی سرپرستی و ادب نوازی نے شعر کو کسب معاش کو بے نیاز

کر دیا، اسی باعث ان کی دماغی قوتوں نے میدان تغزل کو رنچا رنگ کی جہن آرائی سے بلاغ و بہار بنا دیا اس کے بعد محمد شاہ رگیلے کے عہد میں اُس کی سرپرستی کی گئی اور یہ سلسلہ بہادر شاہ کے عہد تک جاری رہا، دہلی کی تباہی کے بعد اکثر شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا، خان آرزو حلقہ نادرہ کے بعد ہی ۱۳۳۶ء میں لکھنؤ چلے آئے، اسی طرح دیگر شعرا بھی وارد لکھنؤ ہوتے گئے اور لکھنؤ کو شاعرانہ حیثیت سے ایک قسم کی مرکزیت حاصل ہو گئی، اس طے ہوئے قافلہ کی سرپرستی کا آغاز اگرچہ نجلع الدولہ ہی کے زمانہ سے شروع ہو گیا لیکن شعر کی قدردانی کا اصلی زمانہ آصف الدولہ کے عہد وزارت سے شروع ہوا اور غازی الدین حیدر کے زمانہ تک قائم رہا، ہزارے اودھ کے ساتھ لکھنؤ اور لکھنؤ کے علاوہ دوسرے مقامات میں امرا و رؤسا کے درباروں میں شعرا کی قدردانی ہوتی تھی، ان میں مرزا سلیمان شکوہ، نواب محبت خاں، نواب مہربان خاں زند اور نواب محمد یار خان کے درباروں سے اس دور کے اکثر ساندہ کا تعلق تھا، مصحفی مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، اجراءات پہلے نواب محبت خاں کے دربار میں تھے لیکن بعد کو وہ بھی مرزا سلیمان شکوہ کے سلسلہ ملازمت میں داخل ہو گئے، مرزا رفیع سودا اور میر سوز نواب مہربان خاں سے تعلق رکھتے تھے، نواب محمد یار خان امیر، نواب محمد خان مورث نوابان رامپور کے چوتھے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں کے بھائی تھے، آلہ کے قریب ٹانڈہ ایک بستی ہے وہاں کی بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا اول اول جب سخن گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو اپنی استاد کی لئے میرزا رفیع سودا اور میر سوز کو بلایا، ان دونوں بزرگوں سے نواب مہربان خاں رند کے ہاں ملازم ہونے سے منذر دی ظاہر کی تو بالآخر قرعہ خال قائم چاند پوری کے نام پڑا، اور ان کو بلا کر سور و پیہ ماہانہ کر دئے، اور ان سے مفتی سخن کی، جس کو قائم کو استاد کی کاشرف حاصل ہوا، چنانچہ وہ خود اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں،

جو قائم خوبی کو نین ہے قصد تو خدمت کر محمد یار خاں کی

قائم کے علاوہ اور بھی متعدد شعرا مثلاً شاد لاہوری، میر محمد نعیم، میان عشرت، حکیم اکبر علی سنہلی اور پروانہ علی شاہ مراد آبادی اور مصحفی وغیرہ بھی مقر بن بارگاہ تھے رات دن شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا اور نواب صاحب موصوف جو غزل طرح کہتے تھے، دی اس کو سرا انجام دیتے تھے چنانچہ قائم نے ایک شعر میں اس اجتماع کا ذکر کیا ہے یہ

مجھ کو قائم رکھے اللہ بہت سا اے میر مجتمع سایہ میں ہیں جبکہ خنداں یہ

نواب صاحب موصوف کے حکم سے اس زمانہ کے مشہور مصور عاقل خاں نے ایک موقع تیار کیا تھا حسین نواب اور ان سے حاشیہ نشین شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں جو اگر اس زمانہ میں موجود ہوتا تو ایک یا دو گار چیز خیال کیا جاتا، (شعر المند و تذکرہ گل رعنا) مرثیہ گردی میں تمام لوگ نبات النش کی طرح منتشر ہو گئے اور نواب کو فیض اللہ خاں آکر رامپور لیگئے ورجاس ہزار روپے سالانہ ان کی جیب خاص کے لئے مقرر کر دیا، مسئلہ میں وفات پائی، ولی کی تباہی کے بعد کچھ دن وطن میں پوچھا حال رہنے کے بعد قائم کو بیان اطمینان حاصل ہوا تھا لیکن جب یہاں بھی نجات سیاہ نے چین لینے نہ دیا تو فلک کج رفتار کو شکوہ کرتے ہوئے یہ بھی رامپور چلے گئے۔ احمد یار خان پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اسپرقتا کی لیکن جب

شاہان ہند

محمد بن قاسم کا حملہ مسلمانوں کے پہلے حملے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے مگر دکن میں سفسہ یہی میں مسلمان آگئے اور یہی ان کی آمد کی جاسکتی ہے، عبد الملک بن مردان کے سپہ سالار حجاج بن یوسف کے مظالم سے کون واقف نہیں وہ عبد الملک کی طرف سے عرب اور عجم کا صوبہ دار تھا، اس کے مظالم، بے باکیاں، سفاکیاں، خونریزیاں، پچلے طبقے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ اُس نے شرفاء عرب اور سادات بنی ہاشم کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا، سادات کو خانماں برباد اور شرفاء کو تباہ و تاراج کرنا، اس کا نصب العین تھا اور اس کی نظم و زیادتیاں عالمگیر تھیں، آل مصطفویٰ کو اس کے ہاتھوں ایسی مکالیف پہنچیں کہ بڑے ہی کا زمانہ آنکھوں میں پھر گیا،

سادات و شرفاء عرب نے مجبوراً ہجرت کرنی شروع کی اور چند قبائل عرب نے بنا در دکن کا رخ کیا، باد مخالف کے جھونکوں نے کئی دن تک ان خانماں بربادوں کو پریشاں و سرگرداں پھر کر ان کے ٹوٹے بھوٹے جہاز بندر مالابار بھلی بندر بھڑوچ، کننیاٹ، چیسول، داول کے کنارے لگا دیئے۔

دکن کے ہندوؤں کے نزدیک یہ قوم پٹو اور نئی تھی، پہلے تو ان کو جہادوں سے اترتے ہی نہیں دیا گیا مگر جب ان لوگوں نے خواہد آمد شروع کی تو ایک اقرار نامہ لیکر ٹھہرنے کی اجازت دی، اقرار نامہ کا مضمون یہ تھا کہ: ”مسلمان ہندو کے مراسم اختیار کریں اور انہیں کا لباس استعمال کریں۔ ارکان اسلام علی الاعلان ادا نہ کریں“ غریب مسلمانوں کو سر جھپکانا منظور تھا سنگ آدم و سخت آدم کا کمر بہ شریطن منظور کریں اور ہندو میں مل جل کر گزر بسر شروع کی، شعائر اسلامی بہت احتیاط سے ادا کئے جاتے تھے اذان و قرأت گھر کی چار دیواری کے باہر سنائی نہ دیتی تھی، عورت اور مرد ہندو کا لباس استعمال کرتے تھے اور شادی دھرمی میں ہندو ہی کے رسوم ادا کئے جاتے تھے رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں نے اہل ہندو کے پورے طریقے اختیار کر لئے البتہ اس قدر لحاظ ضرور رکھا کہ نہ تو اپنی لڑکیاں ہندوؤں کو دیں اور نہ ان کی لڑکیاں اپنے خاندان میں لیں،

سفسہ سے دکن میں بزرگان دین کی آمد شروع ہوئی جو ایک طرح سے مبلغین کہلا سکتے تھے ان میں بعض تاجر تھے بعض درویش اور بعض سپاہ مگر سب کا نصب العین ایک ہی تھا اور مختلف طریقوں سے تبلیغ کیا کرتے تھے، ان لوگوں کے حسن و اخلاق کا اثر ہندو پر بہت گہرا پڑا اور منافرت جو پہلے مسلمانوں سے تھی اب نہ رہی اور بہ خندہ پیشانی مسلمانوں سے پیش آنے لگے ان بزرگوں کی کرامات اور خرق عادات سے ہندو نے انہیں اوتار مان لیا اور حالت رنج و غم، مصیبت و پریشانی میں طالب دعا و دعا ہونے لگے، صرف عام ہندو ہی مسلمان مبلغین کے معتقد نہ تھے۔ بلکہ راجگان دکن کو بھی ارادت تھی، جب لوگوں نے حکومت کا میلان ہی اسلام کی طرف دیکھا تو ایک ایک کر کے مسلمان ہونے لگے، یہ صرف مسلمانوں کی تعلیمات

اور اخلاق تھے ورنہ ہنود اپنی حکومت میں کیوں اسلام کو جاری ہونے دیتے۔

راجگان دکن کی سیبہ تعصبی ہی لائن تحسین و تشکر ہے کہ انھوں نے جب ہندوؤں کا رجحان مذہب اسلام کی طرف دیکھا تو نہ تو ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے روکا اور نہ مبلغین اسلام سے باز پرس ہی کی۔

ادھر دکن میں اس طرح چپکے چپکے اسلام کی اشاعت ہو رہی تھی اور ادھر سلطان محمود غزنوی کی تیغ براں اپنے جوہر دکھا رہی تھی بہر حال جو بھی صدی کے آخر تک دکن میں شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہوگا جہاں آفتاب اسلام کی شعاعیں اپنی نورانی کرنوں سے روشنی نہ پیدا کر چکی ہوں اس وقت دکن میں حسب ذیل چار سلطنتیں قائم تھیں،

(۱) راجہ رام چندر نے دیوگیری میں یادہری حکومت قائم کی تھی جو ۱۲۷۱ء سے ۱۳۱۲ء تک رہی،

(۲) رانی ردراہمانے ونگل میں کانتیا حکومت قائم کی جو ۱۲۹۱ء سے ۱۳۲۸ء تک رہی

(۳) ہتھار اور نیلور کی ہائیسالہ حکومت،

(۴) پانڈیہ جو جنوبی حصہ پر قابض تھے،

جب غزنوی اور غوری خاندان کے بعد خاندان غلامان نے حکومت قائم کی اور پھر خلجی خاندان کو عروج ہوا تو علاء الدین خلجی نے جو جلال الدین خلجی کا بیٹہ تھا، تسخیر دکن کا ارادہ کیا اس سے پہلے کسی نے اس طرف کا رخ نہیں کیا تھا، یہ حملہ ۱۲۹۴ء میں اتفاقاً ہوا اور قسمت نے اس کو دکن کا بھلا فاتح بنا دیا، اس حملہ کی وجہ یہ تھی کہ علاء الدین گوردنر کرہ جب بیلسان میں مقیم تھا تو اس کو اطلاع ملی کہ دکن کے راجہ رام دیو کے پاس مورخی خزانہ محفوظ ہے اور وہ ایسا گرانا یہ خزانہ ہے کہ آج تک کسی بادشاہ کو میسر نہیں ہوا، یہ سنتے ہی وہ کرہ پہنچا اور بقول ضیاء برنی آٹھ ہزار سوار ہمراہ لیکر دیوگیری کی طرف کوچ کیا اور دکن میں پہنچ کر لاہور گسٹی میں ڈیرے ڈال دیے۔

اس علاقہ کے دہشت زدہ کسانوں نے یہ خبر راجہ رام دیو کو پہنچائی اور وہ نہایت ہی عجلت سے ایک غیر منظم کثیر لشکر مقابلہ کے لئے فراہم کیا۔ مگر علاء الدین کے جوش و خروش کے آگے اس لشکر کے قدم نہ جھے اور علاء الدین دیوگیری پہنچ گیا، علاء الدین کے متواتر جاننازہ حملوں نے راجہ کو اس قدر سراسیمہ کر دیا کہ اس نے فوراً صلح کی کو شش شروع کی اور چھ سو من طلا، سات من مروارید، دمن جواہر (اصل یا قوت وغیرہ) دیکر اور سالانہ خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

جب علاء الدین تخت نشین ہوا اور اندرونی الجھنوں سے نجات ملی تو ۱۳۰۷ء میں دیوگیری کو صوبہ بنانے کے خیال سے رام دیو کی سرکشی کا بہانہ کر کے ملک کا فوراً ہزار دیناری کو ایک لاکھ سوار سائباں و سراپہ و شاہی کے ساتھ روانہ کیا، ملک نائب نے نہایت ہی سہولت سے دیوگیری پر قبضہ کر لیا اور رام دیو اس کے بیٹوں کو گرفتار کر کے خزانہ شاہی کے ساتھ علاء الدین کے سامنے پیش کر دیا، علاء الدین نے نہایت دوراندیشی سے کام لیکر رام دیو کو ”راے“ دیا اس کے خطاب سے سرفراز کیا اور چتر سفید دیکر دوبارہ دیوگیری کی حکومت عطا کی،

۱۳۰۹ء میں ملک کا قذ نے درگل پر حملہ کیا اور اجہ درگل نے بہ وعدہ خراج صلح کر لی،
 ۱۳۱۲ء میں علاء الدین نے دکن پر آخری حملہ کیا اور راجہ دیوگیری کی بغاوت کی وجہ سے ملک کا قذ کو روانہ کر کے دیوگیری
 کو تباہ و تاراج کرنے کے علاوہ راجہ دشنکر کو بھی قتل کر دیا۔
 ۱۳۱۵ء میں علاء الدین نے انتقال کیا اور راجگان دکن نے سرکشی کی۔ مگر ۱۳۲۰ء میں محمد تغلق نے پھر دکن کے
 علاقہ تلنگانہ پر قبضہ کر لیا۔

۱۳۲۳ء میں دکن کے راجاؤں نے پھر سرکشی کی اور بغاوت کر کے شہر دیبا گھر آباد کیا، دکن کے مالک مفتوحہ تغریبا کے
 سب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ البتہ صرف دیوگیری پر سلطان محمد کا قبضہ رہا۔

ملک دکن کو کہوکر سلطان دوآبہ کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ بیدر میں نصرت خان اور گلبرگہ میں علی شاہ نے بغاوت کی جسکو
 فرو کرنے کے لئے قلعہ خاں حاکم دیوگیری روانہ کیا گیا، جس نے نصرت خاں کو بھجا بھجا کر راضی کر لیا اور علی شاہ کو گرفتار کر کے سلطان
 کی خدمت میں روانہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ غلطی ہی کی کہ قلعہ خاں کو دکن سے طلب کر کے نظام الدین عالم الملک کو دکن روانہ کیا
 سلطان محمد نے امیر ابن صدہ کی بغاوتوں سے تنگ ہو کر ان کے قتل کا ارادہ کر لیا اور سپہ سالار دکن کے نام فرمان بھیجا کہ ایک ہزار
 پانسو سواروں اور امیر ابن صدہ کو بھر دوچ روانہ کرے۔ عالم الملک نے نہایت ہی دقت سے امیر ابن صدہ کو دولت آباد۔
 (دیوگیری) بلوایا اور سلطان کی خدمت میں روانہ کیا، مگر جب یہ لوگ مانگ دوں پہنچے تو سلطان کی متلوں مزاحیہ اور غویں
 طبیعت سے خائف ہو کر آپس میں مشورے کرنے لگے اور دایہ کا ارادہ کر لیا، ملک لاجپن کی شامت جو آئی تو اس نے روکنا چاہا
 مگر یہ کب ماسنے واسلے تھے اس کو قتل کر دیا اور بال واسباب لوٹ کر دولت آباد کی طرف چلے، دولت آباد پہنچ کر قلعہ
 سختی کے ساتھ محاصرہ کر لیا اور چند ہی روزیں مع کر کے خزانہ بانٹ لیا۔ اور اسماعیل مع کو بادشاہ تسلیم کر کے ناصر الدین کا
 خطاب دیا۔ جبر شاہی سے عزت افزائی کی، حسن خان کو ظفر خان خطاب دیا اور ہر ایک اپنی اپنی جاگیر میں جا کر باغی ہو گیا۔

حسن خان نے رائے بہرن حاکم گلبرگہ کو قتل کر کے تسلط کیا اور اطراف کے امیر ابن صدہ کو بلا کر حکومت مستحکم کی، چند ہی مہینوں میں
 سارا دکن سلطان کے ہاتھ سے نکل گیا اور سلطان پریشان ہو کر دولت آباد پہنچا، اسماعیل مع نے مقابلہ کیا مگر شکست نصیب ہوئی
 اور وہ دہارگیر میں جا کر قلعہ مند ہو گیا دوسرے امرا بھی اپنی اپنی جگہ قلعہ بند ہو گئے۔ سلطان نے دہارگیر کا رخ کیا ہی تھا کہ حاکم
 گجرات کے بغاوت کی خبر ملی اور وہ قوم الدین خداوند زادہ اور دیگر امرا کو محاصرہ پر چھوڑ کر خود گجرات روانہ ہو گیا۔

ادھر حسن خان نے بیدر پر حملہ کر دیا اور تلنگانہ کے راجہ کی مدد سے علاء الملک کے لشکر کو تھس تھس کر کے اور اس کو قتل
 کر کے اسماعیل مع کی مدد کے لئے روانہ ہوا، حسن کا نام ستر محاصرہ کنندہ امرا نے فرار پر فرار کیا اور حسن نے اطمینان سے
 دولت آباد پر قبضہ کر لیا، اسماعیل مع نے حسن کی ہر دلعزیزی اور شجاعت دیکھ کر بھی مناسب خیال کیا کہ اسی کو بادشاہ بنا دے
 چنانچہ وہ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور حسن کا گلو کو بادشاہ بنا دیا۔ ۱۳۱۵ء میں سلطان علاء الدین حسن کا گلو ابھنی کو قتل کیا۔

کی مسجد میں سب سے بادشاہ تسلیم کر لیا اور سر پر تاج سلطانی اور جہیز سیاہ قائم کیا گیا، اور مالک دکن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا۔
حسن نے گلرگ کو پسند کر کے دارالسلطنت مقرر کیا اور جن آباد نام رکھا۔

یہ قطعی ابتدا سلطنت ہمنیہ کی، مگر علاء الدین حسن ہمنی کے ابتدائی حالات نہایت ہی تاریکی میں ہیں، مورخین نے سخت اختلاف کیا ہے۔ طاہری نے محمول النسب لکھا ہے، زبدۃ التواریخ میں مغلوں کی اصل ترکی الاصل بتا رہے فرشتہ نے گانگو پٹت منجم کا لازم ٹھہرا رہا ہے، تحفۃ الملوک میں شریف زادہ اور محمود شاہی افغانہ سے لکھا ہے صوفی ملکا پوری نے مدت کی تلاش و جستجو کے بعد حسن کا امیر زادہ اور ملوک غوریہ سے ہونا ثابت کیا ہے، ”مرات الصفا“ نے توہمن و شاہنجم کے خاندان سے ملا دیا ہے۔

ہمارے مورخین کا قاعدہ ہے کہ جب کسی بادشاہ سے دلچسپی ہو جاتی ہے تو اس کو خواہ مخواہ بڑا بنانے کی فکر کرتے ہیں یا تو اسکا شجرہ نسب ائمہ مطہرین یا سادات بنی ہاشم سے ملا دیتے ہیں یا تو شیروان و افراسیاب سے ورنہ کسی مشہور صاحبِ بزرگ، یا بادشاہ سے شجرہ ملا دینا معمولی بات ہے اسی طرح حسن ہمنی پوچھی مہربانی کی ہے۔

ظفر خاں علائی کے قتل کے بعد اسکا خاندان بریشان ہو گیا۔ حسن شاہ اور علی شاہ اس کے دو بھائی بھی انہیں پریشان حال لوگوں میں تھے، فاقہ کشی سے تنگ اگر حسن نے دہلی کا رخ کیا اور کئی روز کی مسافت طے کر کے صبح صبح دہلی پہنچے۔ وہ اپنے جتنا کا پانی اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ حسن نے وضو کیا اور فریضہ فخر کی نیت کی۔ فاقہ کشی اور مصائب سفر نے اس قدر بیت کر دیا تھا کہ قدم قدم پر چل کر آ رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کر کے جتنا کی سرد ریت پر سر بسجود ہوا ہی تھا کہ نیند یا غشی نے غلبہ کیا اور وہ حالت سجدہ ہی میں بیہوش ہو گیا، منجم شاہی کا گانگو پٹت حسب عادت غسل کے لئے آیا تو دیکھا کہ ایک جوان رعنا سجدہ میں پڑا ہوا ہے، چہرے سے آنادہ شرافت و شجاعت نمایاں ہیں گو خستگی سفر نے رنگت سیاہ کر دی ہے مگر آفتاب کی بیگی بیگی کرنیں زرد رخساروں کو چمکا رہی ہیں، برہمن نے حسن کو جگا کر حال دریافت کیا اور اسٹنان کے بعد اسکو اپنے گھر لے آیا، کئی دن تک حسن، برہمن کا ہمان رہا مگر اس کی غیور طبیعت نے پڑے پڑے روٹیاں کمانا گوارا نہیں کیا اور اُس نے برہمن سے کہا کہ یا آپ مجھ سے کچھ کام لیا کیجئے یا کوئی کام دلوا دیجئے۔ برہمن نے دو تیل اور دو درود اور تھوڑی سی زمین اس کو دی اور حسن نے کیستی باڑی شروع کی، ایک دن اس کے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ یکایک ہل کا سرا زمین میں بھنس گیا اور باد جو دوشش کے نہ بکھلا مزدوروں نے حسن کو اطلاع کی اور حسن نے زمین کھدوا کر دیکھا تو ہل کو ایک زنجیر میں لٹکا ہوا پایا زنجیر نکالنے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ ایک دیگ برآمد ہوئی جس میں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں حسن نے اس دیگ کو بہ حفاظت برہمن کے حوالہ کر دیا برہمن کو حسن کی دیانت و راست بازی پر تعجب ہوا کہ باد جو فاقہ کشی اس میں اس قدر امانت و دیانت ہے۔ اس نے یہ خبر شاہزادہ کو دی اور شاہزادے نے ایک دفعہ غیاث الدین حسن کا تذکرہ کیا، غیاث الدین نے حسن کو بلا کر اس کا حال پوچھا اور یہ معلوم کر کے کہ وہ ظفر خاں علائی کا ہمنیمہ زادہ ہے امیرانِ صدہ میں داخل کر لیا، چونکہ غیاث الدین ظفر خاں کا دوست رہ چکا تھا

اس لئے حق پرست مہربان رہے گا۔

غریب اور مفلوک الحال حق کو امیر صدہ ہوتے دیکھ کر گانگو بنم نے زانچہ بنایا تو دیکھا کہ حق کے ستارے بادشاہت میں ہیں، اس نے حق سے کہا کہ تم دکن کے بادشاہ ہو جاؤ گے اور یقین ہے کہ اس وقت مجھے یاد ہی نہ کرو گے کہ کسی برہمن نے میری مدد کی تھی حق نے کہا نہیں ایسا نہیں ہو سکتا اگر میں بادشاہ ہو گیا تو آپ کو وزیر بناؤں گا اور آپ کے نام کو اپنے جہز و نام کر دوں گا۔

یہ روایت کسی قدر قریب قیاس ہے اس کا امکان ہے کہ حق ظفر خان علانی کے خاندان سے ہو اور خاندان کئی کرتا ہوا دہلی پہنچا ہو، اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا وقت تھا برہمن نے ممکن ہے کہ اس کی مدد کی ہو اور تھوڑی سی زمین کاشت کرنے کے لئے دی ہو، پہلے تو ہندو مسلمانوں کے اس قدر متفرق تھے جتنے کہ اب ہیں اور نہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس قدر غیر معتبر اور خوفناک بنا لیا تھا جیسی حالت کہ اب ہے، دلی ہزاروں دفعہ اجڑی اور آباد ہوئی اب بھی کروڑوں خزانے سیکڑوں دفینے ہوں گے۔ کیا عجب ہے کہ حق کو بھی کوئی ایسا دینہ ملا ہو اور اس نے برہمن کے حوالہ کر دیا ہو جس کی شہرت غیاث الدین ٹک پہنچی ہو، ماہران بنوم جانتے ہیں کہ امارت و بادشاہت کی پیشین گوئی اجرام فلکی کی رفتار دیکھ کر یا آسانی کی جا سکتی ہے اس طرح یہ ناممکن نہیں کہ برہمن حق کی بادشاہت کی پیشین گوئی کر سکے۔ اور برہمن سے اس کے نام کو جہز و نام کرنے کا وعدہ کرے علاوہ اذین آج تک نہ کوئی گانگوی خاندان تھا اور نہ ہمن شاہ عجم کے خاندان کے کسی فرد نے اپنے آپ کو ہمنی کہا اسی حالت میں سوائے اس کے کہ ہم اس روایت کو قرین قیاس تصور کریں کوئی چارہ نہیں۔

حق کو دکن پہنچنے کی بہت جلدی تھی جب بادشاہ نے قلعہ خان کو دولت آباد (دیوگیری) کا صوبہ دار مقرر کیا اور امیران صدہ سے دکن جانے کے متعلق دریافت کیا تو سب پہلے حق نے آمادگی ظاہر کی اور بادشاہ نے ہگڑی، رائے باغ وغیرہ جاگیر دے کر حق کو دکن روانہ کر دیا اس نے اپنے ہمراہ اسماعیل مغ اور ملک سیف الدین غوری کو بھی لے لیا اور دولت آباد کا رخ کیا، یہاں پہنچ کر حق نے کچھ کیا اس کی تفصیل اوپر لکھی جا چکی ہے۔

۲۴ ربیع الاول ۷۵۷ھ کو دولت آباد کی قطب الدین خلجی کی مسجد میں حضرت شیخ سراج الدین جنیدی رحمتہ حق نے تحت نشین فرمایا اپنے دست مبارک سے تلوار باندھی اور تاج زرین پہنا کر چتر سیاہ تیر کا لازمہ شاہی مقرر کیا، اس چتر کی وجہ سے لوگوں سے حق کو شیخی خیال کر لیا ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے حضرت شیخ جنیدی نے سیاہ چتر کو خلفائے عباسیہ کا نشان سمجھ کر بند فرمایا تھا۔

حق نے گلبرگہ کو دار السلطنت قرار دیا اور دفتر حساب گانگو پنڈت کے سپرد کیا یہ طریقہ ۱۰۰۰ھ تک جاری رہا کہ شاہان دکن کی دفتر داری اور تحریری برہمنوں ہی کو ملتی رہی۔

حق نے اپنی مشیر اور تدبیر کے زور سے دکن کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا، ایک ہم کرناٹک کی طرف بھیج کر اس میں

نام عمدہ دار	نام عمدہ	نام عمدہ دار	نام عمدہ
سید جمال الدین نولادخال سید احمد ہردی	خزانہ دار تور بیگی مفتی	سید نور الدین سید نقی صفحانی سیرزین العابدین	معتب (نرخ) صدر مخفین تغابی کردار کشم کشنر

اس کے علاوہ ملک ستم، پردہ دار، ملک توام الدین غوری، افسر خاصہ خیل، شیخ مہناج الدین جنیدی قاضی گلبرگہ ملک لکنہ، شخبہ بارگاہ اور آیدار خانہ، خدمت عرض مکمر، ڈاک چوکی، تعمیرات، وغیرہ وغیرہ کے لئے جاہلادین نام زد کی گئی تھیں، ہفتہ میں ایک بار چہار شنبہ کو صبح سے دوپہر تک ”بارگاہ کل“ (در بارعام) ہوا کرتا تھا، انتظام عدالت بالکل شرعی تھا، ملک صدر عدالت اور اس کی ماتحتی میں کمی مفتی، معتب، قاضی، نو جدار، داروغہ، وغیرہ تھے، سلطنت چار صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی اور ہر صوبہ کے مقرر پر دس ہزار اور پیادہ فوج دہتی تھی اور پایہ تخت میں ایک لاکھ جمعیت، فوج کے لئے خاص وردی مقرر کی گئی تھی۔

(۱) سواروں کی وردی۔ قبا، خود، بنشیر، نیزہ، دستار، سرخ،

(۲) پیادوں کی وردی۔ پاجامہ (برچتر نما) الخاق بطور کچھ کلاہ مدور سیاہ،

(۳) کرتا نگی سواروں کی وردی۔ پاجامہ زونک کچھ سیاہ بگڑی سرخ بلدار

(۴) ٹایک دارڑی پیادوں کی وردی۔ سواروں کی وردی کی موڑنیتی اور خوشنما،

(۵) امراء و وزراء کا لباس۔ قبا، دستار، منصب داری، بگلوں

(۶) مشائخ و علماء کا لباس۔ جہبہ، کرتا، صدری، عمامہ،

اس کے علاوہ خدام و شاگرد پیشہ لوگوں کو قبا، کلاہ، بگلوں، اور نقباء و چویداروں کو قبا، کلاہ، عصا، بگلوں وغیرہ، ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبہ میں مساجد بنائے گئے تھے اور ہر ایک مسجد کے لئے امام موزن، مدرس، مقرر تھے جو لوگوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ بڑی مساجد میں طلباء کے لحاظ سے مدرسین مقرر کئے جاتے تھے۔

خود حسن کو علم داد بیت گہری دیکھی تھی ہمیشہ علماء کی صحبت میں رہا کرتا تھا مولانا لطف اللہ سبزواری، مامعین ہردی مفتی احمد ہردی، ملا اسحق شیرازی، ملا فضل اللہ انجو، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، صد الشریف مہر قندی، ملک رکن الدین غوری ملک سیف الدین غوری، سید رضی الدین جگاجوت وغیرہ جیسے علماء و حکماء ہمنیہ اس کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص اساتذہ مقرر تھے محمد، محمود، اور داؤد، تینوں شہزادوں کی تعلیم مولانا

فضل اللہ انجمن کے تعویض بھی اور مولانا کے زیر نگرانی اساتذہ آکر پڑھایا کرتے تھے۔

مدارس کا اعلیٰ انتظام تھا، ایلیج پور (برار) میں ایک دارالعلوم کھولا گیا تھا جس کا ایک وسیع دارالاقامہ بھی تھا اس کے اخراجات کے لئے سالانہ تیس ہزار ہون آمدنی کی جاگیر وقف تھی (ہون مشادی ہے ۱/۳ روپیہ کھدار) اس کے علاوہ دولت آباد، گلبرگہ وغیرہ میں بہت سے مدارس قائم تھے۔ طلباء کو وظائف نہیں دئے جاتے تھے بلکہ ان کے خورد نوش کپڑے لے کر ذمہ دار مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسین کی تنخواہیں معقول تھیں۔

حسن کوفنوں سپہگری سے خاص شغف تھا اس نے ہر محلے میں درزش خانے بنوائے تھے جہاں فنون سپہگری کی مشق کی جاتی اور تعلیم دی جاتی تھی، امراء کے لڑکوں کو تعلیم کا ہوں میں جا کر کشتی، تلوار، بنوٹ وغیرہ سیکھنے کے لئے خاص تاکید تھی، شیر و شکار کا بھی بہت شوق تھا گلبرگہ کے اطراف صحرائے محصورہ اس کے شکار کے لئے مخصوص تھا، اکثر شکار کو جایا کرتا تھا آخر اسی شکار کا شکار ہوا اور ایسا شکار کرتے گیا کہ مرض الموت میں مبتلا ہو کر واپس آیا۔

امراء دربار کو جاگیریں اور منصبیں دے رکھی تھیں اور ہر طرح امراء کی دجوبی کیا کرتا تھا۔

پٹیکہ کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا، اور یہی انتظام اکبر کے زمانے میں بھی قائم رہا،

شرح مالگناری نہایت ہی خفیف مقدار میں وصول کی جاتی تھی، ٹیکس بہت کم تھے اور بہ مقدار قلیل وصول

کئے جاتے تھے زراعت کی حالت اچھی تھی تجارت بھی اعلیٰ پیمانے پر تھی، صنعت و حرفت کو بہت عروج تھا، گلبرگہ میں بارہ بانی کے کارخانے قائم تھے۔

سکہ۔ ہوں، تنگہ، وغیرہ کے نام سے متفرق سکے رائج تھے اس نے اپنے سکے پر عبد معبود محمد محمود سلطان اعظم علاوہ اللہ والدینا، جانب راست، اور ”الموید نصیر اللہ ضرب فی حق آباد“ جانب چپ کندہ کرایا تھا، حسن متوسط قامت، قوی ہیکل، سرخ رنگ، جالاک وجہت، پرعب، بھادور، خوش اخلاق، سنسار، ہمدرد، منکسر المزاج، غریب الطبع، امانت دار مستقل مزاج تھا۔

بعض مودعین نے اس کی اولیات کی ایک طویل فہرست لگائی ہے جس میں سے چند یہ ہیں،

دکن میں سب سے پہلے اسلامی سلطنت قائم کی، ہندوستان اور دکن میں سب سے پہلے برہمن کا گھوٹنڈٹ کو ملازم رکھا سلاطین

دکن میں صرف حسن ہی ایک ایسا بادشاہ تھا جس کی یومی صرف ایک ہی تھی، اسی نے منصب داری دستار ایجاد کی، رسم سنی کو کم کر کے ۱۰ روز کرنے کی کوشش کی مسلم اور غیر مسلم مردوں اور عورتوں کو آپس میں بیاہ دیا، دکن میں متعدد منادر بنائے اور ان کے اخراجات کے لئے جاگیراٹ و کف کیس، برہمنوں، بجا ریوں، وغیرہ کے لئے معاش مقرر کی۔

حسن کامزار گلبرگہ میں قلعہ کے پیچھے واقع ہے جس پر ایک خوبصورت قلعہ گنبد بنا ہوا ہے جو نہایت ہی خستہ حالت میں ہے۔

سلطان محمد شاہ ہمنی ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۹ھ کو سلطان محمد شاہ ہمنی نے تخت سلطنت پر بڑی دہوم دہام سرجلوں کیا

حضرت شیخ سراج الدین جنیدی نے اپنے دست مبارک سے تلوار باندھی اور امر اور دوزدانے نذر میں دین۔

محمد شاہ نے مالک محروسہ بہمنیہ کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ (۱) گلبرگہ، (۲) دولت آباد، (۳) تلنگانہ، (۴) ہمار اسوقت تک دکن میں سکون کا رواج نہ تھا مگر اس نے طلانی سکے بنوائے جن کے ایک رخ پر کلہ طیبہ اور صحابہ اربعہ کے اسماء گرامی اور دوسری طرف اپنا نام اور سنہ جلوس کندہ تھا۔

حن نے جس نفری تخت پر جلوس کیا تھا اسی پر محمد شاہ نے بھی جلوس کیا، مگر ایک آنہوسی طلا کا تخت اسے تلنگانہ نے نشناہ دہلی کے لئے بنوایا تھا جو محمد شاہ کو تحفہ دیدیا محمد شاہ نے اس کا نام ”تخت فیروزہ“ رکھ کر اسی پر بیٹھا شروع کیا اور یہ تخت سو برس تک حاکمانِ بہمنیہ میں رہا۔ ۱۰۱۰ھ میں باہوئی نفری تخت فیروزہ شاہ کے عہد میں مرثیہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ محمد شاہ کی والدہ ملکہ جہاں نے بیت اللہ کا ارادہ کیا تو محمد شاہ نے تمام خزانہ ساتھ کر دیا کہ سادات کو تقسیم کر دیا جائے اور دوزدانے بہت مخالفت کی کہ خزانہ میں کچھ تو رکھئے مگر محمد شاہ نے ایک نہ سنی اور خزانہ روانہ کر دیا ملکہ جہاں نے حج سے فارغ ہو کر تمام خزانہ سادات کو بانٹ کر واپسی کا ارادہ کیا تو محمد شاہ بڑے کدو فرسے استقبال کیا اور ایک بڑا بھاری جشن ترتیب دیا محمد شاہ نے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا اور اس کے چار حصے مقرر کر دئے (۱) سلحدار (۲) سرخیل (۳) جلالی (۴) باردار، روزانہ پچاس سوار دو ہزار خاصہ قبل، نویت بہ نویت حاضر در دولت رہا کرتے تھے۔ امر اور مقبلاہوں کے چوکی پہرس بھی مقرر کر دئے گئے تھے اور قدیم عہدہ داروں میں کچھ تغیر کر کے حسب ذیل خدمات قائم کی تھیں،

ملک سیف الدین غوری	دکیل سلطنت ملک نائپ	بازید خاں سسانی	افسر خاصہ خیل
بہادر خاں بن اسماعیل	امیر الامراء	کلیم افند خاں مازندران	افسر جوانان یکہ
مقرب خاں بن صفدر خاں	میر آتش	سید شریعت عمر قندی	صدر
موسیٰ خاں افغان	افسر بینمہ	ملا محمد بن عین الدین	مفتی عسکر
عیسیٰ خاں	افسر میرہ	محمد دافغان	افسر سلحداران
محمد اسماعیل ناعطہ	داروغہ جواہر خانہ	سید جلال حمید	مصاحب
ملک محمود	خواں سالار	شاہ ملک غوری	مصاحب
ملا محمد مشہدی	میر سامان		ک

سب سے پہلے محمد شاہ نے در دولت پر نویت مقرر کی اور پانچ وقت نویت نوازی ہونے لگی جس کا رواج اب تک دکن میں ہر جمعہ کو صبح سے دوپہر تک دربار عام کیا کرتا تھا، اور ہر ایک شخص کی شکایات سنتا تھا۔

تمام مشائخین دکن نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی مگر شیخ زین الدین دولت آبادی نے صاف انکار کر دیا کہ ”بادشاہ شراب خواہ اور دار السلطنت میں شراب فروخت ہوتی ہے میں ایسے شخص کی بیعت نہ کروں گا“ محمد شاہ کو بہت ناگوار گرد اور اس نے شیخ کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ زین الدین مصلے کند ہے بر ڈال کر شہر سے نکلے اور ہر ماں الدین عزیز کے روضہ منورہ پر جا کر ٹھہرے اور فرمایا ”بکھین یہاں سے ہیں کون اٹھا تلے“ شیخ کی ثابت قدمی دیکھ کر محمد شاہ کے خیالات بدل گئے صد الشریف کو روانہ کر کے معافی مانگی۔ شیخ نے فرمایا اگر بادشاہ شریعت محمدی کا محاذ کرے اور توبہ کرے اور شراب خانہ اٹھا دے تو پھر بادشاہ کا کوئی دوست ہم سے زیادہ نہ ہوگا ورنہ کچھ نہیں۔ ہمارا تو یہ نصب العین ہے۔

تاسن بزیم بجز نکوئی نلکم
جہز نیک دلی و نیک خوئی نلکم
آہنا کہ بجائے مابہر ہیا کر وند
تاہست رسد بجز نکوئی نلکم

یسر کر محمد شاہ نے توبہ کرنی اور مالک محروسہ سے دوکانیں اٹھا دیں اور بالکل پابند شریعت ہو گیا۔

ابھی محمد شاہ انتظامات سلطنت سے فارغ ہی نہیں ہوا تھا کہ راباں بیجا نگر تلنگانہ نے قلعہ جات راہچورہ، مگل وغیرہ مطالبہ شروع کیا اور قلعہ کولاس کی واپسی کا مطالبہ ہی ہونے لگا۔ اوہر صرافان دکن نے ہمنیہ طلائئ اور تقری سکوں کو گلانا شروع کر دیا سلطنت بیجا نگر اور تلنگانہ کے ایلچی مطالبات لیکر گلبرگہ آ گئے، محمد شاہ نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا اور انہیں ٹھہرا لیا۔ گلبرگہ میں ایک خفیہ پارٹی بادشاہ کے خلاف ہو گئی، یہ ایسی افتادہ تھی کہ اگر محمد شاہ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو پریشان ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا مگر محمد شاہ نے نہایت ہی اطمینان سے پہلے تو اپنی مخالف پارٹی کو ڈر دیا اور پھر تمام صرافوں کو نہایت ہی سختی سے قتل کر دیا جب ان چیزوں سے فرصت ہوئی تو دربار عام کر کے ایلچیوں کو طلب کیا اور کہا کہ ”راہیوں نے اب تک بیشکش و نذرانہ نہیں دیا ہے یہ رقم فوراً داخل خزانہ کر دیجائے“ ایلچیوں نے بادشاہ کا حکم راباں بیجا نگر اور تلنگانہ کو پہنچا دیا اور انہوں نے ایک زبردست لشکر سپہ سالار ناگ دبو اور نانک رام کی سرکردگی میں کولاس روانہ کر دیا۔ محمد شاہ نے یہ اطلاع پاکر بہادر خاں بن اسماعیل مخ کو ایک مختصر سا لشکر دیکر مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ جس نے پہونچ کر نہایت ہی جی داری سے مقابلہ کیا اور راجہ درنگل سے خراج و تحائف لیکر واپس ہوا۔

۳۳ھ میں چند سوداگر گھوڑے لارہے تھے جو محمد شاہ نے منگوائے تھے جب وہ درنگل پہونچے تو ناگ دبو نے چہین لئے اور سوداگروں نے اس کی اطلاع بادشاہ کو دی، اطلاع پاتے ہی محمد شاہ ایک ہزار سوار لیکر بجلی کی طرح درنگل پہونچ گیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا، ناگ دبو قلعہ سے باہر ایک بلغم میں شراب پی کر مست پڑا ہوا تھا۔ محمد شاہی فوج نے اسے گرفتار کر لیا اور قلعہ کے سامنے آگ جلا کر پہونک دیا محمد شاہ نے پندرہ روز تک وہیں ٹھہر کر جشن منایا جب راباں تلنگانہ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے تعاقب کیا۔ محمد شاہ لڑتے بھڑتے ہوئے واپس ہونے لگا مگر بہت نقصان اٹھانا پڑا بازو پر گولی کا شدید زخم لگا اور صرف پندرہ سو آدمی گلبرگہ تک پہونچ سکے۔

۶۳ء میں رائے تلنگانہ نے فیروز شاہ دہلی کو کہا کہ ہم ایکاکر کے آپ کی مدد کرتے ہیں آپ حکام نالود اور بھارات کو دکن پر
 جڑ پائی کا حکم دین مگر فیروز شاہ کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی وہ دکن پر کیا چیز پائی کرتا اس نے جواب نہ دیا مگر جب یہ خبر محمد شاہ کو
 ملی تو وہ آگ ہو گیا اور اپنے لشکر کے دو حصے کر کے ایک درنگل اور ایک گولکنڈہ روانہ کر دیا اور دونوں طرف لشکر کا سیلاب
 رہا۔ درنگل نے ایک بیٹس بہار صبح تحت اندازاً چالیس لاکھ قیمت کا دربے شمار زرد جوہر دیکھ بچھا بچھڑایا اور گولکنڈہ بھی
 محمد شاہ کے ہاتھ آیا۔ ۶۴ء میں درنگل پر بھی محمد شاہ کا قبضہ ہو گیا اور دیائے کرشنا کا تقریباً کل حصہ سلطنتِ ہمنیہ میں داخل ہو گیا
 ۶۵ء میں محمد شاہ اور رائے بجا پگرنیں ایک باقاعدہ لڑائی ہوئی جنہیں نہ تو مصالح ملکی مد نظر تھے اور نہ کوئی مذہبی خیال تھا
 صرف محمد شاہ کو اپنے حکم کی تعمیل کرانی منظور تھی، ملا داؤد بیدری جو محمد شاہ کا سردار تھا اس جنگ کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے،
 ”ایک روز محمد شاہ ہمینی حیلہ رقص و سرود میں مچھا ہوا تھا کہ قوالوں نے امیر خسرو کے دو شعر گائے جسے محمد شاہ نے بہت پسند کیا اور ملک
 سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ ان تین سو قوالوں کو انعام دینے کے لئے ایک برات راجہ بجا بھنگر کے نام لکھ دی جائے۔ ملک سیف الدین
 نے اس وقت برات لکھ دی مگر اس خیال سے کہ بادشاہ نشہ میں ایسا حکم دیدیا ہے ممکن ہے کہ بگڑ خیالات بدل جائیں برات روانہ
 نہیں کی، دوسرے روز بادشاہ نے دریافت کیا برات روانہ کر دی گئی“ تو سیف الدین نے جواب دیا نہیں“ یہ امر محمد شاہ کو
 بہت ناگوار گذرا کہا ”کیا تو خیال کرتا ہے کہ کوئی لغو اور حمل حکم مابودلت کی زبان سے نکل سکتا ہے ہم نے نشہ میں حکم نہیں دیا
 بلکہ جو کچھ کہا گیا سچے بچہ کر کہا گیا ہے“ غوری نے فوراً برات پر مہر کی اور ایک معتبر شخص کے ہاتھ برات بجا بھنگر روانہ کر دی گئی۔
 رائے بجا بھنگر نشہ حکومت میں جو رہتا وہ کسی کو اپنے مقابلہ کا خیال ہی نہیں کرتا تھا حکم کی تعمیل تو ادبات ہے اس نے قاصد
 سے برات لیکر اس کی تشہیر کی اور گدھے پر بٹھلا کر تمام شہر میں پھرایا اور ذلیل کر کے نکل وادیا۔ اور تمام فوج ساتھ لیکر بجا بھنگر
 سے چل پڑا تیس ہزار سوار، تین ہزار باھقی، نو لاکھ پیدل سے قلعہ اوہوتی پر یورش کی اور تمام علاقہ لوٹ لیا۔ اور مدگل پہو بھنگر
 قلعہ پر بھی حملہ کر دیا۔ یہاں کا داروغہ ملک سیف الدین غوری کا ایک عزیز اور نہایت ہی سخت آدمی تھا، قلعہ پر آٹھ سو جواں
 محافظت کے لئے تھے مگر داروغہ کی سختی کی وجہ سے بد دل تھے، اسی بددلی کی وجہ وہ لوگ مقابلہ نہ کر سکے اور راجہ نے مدگل پر
 قبضہ کر لیا، تمام باشندے قتل کر دئے گئے حتیٰ کہ زن و مرد میں کوئی باقی نہ رہا صرف ایک مسلمان نہ جانے کہاں چھپ رہا تھا کہ
 راجہ کے سپاہیوں کی وردی بہن کہ مدگل سے نکلا اور گلبرگہ پہو بھنگر سار احوال کہہ سنایا بادشاہ یہ خبر سنا کر آگ ہو گیا اس خبر لانے
 والے کو یہ کہہ کر قتل کر دیا کہ ”میں ایسے سخوس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا جو تمام بہادروں کو کٹھنہ مٹرتے دیکھ کر اپنی جہاں بجا کر
 بھاگ آئے۔ اسی دن جمادی الاول ۱۰۳۸ء کو قہر لکھائی کہ جب تک آٹھ سو مسلمانوں کے خون کے عوض ایک لاکھ ہندوؤں کو
 قتل نہ کر لوں گا اور قہر لکھائی اور کشت و خون سے ہاتھ نہ روکوں گا“ اسی دن گلبرگہ سے روانہ ہو گیا اور جب رودکر شاپر
 پہنچا تو مغلطہ قسم لکھائی کہ جب تک خداوند کریم کے فضل و کرم سے دریا عبور کر کے لشکر کفار کو نصیحت و نابود نہ کر لوں گا اور مسلمانان
 مدگل کے خون کا بدلہ لیکر دل نہ ٹھنڈا کروں خواب و خور حرام ہے“ اپنے بیٹے کو جانشین بنا کر وصیت تک کر دی اور ملک میں سیف الدین

غوری کو نائب السلطنت مقرر کر کے گلبرگہ روانہ کر دیا اور صرف خاصہ کے بیس ہاتھی اور نو ہزار سوار ساتھ لیکر کرشنا کے پار جا اترے۔ بادشاہ کا حال منکر رائے بیجا نگر کو بہت پریشانی ہوئی اس نے خزانہ وغیرہ روانہ کر کے خود بھی قرار پر قرار کیا، مگر رات میں بارش ہو چکی تھی راستہ خراب تھا یہ مشکل چار میل ہی گیا ہوگا کہ محمد شاہ لئے ہوئے آہو بچا اور پہلے ہی محلے میں ستر ہزار زن و مرد اور بچے قتل کرے۔ دھنڑار ہاتھی تین ہزار تو ہیں اور ہندو قین، سات سو عربی النسل گھوڑے ایک منزل سنگاسن (رباکی) مرصع داخل خزانہ ہوئی اور بقیہ لوٹ امرار اور فوج کو ملی، محمد شاہ نے موسم برسات مدگل ہی میں بسر کیا جب خان محمد دار السلطنت سے فوج لیکر آیا تو اُسے ادھونی روانہ کر دیا اور ہر دیوار اُسے اپنے ہمارے کو سپہ سالار بنا کر قلعہ میں جھوڑا۔ اور خود بیجا نگر سے فوج ہاتھی اور لوہا زم شاہی منگو کر قلعہ کے باہر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے بھی تو ہیں اور ہندو قین زیادہ تعداد میں منگوائیں اور ایک آتش باری کا نیا کارخانہ قائم کیا جس کا رواج اب تک نہ تھا یہ اسی کی ایجاد تھی مقرب خان سیتانی کو اس کا انصر مقرر کیا اور ردی اور فرنگی سپاہی کا کام کرنے کے لئے مقرر کئے گئے۔

ریاست بیجا نگر پر چڑھائی کا یہ بالکل ہلکا موقع تھا اس لئے محمد شاہ کو چھوٹا چھوٹا قدم رکنا پڑا، مگر اسپر بھی محمد شاہ نے تنگ ہمدار کو عبور کر کے ٹھینا پچیس میل آگے بڑھ کر یا کل کو تال پر بیجا نگر کی فوج سے مقابل ہوا، کیونکہ محمد شاہ کے دیبا پار اُترنے کی اطلاع جب ”ہنگار“ بیجا نگر کو ملی تو اس نے امرار کے مشورے سے ہوج مل کو سپہ سالار مقرر کر کے چالیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیدل دیکر محمد شاہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا۔ ہوج مل کو سپہ سالاری کا عہدہ پا کر ایسی سرت ہوئی کہ اپنے آپ کو بھول گیا اور راجہ سے پوچھنے لگا ”ہمارا ج کا کیا حکم ہوتا ہے آیا بادشاہ کو زندہ قید کر کے حاضر کروں یا اس کا سر کاٹ کر لاؤں“ راجہ نے کہا۔ زندہ دشمن تو ہر حال میں خطرناک ہے بہتر تو یہ ہے کہ تم اس کو جسوت گرختار کرو نور مار ڈالو“ ہوج مل خوشی خوشی روانہ ہوا اور اس نے یہ ایک اور ترکیب سوچ لی کہ چند برہمنوں کو اس واسطے مقرر کر دیا کہ لشکر میں مسلمانوں کے مظالم بیاں کر کے سپاہیوں کو جوش میں لائیں۔ برہمن تو مسلمانوں پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے دل کھول کر مسلمانوں کے مظالم بیان کرنے شروع کئے اور ایسے دغظ کئے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے دل میں جذباتِ منافرت کی طغیانی ہونے لگی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ محمد شاہ کو جب ہوج مل کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے پندرہ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل خود رکھ کر اور دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل اور توپ خانہ دیکر خان محمد کو مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا

پنجشنبہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۷۷ھ کی صبح سے مقابلہ شروع ہوا شام تک دونوں فوجیں آپس میں گنتی رہیں عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں مینہ اور میسرہ پر لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور انکی فوجیں منتشر ہونے لگیں قریب تھا کہ فوج کے قدم اکھڑنے لگیں کہ بادشاہ خود تین ہزار سوار لیکر ہو چلا گیا، محمد شاہ کو دیکھتے ہی خان محمد کی ہمت بند ہی اور منتشر شدہ فوج لیکر حملہ کر دیا، مقرب خاں بھی توپ خانہ لیکر آگے بڑھا، تمام افسران فوج نے اکٹھا ہو کر ہار دیا۔ ہندو روک نہ سکے اور آپس میں گتھ گئے

دست بدست لڑائی ہونے لگی، اتفاق سے محمد خاں کا ہاتھی ”شیر شکار“ بدل گیا اور ہمدات کے قبضہ سے نکل کر سیدھے قلب شکر میں جا گرسا، بھوج مل کے ہاتھیوں نے روکنا چاہا مگر وہ کب رکتا تھا اسی گڑبڑ میں ہمدات بھی بار گیا اور شیر شکار معلق العناں ہو کر روندنے لگا خان محمد نے بھی پانچ ہزار سوار لیکر قلب پر حملہ کر دیا، شیر شکار بھی اپنے مالک کو دیکھ کر اس کی طرف آیا اور دشمنوں کو پا مال کرنے لگا۔ بھوج مل زخمی ہو کر بھاگا اور اس کو بھاگتے دیکھ کر لشکر کے قدم بھی اٹھ گئے، محمد شاہ نے قتل عام بول دیا۔ اب کیا تھا مرد و مرد عورتیں اور بچے بھی تہ تیغ کئے گئے، کامل فتح ہوئی اور محمد شاہ نے اسی میدان میں ڈیرے ڈال دیئے اور ایک ہفتہ قیام کر کے آگے بڑھا، رستے بجا بنگر باوجود فراوانی لشکر کے ایسا گھبراہٹ کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ گیا محمد شاہ بھی اپنی بات کا ذہنی تھا تین مہینے تک کوہ و صحرا میں چھپا کرتا رہا، اور راجہ کو گھیر کر قلعہ کی طرف لایا، ایک مہینہ تک راجہ قلعہ بند اور بادشاہ محاصرہ کئے رہا مگر بیٹھے بیٹھے محمد شاہ کو ایک نئی چال سوچی یکایک بستر علات پر دراز ہو گیا اور اپنی شدید علات کی خیر شتر کرادی، یہ ایک راز تھا جس سے خان محمد اور مقرب خاں کے سوائے کوئی واقف نہ تھا، رستے بجا بنگر کو اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی اور وہ قلعہ کے باہر نکل پڑا، بادشاہ پیچھے ہٹنے لگا اور راجہ تعاقب کناس ساتھ ہو گیا، بادشاہ سنگھاسن میں بیٹھا ہوا سفر کرتا تھا تمام لشکر پریشان ساتھ ساتھ تھا، اس طرح دریائے تنگہدر کو عبور کر کے ایک میدان میں قیام کیا۔ دو تین کوس کے فاصلہ پر راجہ نے بھی ڈیرے ڈال دیئے، راجہ بالکل بے سرو سامانی کے ساتھ شاہی لشکر کو دیا تا ہوا آگیا تھا جب محمد شاہ نے دیکھا کہ موقع اچھا ہے تو ایک دن دربار عام کیا اور دس پندرہ منٹ بیٹھ کر دربار برخواست کر دیا، اس سے فوج میں ہمت آگئی اور رات کے بارہ بجے لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیا اور خود ہی تیار ہو کر راجہ کے لشکر پر بخون مارا تمام ہندو بے خبر پڑے سو رہے تھے جب مسلمانوں نے سر پر ہونچ کر قتل عام شروع کیا تو یہ بیدار ہوئے مگر مسلمانوں کی تلوار سے پناہ پانی مشکل تھی۔ رستے بجا بنگر تو اپنی جاں مٹھی میں لیکر چلتا بنا کر دس ہزار آدمی کام آئے، اسپر ہی محمد شاہ کا تیش کم نہ ہوا، بجا بنگر کے اطراف چالیں چالیں کوس تک قتل عام کر دیا، دس ہزار بیکون قتل ہوئے اور قلعہ کے اطراف رعایا کا پتہ نہ رہا اور فوج تو نام کو بھی باقی نہ تھی۔

ادھر ہندو بے انتہا پریشان تھے تمام امراء و وزراء نے اس قتل عام کو رائے بجا بنگر کے سر ہتھو پاکہ محض تیری چہرے اور تیری ہی خود سری اور شعلہ مزاجی کے کارن یہ دن دیکھنا نصیب ہوا، ہم نے علاء الدین سے صلح کر لی تھی تو نے ذرا سی بات کے واسطے لڑائی مول لی، اب نہ تو تو رہیگا اور نہ سلطنت کا نام و نشان ہی باقی رہیگا، اب بھی مصالحت کرنے تو چاہا ہے، اس وقت راجہ نے ایک ایلیچی روانہ کیا اور معذرت سے عفو تقصیر چاہی مگر بادشاہ نے صاف انکار کر دیا۔ امراء ہند بھی لڑائی سے تنگ آ گئے تھے ایک بیش رفتہ من چلے امیر نے عرض کی کہ حضرت نے آٹھ سو مسلمانوں کے بدے میں ایک لاکھ ہندوؤں کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی اور وہ پوری ہی ہو گئی، مگر یہ قسم نہ تھی کہ روئے زمین پر کے تمام ہندو قتل کئے جائیں گے۔ یہ سن کر محمد شاہ ہنس پڑا اور کہنے لگا تم سچ کہتے ہو مگر مجھے اپنی بات کی لاج ہے۔ جب تک رائے بجا بنگر میرے حکم کی تعمیل نہ کرے گا

اور قوالوں کو رقم نہ دیگا میں مصاحبت نہ کر دینگا، ایلی نے فوراً قوالوں کو رقم ادا کر دی اور جب محمد شاہ نے قوالوں کو رقم دیکھا تو
ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہنے لگا ”میں نہیں چاہتا کہ کوئی حکم میری زبان سے ایسا لے لے جس کی تعمیل نہ ہو سکے۔
اور آئے جل کر میری بسکی ہوا محمد شہزادہ میرا حکم پورا ہوا“

محمد شاہ کی اس عظیم النظیر سخن پروردی کو بہ بھی وقت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اتنی سی بات کو افسانہ کر دینا اور ایسا
کشت دخول در ایک منور ہے

ایلیچوں کے معروضہ پر بادشاہ نے عہد کیا کہ آئندہ کسی جنگ میں فتح کے بعد کسی ہند کو قتل نہ کیا جائے گا۔ مگر اس کی
پابندی نہ تو خود محمد شاہ نے کی اور نہ اس کے جانشینوں نے چند ہی روز کے بعد یہ عہد ہلا دیا گیا۔
مصاحبت کے بعد محمد شاہ گلبرگ آگیا مگر اس وقت بجا نگر کی حالت بڑی تھی پانچ لاکھ ہندو تہ تیغ ہو چکے تھے اور
کوسوں تک دیرانا ہی دیرانا نظر آتا تھا مدت تک بجا نگر سہل نہ سکا۔

محمد شاہ نے جبوقت اپنی علالت کی خبر اڑائی تو بہرام خاں مازندرانی نے بغاوت کر دی گلبرگ پہنچ کر بادشاہ کو اطلاع ملی
تو اس کی سرکوبی کے لئے تیار ہونے لگا، مگر وہ گجرات بھاگ گیا جس کی وجہ ایک فتنہ عظیم فرو ہو گیا۔

۱۹ ذی قعدہ ۱۱۷۵ھ کو سترہ سال نوہینے سات دن حکومت کر کے ۵۴ سال کی عمر میں محمد شاہ نے انتقال کیا،

حبت زیں دار دول چہنت راہ

چون محمد شہ زمین و زماں

اہل دیں مرد دیں محمد شاہ

شاہ ملت گوباس نیز

۱۱۷۵ھ

۱۱۷۵ھ

محمد شاہ دشمنوں کے لئے نہایت ہی سخت گیر اور اپنی رعایا اور فوج کے لئے نہایت ہی ذی خلق تھا۔ نہایت ہی عقیل و شجاع
فیہم، والاعزم، اور عالی حوصلہ تھا۔ بھگلوں اور ڈاکوؤں کا قلع و قمع کر دیا اس کے زمانہ میں آٹھ ہزار ڈاکو گرفتار کئے جا کر قتل کئے
گئے تھے ایک دفعہ سارا خزانہ بیت اللہ کو روانہ کر دیا مگر بعد میں اس کے ہاں اس قدر خزانہ جمع ہوا کہ دوسرے کسی بادشاہ کو
اتنی دولت میسر نہ آسکی۔ اس کی اولاد سے ایک بیٹا مجاہد شاہ اور ایک بیٹی راج پرمد آغا تھی۔

باقی

تصویر زیب النساء سلیم

قیمت صرف ۸/- منبر نگار لکھنو

تصویر تاصہ

قیمت صرف ۴/- منبر نگار لکھنو

غنايات سے توقع ہے کہ اس بارہ میں ”ملاحظات“ کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ فرمادیں گے۔

سید محمد قادری بی، لے

صاحب موصوف کی فرمائش ہے کہ میں ملاحظات کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ کر دوں۔ لیکن چونکہ ملاحظات میں اتنی گنجائش نہیں رکھ سکتی تھی اس لئے اس مکتوب کو علاحدہ درج کر کے، غلط فہمی کا ازالہ تو نہیں البتہ اس امر کی توثیق کرنا چاہتا ہوں کہ اس نسخہ کو حیدر آبادی ڈیفن کے سوا کچھ اور کہہ سکتے ہیں۔

آپ نے اول تو یہ باطل غلط سمجھا کہ اس مضمون کے لکھنے والے احسن مارہروی ہیں۔ مضمون کے اخیر میں احسن لکھنوی کے الفاظ نہایت صاف صاف درج ہیں، علاوہ اس کے کہ یہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مضمون کا لکھنے والا وہی ہے جس نے ”واقعات انیس“ لکھے اور یہ دنیا کو معلوم ہے کہ ”واقعات انیس“ ماہرہ کی پیداوار نہیں بلکہ لکھنوی کی چیز ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ مراثی انیس پر ناقدانہ یا مصححانہ نگاہ ڈالنا مارہرہ، افتخوری یا حیدر آباد کے کسی فرزند کا کام نہیں بلکہ اس کو دہی شخص کر سکتا ہے جو لکھنوی کے اہل ادب کی زبان و معاشرت سے واقف ہو اور یہ فخر لکھنوی میں بھی اب صرف چند نفوس کو حاصل ہے۔ جناب نظامی عفی عنہ نے اپنے مقدمہ یا تمہید میں جو مراثی انیس جلد اول کے اول میں شامل ہے نہایت کھلے الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ :-

اساتذہ اردو میں میر میر علی صاحب انیس کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اس سے زبان و طرز بیان کا سیکھنا ان کا تتبع کرنا ان کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر و ادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایہ اختیار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں ان کے تعارفات ایک اوستا زمانہ ہونے کی حقیقت سے اردو میں قابل اسناد ہیں اس اہمیت کو مد نظر رکھ کر جناب سید اس مسعود صاحب بی لے (اکبر) ناظم تعلیمات دولت اصفیہ نے اجی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شائع کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اعلیٰ حضرت قدر قدرت ہزار گزرا اللہ ملای نس اصف جاہ جہاں پناہ فل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک محی الملک والیدین نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نظام الدولہ فتح جنگ باقاعہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اردو کے کلام کی اشاعت کے لئے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا مراثی انیس کی پہلی جلد شائع ہونے کی نوبت آئی اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض دھڑائی ہیں جو اب تک طبع میں ہوئے نہ حقیقت یہ جلد میر صاحب کے اس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت انھوں نے خود فرمایا ہے :-

ضمیفی نے ہم کو جو ان کو دیا

گھٹا زور مشق سخن پر لگی

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی الخا طرب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اردو دان پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے۔ آغا سید حسن صاحب بی لے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدر آباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے میر صاحب کا اصلی نوٹ عنایت فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

امید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتب مولانا طباطبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل العن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیں گے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملیگی لیکن ہماری بد قسمتی سے مولانا نے موصوف اپنی پیرائہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری خواہش کو پورا نہ کر سکے اھوں اپنے ایک نواز شنامہ کے چند فقرہ میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اس کا نقل کرنا خالی از دیکھی نہ ہو گا وہ لگتے ہیں۔

اس جلد میں میر صاحب مرحوم مدفوع کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارتاً بیات ظاہر کر دی ہے کہ ان کی آخری عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب ابو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بے میں تھے جس دن جناب مرحوم نے منبر مجلس کو الوداع کہی تینوں صا جزا دے سامنے حاضر تھے جھوٹے فرزند میر محمد صاحب بیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیدیا سلیس مرحوم بیابج و حیدر آباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا گئے۔ یہ مرثیے منشی نوکشور کو نہ ہاتھ آ سکے کہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کے انتہائے مشق کا کلام ہے لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بے سے جدا کرنے پڑے۔“

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب باپوسی ہو گئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ ہو ہذا۔

اس ”نوٹ“ کے بعد جو کچھ خامہ فرسائی کی گئی ہے اس سے ہمیں بحث نہیں کیونکہ اس کا تعلق صرف جناب ”نظامی

عفی عنہ“ کے ذوق قلم و اجتہاد فکر سے ہے واقعات سے نہیں۔

کیا اس تحریر کے بعد کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ مراثی انیس کا یہ ادیشن، حیدر آبادی ادیشن نہیں ہے۔ ریاست نظام کا ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ میں دہاں کے علم و ادب کا نظم و نسق ہے، مراثی انیس کی اشاعت کے لئے ایک

ایک شاہانہ عطیہ کی سفارش کرتا ہے، اعلیٰ حضرت جو فطرتاً علم دوست واقع ہوئے ہیں اس کی ضرورت کو محسوس کر کے اس سفارش کو منظور فرماتے ہیں اور متوسلین حیدر آبادی سے نفیم طباطبائی ایسا شخص جو لکھنؤ کے نہ صرف مخصوص فضلاء و ماہرین ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ عہد انیس کے واقعات، حالات، زبان، محاورات اور معاشرت و تمدن سے پوری طرح واقف ہے اس کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دیتا ہے، اور پھر بھی اس پر اصرار ہے کہ اس نسخہ کو حیدر آبادی ڈیشن نہ کہا جائے کیونکہ وہ اغلاط سے لبریز ہے اور اس حقیقت کا اظہار حیدر آبادی کی علمی نیک نامی کے لئے مضرت ثابت ہوگا۔

کیا ایسی کتاب جس میں ردیہ، سفارش، تصحیح و ترتیب سب حیدر آبادی کو صرف اس بنا پر کہ وہ بدایوں میں طبع ہوئی ہے، حیدر آبادی ہونے سے خارج کر دیتا ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ حیدر آبادی ڈیشن ہونے کے لئے اور کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ کتاب حیدر آبادی میں شائع ہوتی تو بھی بہر حال مسعودیہ جنگ اور مولانا طباطبائی ہی اس کے متمم و مصحح مرتب ہوتے اور وہی اب بھی ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض بدایوں میں چھپنے کی وجہ سے کیوں اس کو حیدر آباد سے ”خارج البلد“ کیا جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب سے اعلیٰ حضرت حضور نظام کی علم پروری یا حیدر آباد کی علمی خدمتوں پر مضرت پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں تو اب حقایق مسلمہ میں داخل ہیں اور ان سے کسی کو انکار ہی نہیں ہو سکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے شاہانہ عطیہ کا مصرف بالکل غلط ہوا اور وہ مقصود پورا نہ ہو سکا، جس کو سامنے رکھ کر سفارش کی گئی تھی، اور جس پر اعتماد کر کے اعلیٰ حضرت نے امداد منظور فرمائی تھی۔

میں بہت مسرور ہوا کہ آپ نے یہ خط بھیج کر مجھے موقعہ دیا کہ اس مسئلہ پر اصولی گفتگو کروں کیونکہ میرے نزدیک اس وقت تک حیدر آباد کا مراثی انیس کی طرف سے غافل رہنا ایک ایسی فزوکراشت ہے جس کی طرف جلد سے جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے، میں نے حیدر آباد کی تخصیص اس لئے کی کہ اس وقت وہی مرکز ہمارے علوم و فنون کا ہے اور وہیں کی شاہانہ فیاضیاں ہمارے ضایعات کی تلافی کر سکتی ہیں۔

اگر آپ اور دیگر حیدر آبادی حضرات کچھ مدد کر سکتے ہوں تو کیجئے۔ میں شوق سے مستقلاً یہ سلسلہ قائم کرنے کے لئے طیار ہوں اور جناب احسن لکھنوی کو بھی آمادہ کر دینگا کہ وہ اپنے خاندان کے تمام محفوظ کتبوں کو نکال کر جس قدر کلام انیس شائع ہو چکا ہے اس کے ایک ایک نقطہ پر نگاہ ڈال کر صحت کی طرف متوجہ ہوں۔

نظامی پریس کی دوسری جلد مراثی انیس کی بھی تکاسیری نظر سے نہیں گزری، لیکن اگر یہ سلسلہ قائم ہو گیا تو پھر اس کا کتنا بھی ناگزیر ہوگا۔ بہر حال آپ کی طرف سے جو امداد اس باب میں ہو سکتی ہے اس سے مطلع فرمائیے تاکہ میں تمام آسانیوں اور دشواریوں پر نگاہ کر کے اس سلسلہ کو شروع کر دوں۔

نیاز فحوری

باب الاستفسار

(بعض سیاسی سائل)

(جناب غلام علی خاں صاحب انگ)

رہنما ہنگار برابر دیکھتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں آپ کی محنت کی داد دیتا کرتا ہوں۔ اگر نانا گوارنہ جو تو ایک رائے پیش کر دے اور وہ یہ ہے کہ ہنگار میں کوئی حصہ سیاسیات کا نہیں ہوتا جو کہ مجھے اس بہت دلچسپی ہے اس لئے بہت جی چاہتا ہے کہ مختلف مسائل میں آپ کی رائے بھی معلوم کرتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر حصے اس میں چند صفحات اس کے لئے انگ کر دے جائیں اور ان میں سیاسی مضامین درج ہوتے رہیں۔ بہر حال اس وقت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارا گاندھی کو آپ کیا سمجھتے ہیں؟ سائل عدم تعاون، ستیاگرہ، کھدر پوشی اور مجاں خلافت، تبلیغ، مسلم لیگ اور کانگریس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے۔ دعا یہ ہے کہ میں آپ کی سیاسی معتقدات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(ہنگار) ایک زمانہ سے یہ سلسلہ میرے سامنے ہے کہ ہنگار میں کم از کم دس صفحے سیاسی شذرات کے لئے مخصوص ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حصہ بھی استفسارات، معلومات، ملاحظات وغیرہ کی طرح متغیر ہے۔ مجھے کو پورا کرنا پڑے گا اس لئے اس ذمہ داری کو لیتے ہوئے گھبراتا ہوں اس لئے نہیں کہ محنت سے جی چراتا ہوں، بلکہ محض اس بنا پر کہ وقت کہاں سے لائوں آپ یقین کیجئے کہ اخبارات و رسائل پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی بھی فرصت مجھے حاصل نہیں ہے، بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی اہل شخص میرے مشاغل کا بار نبھانے کے لئے مل ہی جائے گا اور میں آپ کے اس نہایت مفید و ضروری مشورہ پر عمل کر سکوں گا۔

ابا نے یہ سلسلہ ہمارا گاندھی کو میں اس زمانہ کا سب سے بڑا انسان سمجھتا ہوں یہاں تک کہ کوئی شخص کوشش و سعی کے باوجود بھی ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ ان کی سیاسی تعلیم اس قدر زبردست ہے کہ اگر کوئی جامعیت اسپر عمل کر سکے تو اپنے اندر ایک ایسی بے نیازانہ قوت پیدا کر سکتی ہے کہ اس کے کسانے سارے عالم کی مادی قوت سپرد ڈالنے پر مجبور ہو جائے، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ہمارا گاندھی کی تقلید آسان کام نہیں اور ایک ملک حدود و سرحدیں سیاسی ابتلا سے گزرنے کے بعد ہی اس میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ ہمارا جی جس چیز کو اس وقت پیش کر رہے ہیں وہ غالباً پچاس برس کے بقا بل عمل ہوگی اور ہر چند اس وقت وہ تو موجود نہ ہوں گے، لیکن ان کی تعلیمات زندہ ہو گئی اور ملک انہیں پرکار مند ہو کر

خ گاندھی جی کوئی خوش قسمت یا سیر تو نہیں یہی جو ان کے سہ سے دیکھنا اور ایک مشعل احر ہے۔

منزل مقصود تک پہنچ سکیگا۔ عدم تعاون اور ستیاگرہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نیک دوسرے کو مستلزم ہے اور یہی اصل روح گاندھی جی کی تعلیم کی ہے۔ کھدر کے استعمال کی برکتیں ہر شخص پر روشن ہیں اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس سلسلہ میں ”دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں“ چونکہ ہم لوگ نہایت سطحی تعلیم و تربیت رکھنے والے ہیں اس لئے بعض اوقات بعض نفوس بالکل غلط اثر قبول کرتے ہیں۔ کھدر کے استعمال کا جو اقتصادی فائدہ ہے وہ تو بھر ظاہر ہی ہے لیکن اس میں ایک نوع کی روحانی تعلیم بھی مضمر ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے آپ کو غریبوں کی سطح پر آئے اور ان کے ساتھ ہمدردی کرے لیکن اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے نگاہ کی اور کھدر پوشی حقیقتاً ایک ذریعہ اور عجب و عذرا کا بن گیا۔

میرے سامنے ایسی مثالیں ہیں کہ بعض نوجوان اس کا استعمال صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی سفید ملاحیت ان کے گورے رنگ اور داڑھی مونچھ منڈے ہوئے صاف و صبیح چہرہ پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور ان کا رقوم میں ایسے تو متحد ہیں جو کھدر پہننے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ اپنے اندر انکسار افتادگی پیدا کریں اپنے آپ کو ایسی عظیم و بلند ہستی سمجھنے لگیں کہ پھر مشکل ہی سے کوئی شخص قابل التفات ان کو نظر آتا ہے اور ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جو ان کو اس لباس میں دیکھ کر کوئی اور دہشتہ ”مولانا“ لکھ رہا تھا چومنے کے لئے بڑھتا ہے اور یہ ایک ایسے عجز کے ساتھ جس میں فرعون کا غرور پنہاں ہوتا ہے اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں اور ایسے لب و لہجہ میں گفتگو شروع کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا نظام انھیں کی ذات پر منحصر ہے اور اگر آج یہ سیادت و قیادت چھوڑ دیں تو غنایہ نظم عالم درہم برہم ہو جائے۔

یہ لوگ کھدر کے لباس میں بھی قصداً بدترتیبی اور بھڑکھڑ پن پیدا کرتے ہیں، ارادتا بیوندگے ہوئے بوسیدہ اور میلے کپڑے کھدر کے استعمال کرتے ہیں تاکہ عالم کی طرف سے بے نیازی، لوگوں کی جانب سے بے مہربانی، اور امور دنیا میں ایک خاص قسم کا اظہار پن ظاہر ہو اور اس طرح لوگ ان کی طرف زیادہ مایل ہوں

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کھدر پوشوں کی وہ جماعت جو زراعت تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے اکثر افراد اس عذاب میں مبتلا ہیں اور جس وقت وہ موٹر میں بیٹھ کر باہر نکلتے ہیں تو ہر چند بظاہر ان کا لباس جس کو قصداً انھوں نے تار تار کر دیا ہے، حد درجہ انکسار کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ان کے نفس میں اس وقت اتنا سخت غرور بھرا ہوتا ہے کہ مشکل ہی سے کسی مستبد حکمران میں پایا جاسکتا ہے۔ بہر حال کھدر پوشی کا یہ مکرہ و مجنوس پہلو یقیناً سخت لعنت ہے لیکن محض ایسے خود نما خود فروش مکالموں کی وجہ سے اصولاً اس کو نہ بڑا کہا جاسکتا ہے اور نہ اس کے ترک کی ترغیب دلائی جاسکتی ہے۔

۷۶) مجلس خلافت اب بالکل لایعنی اور بیکاری بن چکی ہے، کیونکہ جب خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہا اور اس مصیبت سے عالم اسلامی آزاد ہو گیا تو پھر سانپ بھل جانے کے بعد کیر کا پٹنا کیا معنی رکھتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اب مجلس خلافت سے مقصود صرف ایک ایسی تنظیم کا قیام رکھنا ہے جو مسلمانوں کو ایک شیرازہ سے وابستہ رکھے تو اس کے لئے کوئی اور نام تجویز

کرنا چاہئے موجودہ نام سراسر دہوکا ہے، اگر اس نام کے جواز کے لئے یہ تاویل پیش کی جائے کہ ہر چند مسئلہ خلافت اب باقی نہیں رہا ہے، لیکن جرمن تو موجود ہیں، وہاں کے مسائل سے تو مسلمانوں کو واسطہ ہے تو میں اس کو اصولی غلطی کہوں گا۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عراق و حجاز، ترکی و ایران وغیرہ کی سیاسیات سے بحث کرنا یا محض سیاسیات خارجہ کے لئے ایک مستقل انجمن قائم کر کے اپنی ملکی سیاسیات کو پس پشت ڈال دینا بالکل خلاف عقل ہے۔ ہر ملک اپنے مصالح کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اور ہماری چیخ بیکار سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ اس کو نہیں پہونچتا بلکہ بعض اوقات برا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے اپنی ملکی حالت پر غور کر کے اپنے لئے کوئی طریق عمل پیدا کرنا چاہئے اور جب اس سے فارغ ہو جائیں تو پھر گھر سے باہر کی ہنگامہ کو دیکھنا چاہئے۔

مذہبی تنظیم کے لئے بیشک ہر ضلع اور صوبہ میں ایک صدر الاسلام یا شیخ الاسلام کا تقرر ضروری ہے جس کے ماتحت میں تمام مسائل مذہبی اور خصوصیت کے ساتھ فراہمی و صرف ذکوۃ کا انتظام ہو۔ سو اس کے لئے مجلس خلافت کے قیام کی ضرورت نہیں ہے بلکہ از سر نو ایک مذہبی انجمن قائم کرنا لازم ہے۔

مسلم لیگ اس سے زیادہ بے معنی چیز ہے، کیونکہ مذہبی نقطہ نظر سے وہ بیکار محض ہے، اور سیاسیات کے لحاظ سے اس کا کانگریس سے علیحدہ رہنا، گویا مسلمان اور ہندو میں ایک دائمی تفریق کا سبب پیدا کرنا ہے، تبلیغ کے لئے جتنی انجمنیں جہاں قائم ہیں ان سب کا سخت مخالف ہوں اور ایسے اخبارات و رسائل کو میں ملک کا شدید ترین دشمن سمجھتا ہوں جو تبلیغ اسلام کا علم بلند کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے اصولی غلطی مسلمانوں سے یہی ہوئی کہ انھوں نے شدھی اور سنگٹھن کے مسئلہ کو اہمیت دی ان کو صرف سکوت اختیار کرنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ ملک کے بعض افراد ایسے ہیں جو حصول زرادہ جلب منفعت کے لئے ایسی فرصتوں کی جستجو میں رہتے ہیں، اس لئے وہ ایسے زریں موقعہ کو کیونکر ہاتھ سے جانے دیتے انھوں نے ایک ہنگامہ شدھی کے خلاف پیدا کر کے ہندوستان کی سیاسیات میں اس قدر نزاکت پیدا کر دی کہ اب عرصہ تک اس کا ہنہانہا دشوار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شدھی کے مسئلہ کو چھوڑنا ہندوؤں کی زیادتی اور غلطی ہے، لیکن کسی زیادتی یا غلطی کا جواب ہمیشہ غلطی اور زیادتی ہی سے نہیں دیا جاتا۔

کانگریس ہی صحیح منہ میں ایک سیاسی انجمن ایسی ہے جس میں مسلمانوں کو حصہ لینا چاہئے اور پوری قوت کے ساتھ یہ عذر کہ اس میں ہندو زیادہ ہیں اور ان کی اکثریت مسلمانوں کے بہت سے جائز حقوق کو پامال کر دیتی ہے ناقابل قبول ہے کیونکہ اگر آپ جہاں قوت و اکثریت عزم و اہمیت سے اپنے آپ کو برابر کا حصہ دار بنا سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کو خلافت، تبلیغ وغیرہ کے عمل قصوں جھگڑوں سے کہاں فرصت ہے کہ وہ کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں، ارہ گئے ہمارے رہنا اور ہادی، سوان کے متعلق سکوت ہی بہتر ہے کیونکہ اگر آج وہی کسی کام کے ہوتے تو یہ بے راہ روی اور مسلمانوں کے انحطاط کی ”سند افزونی“ کیوں پیدا ہوتی۔

نیاز فوری

قطرہ اشک

ابر ہمارے خیمہ زن دادی کو ہماریں! حسن ازل تھا جلوہ گر منظر سبزہ زار میں
 غنچہ دل ہلکے اٹھا زلف بھر کے عطر سے گلشن ناز تھا نہاں باد صبا کے پیار میں!
 جلوہ حسن مضطرب موج صبا کے عکس میں وحشت عشق بے نقاب امن گل کے تار میں
 شوق کا کردار تھا گم دشت سکوت صبح میں تارنگہ گندہا ہوا ہر کے سرخ ہار میں
 جنبش شہیم ملتفت منظر عام کی طرف! مقصد دل چھپا ہوا جلوہ روتے یار میں
 دیکھا اٹھا کے جب نقاب بخود ہی فروزش کا اور ہی کچھ نظر پڑا انجمن ہمار میں

زلف دوتا کھلی ہوئی، عارض حسن جلوہ ریز ایک پری کھڑی ہوئی مست کسی خمار میں
 چہرہ تھا کچھ اداس سا، آنکھوں میں تھناتھن غم دامن اشک تر ستر گرہ بے قرار میں!
 دیکھ کے ہوشی اڑ گئے یاس کے اس چوم کو اک گل تر، اور اس طرح صورت دنگار میں!
 شوق کی بے حجابیاں، ناز کی بے نیازیاں! ایک ادا تھی پیار کی شرم ستم شعار میں!
 چاک کیا حجاب شرم حیرات انگشتان نے میں نے بڑھایا اک قدم دادی کو ہمار میں
 عرض کیا کہ ”اسے پری! کون تو یہ کہا چال کام ہے تیرا کیا بھلا دامن کو ہمار میں؟“
 اشک میدانِ ابل پڑے چشم الم نواز سے موج حیات آگئی بھر امید و اد میں

بولی صبا ادا کہ میں قطرہ ہوں ایک اشک کا سیکڑوں حسرتیں ہیں دفن ایک مے مزار میں
 میں ہوں ہوا بادش کرم، سبز سے ہی دم کو ہیں جتنی بھی نونہال ہیں گلشنِ قلب زار میں
 مجھ سے ہی فیضیاب ہیں نشہ لبانِ ہر دم غم! میری ہی نے کاہے انوچہ شہم خوار میں

حیف اک تیری آنکھ کا ایک بھی ذہ تم نہیں! سوز نہیں رہا ہے کیا آتش روزگار میں
 کچھ بھی تجھ سے پاس نہ ل، کچھ بھی تجھے خیال نہ سیکڑوں آبلے ہیں خشک پائے دل نگار میں

سیکھ کہیں سے طرز غم، ڈھونڈنے کے لاکھیں سے اشک
لطف نگارہ کچھ نہیں در نہ، حرم یار میں

اتنا کہا اور اڑ گئی، دیکھتے دیکھتے پری،
کچھ بھی نہ تھا پھر اس کے بعد امن کو ہمار میں
سکتے سا جھکو ہو گیا، رہ گیا دل کو تھام کر
تو ت ضبط پھر کہاں دیدہ بیقرار میں
فرط الم سے گر پڑا، مار کے پیچ خاک پر
شعلہ روح چپ گیا برق شرارہ با میں

نظامی بچھرا یونی

بصائر

کسی نے ارسطو سے آکر روز بچھپا
کہ ہو دوست جاہل تو کیا ہے نتیجا
کہا اس نے جاہل ہے خود اپنا دشمن
وہ کیا دوست ہو گا جس میں کیسا

چلا جاتا تھا افلاطوں سر راہ
ہوا اک شخص سائل آکے ناگاہ
کہ زیا کب تک ہے کس حکمت
کہا جب تک ہے نازیا ہا لیت

اک معلم کو یہ بفرط نے دیکھا اکروز
کہ لیاقت پہ ہے اپنی اسے دعوا عظیم
جب پڑھا تھا ہے تو کرتا سلف پر ابراد
ان کے دعوے نہیں کرتا کسی صورت قسیم
بولا بفرط کہ بچوں کا پڑھانا ہے عیش
جب یہ حالت ہے تو مردوں کو نہ دیکھو تعلیم

جب ملے یوسف صدیق سے یعقوب حمز
پھر بھی رہتے اس طرح ملول و غلیں
پوچھا لوگوں نے کہ اب رونے کا باعث کیا؟
اب تو پہلی سی وہ یوسف کی جدائی ہی نہیں
بوسے یعقوب بچھرنے کا تھا رونا پہلے
اب یہ رونا ہے کہ مل کر نہ بچھریا لیں

آسی

طلسم خیال

(۱)

نہ فریب خوردہ آرزو نہ خراب کیفیت نیاز ہوں
نہ ہلاک زہر و فابوں میں نہ شہید خنجر ناز ہوں
مجھے حن و عشق سے کیا غرض کہ بے سود ذوق مجاہد ہوں
ذمجتوں کے لئے ہوں میں نہ عقیدتوں کے لئے ہوں میں
مگر آہنکٹ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہو کیوں ترا

(۲)

مرا عزم دہم سے دور ہے ہے بلند راہ گزرمی
مرا گم ہے عرش سے بھی پرے ہو کسی کو خاک خبرمیری
جسے قدیوں نے سنا نہ تھا اسے دہیتی ہے نظرمیری
میں تجلیوں میں مقیم ہوں مجھے ہوش ہے وہ کلیم ہوں
مگر آہنکٹ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہو کیوں ترا

(۳)

کہیں فلسفی کہیں منطقی کہیں اک طیب لبیب ہوں
مرا لفظ لفظ ہو جاوداں میں وہ لازوال ادیب ہوں
یہ جہاں جس سے بید تر میں بہت ہی اس سے قریب ہوں
میں ”نگار“ عرش کا راز داں میں خدا سے فرش کا راز داں
مگر آہنکٹ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہو کیوں ترا

(۴)

یہ قلم و مسخو بگوں مرے جانے کا مقام ہے
یہ طلوع مہر ضیا نشان مری عظمتوں کا پیام ہے
یہ ستارے اور یہ کائنات مری زندگی کا نظام ہے
مرے دل میں عرش کی عظمتیں ہیں رفیع تر مری وسعتیں
مگر آج کل یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہو کیوں تا

(۵)

میں تہ زمیں سے ہوں آشنا سر آسماں کی خبر مجھے
میں ہر ایک بزم کا راز داں ہے ہر اک جہاں کی خبر مجھے
تری خلوت کا شریک ہوں ترے آسماں کی خبر مجھے
تری محفلوں میں گیا ہوں میں
تری منزلوں میں رہا ہوں میں
مگر آج تک نہ یہ کھل سکا کہ مجھے خیال ہو کیوں تا

روش صدیقی

اسلامی لغت

(مرتبہ سید حامد حسین رضوی علیگ)

جلداول تیار ہو گئی ہے جس میں حرف ”ث“ تک تمام وہ الفاظ
معہ مکمل تشریح و تفسیر کے درج کئے گئے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے
ذہنی اقتصاد و جغرافی تاریخی علمی معاشرتی لٹریچر سے ہر نہایت
ضروری کتاب ہے قیمت علاوہ محصول ڈاک بیکار

لٹنے کا پتہ
مینجر نگار لکھنؤ

صرف چند جلدیں باقی ہیں

اس لئے اگر مکارستان ابھی تک آپ نے ملاحظہ نہیں
فرمایا تو اب سہی۔ دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کے لئے بھی
زمانہ چاہئے۔

حضرت نیاز کے مخصوص ادبی رنگ کے مضامین
کا مجموعہ ہے اس لئے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں قیمت
علاوہ محصول بیکار

لٹنے کا پتہ
مینجر نگار لکھنؤ

عروسی برشکال

موسم گرما سے لب پر جان تھی آئی ہوئی روئے عالم پر تھی بید بہب مردنی جھائی ہوئی
رجح انسانی پر آفت اسکی تھی لائی ہوئی آسماں پر ہر نظر پڑتی تھی لپجائی ہوئی
اضطراب انگیز دنیا کی ہر اک تصویر تھی
ذدے ذدے میں جہاں کے خدا ہنس تفریح تھی

ناگماں دیکھا گیا ابرسید آتا ہوا اس طرح دوش صبا پر بیچ دھم کھاتا ہوا
جس طرح اٹھے کوئی باؤں کو کبھر آتا ہوا آدھ فصل بہاری کی کہ سرج گاتا ہوا
گو ہر اکرم ہر سمت کبھرا نے لگاؤ
موتیوں سے دامن امید بھر جانے لگا

چٹک برق جہندہ باعث فرحت ہوئی لرزش موج نیم صبح سے ہمت ہوئی
تشنگی کی شدتوں سے خلق کو فرحت ہوئی پھر شگفتہ پیکر عالم کی ہر صورت ہوئی
آ، بلائیں تیری بیوں سے عروسی برشکال
اپنی آنکھوں میں جگہ دل دے دس برشکال

مرجھائے ناہن ناظورہ سحر آفریں اُف تری شوخی ترے نقش و رد نہیں
یہ نگاہ مست تیری اور چشم سر لگیں دوش نازک پر ترے کھری ہر ذریعہ نہیں
ہے ترے دامن میں نہاں ایک لیل بہار
صورتِ محنوں نہ کیوں عالم ہوشیدائے بہار

پھر نیم صبح کے دامن کو اک جنبش ہوئی شاخسارِ یاسیں کو پھر ذرہ لرزش ہوئی
لاڑے کوش کے قدموں کو بھی لغزش ہوئی پھول ہے کھل گئیں کلیاں بختش ہوئی
چشم زگرس داہنی تیری ہی جلوہ گئے
کھل گئی منقارِ نیل تیرے نعروں کے لئے

آسماں پر اب نظر آتے ہیں بادل دل کول ہیں نشاطِ اسودہ سارے ڈھٹ کسا ریل
کھل گئے افسردہ دل بھی اس طرح کھول میکدے میں ہو گئے میکش مراعی دہل

پھر پہیوں کی طرف سے صدا آنے لگی
 ”پنی کہاں“ کے بھیس میں باگت آنے لگی
 ادوی ادوی سی گھٹاؤں کا جو ہے آئینہ میں تو کہیں بکھرا ہی جو زلف کوئی ناز نہیں ہو
 ابریں بکلی جپکتی ہے سر پر رخ بریں آہی ہے جھینگروں کی بھی صدا آدنیٹین
 سادوی دریا ہو چکے سرست ریان شباب
 یعنی ہے یل رواں میں جوش طوفان شباب
 آبشاروں کے کناروں پر چو بگلوں کی قطار مرغ آبی کی چہل پر جان آہو ہے نشا
 نغمہ نطرت سے ہیں لبریز سارے کوہ سار جس طرف دیکھو پڑے ہیں سیکڑوں پھولوں کے
 حن کی نیرنگیاں اب عشق کے دہن میں ہیں
 وصل کی ترشاریاں اب اس گلشن میں ہیں
 جاذبِ نفاہ پر کیا توس کی نگیں کہاں سرخوش کیف ترغیمیں طیور خوش بیاں
 بھول سے معشوق ہیں نیت دہ باغ جہاں اپنے جالے میں سناٹا ہی نہیں ہے باغباں
 باصرہ افروز ہیں نیرنگیاں برسات کی
 سلسیل گوش ہیں موسیقیاں برسات کی
 پھرب غنچہ پر لڑاں ہر شمیم جانفزا باندہتا پھر تاپے رنگ گل جہن میں لب ہوا
 نغمہ آبی سے ہے گونجی ہوئی ساری خفا آہی ہے آبشاروں سے ترمم کی صدا
 باد کا خوش کیف سے لبریز ہے جام بہار
 مردہ دل بھی جی اٹھے سن کے پیغام بہار
 رات کو جگنو کی تابش جیسے آوارہ کرن ہائے افشاں کا عالم اتے زلف پشکن
 ہے پاپر نور تارو کی فلک پر انجمن کر چکی لیلک شب زریں قبا پھر زیب تن
 چرخ ستی کی جہیں پھر نور افشاں ہو گئی
 سیل نجم میں شب دیجور پنہاں ہو گئی
 چشمہ دوریا کے ہاتھوں میں جھلکتا جام چو تشنہ کا مان ارادت کے لئے پیغام ہے
 پیسے دسے خوش ہیں جاری آج فیض عام چو استغفار روزِ فردا اک خیال خام ہے
 ابتداء رنگ دلو کی انتہا ہونے کو ہے
 لمحہ میری ہستی کا فٹا ہونے کو ہے

حافظ خستہ جگر ”ماضی“ پر رکھ اپنی نظر
 حال کی رنگینوں کو رہن مستقبل نہ کر
 آنے والا رنگ ہی اک حریف مشروط اگر
 نقطہ موموم پر ہوگا تراکتک گزر
 کل شئی ہا لکٹ اک آخری پیغام ہے
 عالم ایجاد کا انجام کیا انجام ہے

حافظ غازی پوری

نگہ اپنی اپنی

حیات فخر ہے جس کو جناب کہتے ہیں ہم اسکو ایک نمود جناب کہتے ہیں
 علاج تشنہ لبی جسکو آپ سمجھے ہیں ہم اس ظلم کو مروج شراب کہتے ہیں
 نگہ میں آئی کی جو برگ سبز ہے قبلہ ہمارے حلقہ میں اسکو کتاب کہتے ہیں
 رموز میکہ دل جناب کیا جانیں جہان خیال کو جام شراب کہتے ہیں
 جنھیں حضور کے جاری ہیں خانہ خراب انھیں کو ہم توجہ لالت مآب کہتے ہیں
 ہے خلق جسکے تصور لرزہ بر اندام ہم اسکو خلد حقیقت کا باب کہتے ہیں
 عوام چشمہ فطرت نما کہا کریں لیکن آئیں زمان و مکاں کو جناب کہتے ہیں

نگہ بلند و دل ہوشمند میداریم

حقیقت ہم و حقیقت پسند میداریم

آئیں حزیں

غزل

بار بار بجز میرے نہیں آیا کیا جسم کو روح کیا روح کو فریاد کیا
اس نگاہ سے نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا روح کو کشمکش یا اس سے آزاد کیا
اس نے اس حسنِ نسیم کی نگاہیں نہیں سب یہ سمجھے کہ سرِ زم کچھ ارشاد کیا
میں نے کس دن نفسِ غم کو رہائی پہاڑی میں نے کب شکوہ بے مہری صبا کیا
اُس سے پوچھے کوئی سہاز محبت کون جس کے دل کو غم انجام نے برباد کیا
بعد مدت کے خط آیا کسی کا ذوقی خیر انا بھی غنیمت ہے کہ اب آیا کیا

ذوقی

دواخانہ شفا فی نظیر آباد کنو

نکاح اعجاز :- یہ بالکل نئی ایجاد ہے اور جو وہ دن کے استعمال کے بعد ایک شخص کو معلوم ہو جائے کہ حقیقتاً جوانی کس چیز کا نام ہے قیمت عمر **الابچی طلسمی :-** یہ چیز سوائے ہمارے دواخانے کے کہیں نہیں مل سکتی ہاں میں معمولی الابچی کی طرح استعمال ہوتی ہے اور جو وہ دن کے بعد ایک شخص تمام دواؤں سے بے نیاز ہو جائے قیمت اگر آپ مایوس ہو چکے ہیں تو ان کو ملگا کر استعمال کیجئے قیمت عمار **حبوب داؤدی :-** کھانسی، دردِ ضیقِ النفس، بلغمی شکایات کو دور کر کے آواز کو نہایت صاف سرور بنا دیتی ہے سینہ اور پیچھے دل کو نہایت مضبوط بنا دیتی ہے۔ آواز میں صفائی، درد اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے قیمت اگر دیاں تھے منیجر دواخانہ شفا فی کنو

سفوف اعجاز :- صرف نو دن کے استعمال سے تمام ضعیف قوتیں بالکل ترقی طبع پر از سر نو دپس آجاتی ہیں۔ قیمت عمار **حبوب شاہی :-** اس کی ایک گولی کچھ دیر قبل کھائیجئے اور پھر دیکھئے کہ دواؤں میں کیا کیا طلسمی اثر چھپے ہوئے ہیں ششہ ۱۶ گولی قیمت عمار **روحِ اعجاز :-** اگر سفوف اعجاز کے ساتھ ۲۱ دن اس روغن کا بھی استعمال کر لیا جائے تو پھر جو کیفیت پیدا ہوتی وہ قابلِ بیان پر صرف اسی مدفن کا کا بھی استعمال اپنی جگہ کہہ کر حکم لکھتا ہے قیمت عمار **سفوف ناو :-** سفوف خاص وقت میں ایک مرتبہ استعمال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لطف کیفیت سے غشی کی سی قوت آ جاتی ہے قیمت ۱۲

ڈائری کا ایک ورق

(پہلے ما سبق)

اس سے قبل سطح قمر تک پہنچنے کا حال درج ہو چکا ہے۔ اب میں کچھ واقعات و تحریکات وہاں کے بیان کرتا ہوں۔
کرہ ارض میں سنا کرتا تھا کہ وزن نام ہے صرف کشش زمین کا اس لئے اگر کوئی کرہ، زمین سے جھوٹا ہو تو وہاں کشش کی کمی کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بھی کم ہو جائے گا، یعنی اگر کوئی چیز کرہ ارض میں ایک من کی ہے تو چاند میں پہنچنے کے بعد وہ صرف چند سیر کی بجائےگی۔

جہاز پر بھی اس کا کچھ علم ہو گیا تھا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لیکن پوری حقیقت یہاں پہنچنے پر معلوم ہوئی جس وقت ہمارا جہاز، سوشان کے میدان میں اترتا تو اس کی خفت وزن کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ سسندروں کی تمام قوت صرف کرنے پر بھی وہ اس طرح اترتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے لمبندی سے کوئی پتنگ ٹوٹ کر جھپٹ کھاتی ہوئی نیچے اترتی ہے۔

جب ہم سطح قمر پر اتے تو خیال تھا کہ یہاں انسانی آبادی نظر آئے گی اور کچھ اسی قسم کے امتیازات و کھائی دین گے جیسے زمین پر نظر آتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کی حیرت کی انتہاء نہ رہی جب بجائے انسانی آبادی کے وہاں ہمیں ایک خاص قسم کے جانور دیکھے جو شکل و صورت میں تو انسان سے بہت مشابہ تھے لیکن اعضا میں بہت فرق تھا، مثلاً یہ کہ بجائے دو ٹانگوں کی ان کے صرف ایک ٹانگہ تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ خفت وزن کی وجہ سے انھیں اپنا جسم سنبھالنے کے لئے ایک ہی ٹانگہ کافی ہوتی ہے۔ جب یہ مخلوق چلتی ہے وہ اپنی ٹانگہ کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ سارا جسم ایک ستون کی طرح اوپر کی طرف لمبہ ہوتا ہے پھر جس طرف جی چاہتا ہے وہ اوپر ہی اوپر تھرتھرتا ہوا چلا جاتا ہے، لیکن سود و سودم چلنے کے بعد وہ پھر اسی ایک ٹانگہ پر اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کوئی اوپر سے زقند بھر کر نیچے آیا ہو۔ اس لئے یہ مخلوق بالکل جھلاوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
ان کی ٹانگہ گاؤم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک مکڑی کی طرح برابر ہوتی ہے جس میں کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا اور اسے جسم سے علاوہ بھی کر سکتے ہیں۔

یہ ٹانگہ کمر سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور کمر نام ہے صرف ایک بار ایک سی ہڈی کا چونکہ یہاں کی زندگی کے لئے ہوا کی ضرورت نہیں ہے اس لئے پیچھے بڑھی نہیں ہوتا اور غذا کے لئے معدہ بھی نہایت مختصر سا ہے، کیونکہ صرف رقیق چیزوں پر گروہ ہے جن کا فضلہ پسینہ کی راہ سے نکل جاتا ہے اور اسی لئے امعاء وغیرہ بھی نہیں ہے۔ ہوانہ ہونے کی وجہ سے ناک بھی نہاد نہیں اور سخت چیزوں کی غذا نہ بننے کی وجہ سے دانت بھی نہیں ہیں۔ کانوں کے بجائے صرف ایک سودا رخ پینانی پر ہے اور دہن نام ہے ایک مختصر سے شگاف کا جس میں نہ زبان ہے نہ دانت۔ آنکھیں البتہ بجائے دو کے چار ہیں درخشاں ہیں پر اور دو

پشت پر، ہاتھ انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں لیکن نہایت کمزور جنس کا فرق بھی ان میں نظر نہیں آتا اور باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سلسلہ تناسل ان کے ہاں کس طرح قائم ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کارز ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے تمام گفتگو سیٹیول یا اشارات سے ہوتی ہے اور ان کے جسم کے نہرے بال جو جایا کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ گفتگو کے وقت کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھنے والے بر سخت ہیبت طاری ہوتی ہے۔

حبسوت ہمارا جہاز ہونچا تو کثیر تعداد میں یہ جانور جو چاند کی شہرین المخلوقات ہونے کا فخر رکھتے ہیں چاروں طرف آگئے اور لگے اپنے گول گول دیدے پھر کر دیکھنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ لوگ لبٹ جائیں گے اور نوح کرکھا جائیں گے۔ کپتان نے جو یہاں کے حالات سے زیادہ واقف تھا، اُس نے کچھ اشارات کی مدد سے، کچھ سیٹیاں بجا یا کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی اٹھ کر اور طرح طرح کا منہ بنا کر خدا جانے ان سے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے لیکن ہم نے صرف اس قدر محسوس کیا کہ وہ دور ہٹ گئے۔ غالباً اس نے یہی کہا ہو گا کہ یہ لوگ ڈرتے ہیں، ذرا دور ہو جاؤ، ہماری ہمسفر خاتون کی حالت نہایت خراب تھی، انھوں نے اپنے چہرہ چھپا رکھا تھا اور مردوں سے لپٹی جاتی تھیں۔ میں بھی جہاز کے اندر چلا گیا اور دروازے بند کر کے سوچنے لگا کہ کتنی بڑی غلطی یہاں آنے میں کی ہے اور اب بظاہر وہ ایسی کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔

یہاں کی زمین بالکل کروڑ ارض کی طرح ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سبزہ اور درخت کا پتہ نہیں جا بجا اونچی اونچی چٹانیں صاف ہیں جن سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے اور پانی کے اندر، پتھروں پر، چٹانوں کی چوٹیوں پر، نشیب و فراز میں ہر جگہ برف کے بلورات (Crystals) مختلف مہندی شکلوں میں نظر آتے ہیں، جو دور سے ہزاروں کھلے ہوئے سفید پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ میدان جہاں ہمارا جہاز اترا تھا، تختہ گل کے نام سے موسوم تھا، حشرات کا یہاں پتہ نہیں ہے اور نہ جو پائے کہیں نظر آتے ہیں، اظہور میں صرف ایک چیز کثرت پائی جاتی ہے اور اس کو ہم ہندوستان کے چمکا ڈر سے تشبیہ دے سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ چاند کا یہ جانور جسم و قامت میں بہت بڑا ہے اور اس کی پرواز بھی بہت وسیع ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز معنوی حیثیت سے تو یہاں کی اجنبیت تھی اور ظاہری اعتبار سے یہاں کی بڑی ہوتی سردی، آفتاب چمک رہا تھا، لیکن بجائے گرمی کے اور خشکی برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ہاتھ بانوں کی ٹھنڈی کسی طرح نہ جاتی تھی اور ایک ایک منٹ تک مسلسل آگ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

یہاں نہ کوئی بازار ہے نہ کوئی شہر، یہاں کی مخلوق غاروں میں اور پیٹروں کی چوٹیوں پر، جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ آپس میں نہ کوئی خاص احتلاط ہے اور نہ ایسی منافرت ایک ایک غار میں چار چار پانچ کی جگہ ہوتی ہے اور شب روز میں مشکل سے چند گھنٹوں کے لئے باہر نکل کر چٹنوں پر جا کر پانی پی لیتے ہیں اور پھر وہیں جا کر پڑہتے ہیں۔

یہاں کا سب سے زیادہ دلکش مقام ایک تودہ وسیع حصہ سمندر ہے جو بالکل خشک ہو گیا ہے اور جس میں اتنے بڑے بڑے

غار پائے جاتے ہیں کہ آج تک ان کی بھاد نہیں ملی اور نہ یہ پتہ چلا کہ ان کے اندر کیا ہے، دوسری تقریب کی جگہ سمندر کا وہ
بریز حصہ ہے جہاں برف کی ہزاروں چادریں تیرتی پھرتی ہیں اور یہاں کی مخلوق سوار ہو کر ان سے جہازوں کا سا کام
لیتی ہے اس کے اندر ایک خاص قسم کی چھپی بائل چاندی کی سی پائی جاتی ہے۔ اس کا شکار کھانے کی غرض سے نہیں کیا جاتا
بلکہ اس کی چربی نکال کر جلاتے ہیں اور اس کی کھال کو اور ہتے ہیں۔

سہ پہر کو جب ہم لوگوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا، اور اس خیال سے خیموں سے باہر نکلے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی
کیونکہ ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی چھینکے کی طرح طیارہ تھی جس میں چار چار آدمی بچکا ڈرتے ہوئے تھے اور ایک چلانڈا
اسی عجیب الخلق قسم کا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھ کر سخت وحشت زدہ ہوا اور میں نے اسپرٹینے سے اٹھ کر دیکھا، لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ تین چار آدمی ایک
ایک ٹانگ سے کودتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنے اشاروں سیٹیوں، آنکھوں کی گردنوں اور ڈراؤنی مشکلوں سے ایسا
ڈرایا کہ میں بے اختیارانہ اس چھینکے کے اندر گر پڑا اور بچکا ڈر اس کو لیکر اوپر اڑ گئے۔ میں چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا لیکن اس
جاؤریر کوئی اثر نہ تھا، اور میں لٹکا ہوا اوپر تھا میں چلا جا رہا تھا، اگر اطمینان تھا تو صرف اس قدر کہ میرے اور ساتھی بھی اسی
طرح آگے پیچھے چھینکوں میں گھے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

اندازاً دو گھنٹے کے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا کر ٹھہر گئی، میرے
ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آ گئے، یہاں پہلے سے ایک جماعت
ٹوپیاں پہنے ہوئے ہاتھوں میں پتھر کے ٹکڑے اور کوسے لئے موجود تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں کے فرمانروا کے پاس
چارہ تھے اور یہ سب اس کے سپاہی تھے جو ہمارے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔

انھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا اور ہم لوگ کملوں، سمور کے ٹکڑوں میں اپنے ہاتھ منہ پیٹے ہوئے آگے
بڑھے۔ اب شام ہو گئی تھی اور آفتاب کی شعاعیں پہاڑوں کی سفید چوٹیوں، میدانوں کی برفانی بلورات اور دادیوں کی
شفاف چٹیموں پر پڑ کر بیشمار قوس قزح پیدا کر رہی تھیں، یہ منظر یقیناً اس قدر دلکش تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے
تمام مصائب بھول گیا اور میرے ساتھیوں میں سے بھی ہر شخص محو ہو کر رہ گیا۔

چار فرلانگ کے بعد رفتہ ”ہم کو ٹھہر جانا پڑا، کیونکہ یہاں سے اب شاہی محلات کی حدود شروع ہوتے تھے۔ میں نے خدا جانے
دل میں کیا جغرافیہ ان محلات کا قلم کر رکھا تھا، لیکن یہاں پہونچ کر معلوم ہوا کہ شاہی محلات عبارت ہیں صرف ان وسیع
غاردوں سے جو کھود کھود کر پہاڑوں کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ان غاردوں کا سلسلہ اس قدر وسیع و پیمیدہ ہے کہ اچھی خاصی بھول بھلیاں ہو گیا ہے اور اگر کوئی واقف الحال نہ ہو تو پھر ایک
مرتبہ جانے کے بعد یا ہر نہیں نکل سکتا۔ ایک غار کے دہانہ پہونچ کر ہم لوگ ٹھہر گئے اور اندر سے کئی آدمی مشطیں لئے ہوئے

نمودار ہوئے، جو سپاہی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ باہری رہ گئے۔ اب ہم ایک سرنگ کے اندر جا رہے تھے جس کی ہجرت سے سرد پانی کے قطرہ پٹنگ رہے تھے اور سردی کا یہ عالم تھا کہ ہڈی تک میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سرنگ ایک فلاٹنگ کی تھی اس سے نکل کر پھر ہم روشنی میں آئے لیکن اب چٹانوں کا ناتناہی سلسلہ سامنے تھا، اس کے بعد پھر دوسری سرنگ ملی۔ الغرض اسی طرح کے بعد دیگرے پیچ در پیچ سرنگوں اور چٹانوں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹہ کے اندر ہم خاص قعر شاہی تک پہنچے جہاں بہت سی شعلیں روشن تھیں۔ یہ قعر شاہی صرف ایک وسیع دالان سا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک سنگین تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا جس کے جسم پر بہت سی سپیلیاں چبکی ہوئی تھیں اور سر کے تاج میں جو اسی پہلی کی کھال کا تھا بہت سے رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے، اس کی صورت بھی ویسی ہی بھیاں تک تھی یہ اس وقت اپنی ٹانگ الگ کئے ہوئے ایک مضغہ گوشت کی طرح تخت پر پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ قریب پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور اس نے مخصوص اشارات سے ہمارا خیر مقدم ادا کیا تھوڑی دیر کے بعد سنگین پیالوں میں شربت کے قسم سے ایک چیز آئی جس کو ہم لوگوں نے پیا اس کے پینے سے ہم لوگوں کی ساری عینک دور ہو گئی اور سردی کی شدت بھی کم محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ خاص چشمہ شاہی کا پانی تھا جس میں عجیب و غریب اثرات پنہاں ہیں۔

اس بادشاہ کے درباری بھی سب ایک ہی وضع و صورت کے تھے اور اس وقت ان سب کی سیٹیوں اور اشارات نے ایک خاص قسم کا ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

رات کو ہم لوگ یہیں رہے اور ایک غار کے اندر ریکر صبح کرنی پڑی جب دوسرے دن آفتاب بلند ہوا تو پھر بادشاہ کا سلام ہوا اور انھیں سرنگوں سے گزر کر چھینکوں میں بیٹھے اب کی یہ چھینکے زیادہ بلند نہیں گئے بلکہ پہاڑوں کی سطح کے قریب قریب روانہ ہوئے۔ مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ سیر کرتے ہوئے جائیں جب اپنے خیموں کے محاذ میں پہنچے تو یہ چھینکے دفعہ بہت بلند ہو گئے اور ڈراؤرنے آہستہ سے سب بازوؤں میں چڑھنے کے دوپہر جو پٹے ہوئے تھے کسی چیز سے چپکا کر نیچے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد صرف مجھے اتنا ہوش ہے کہ چھینکے سے گرنے کے بعد وہ دفعہ کھلنے شروع ہوئے اور میں طائر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اتارنے لگا، لیکن دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی برداشت نہ کر سکا اور سر جھکاتے جھکاتے دفعہ میں نے ایسا محسوس کیا کہ کسی جٹان سے جا کر ٹکرا گیا ہوں۔

آفتاب بہت بلند ہو چکا تھا اور میری چھوٹی بچی چھوڑ چھوڑ کر مجھے اٹھا رہی تھی، اور سامنے کسی پریمی بیٹی ہوئی مسکرا رہی تھیں، بوجھ رہی تھیں کہ آج سوئے میں تم نے پیچ کیوں ماری۔ میں ان کو دیکھ کر سما جا رہا تھا کہ یہ بھی کہیں انھیں چاند والوں میں سے کوئی نہ ہوں لیکن جب ان کی دونوں آنکھیں، دونوں کان اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم نظر آئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور بولا کہ چاہیوں تو بناؤں کہ کتنی بڑی ہم سر کر کے آیا ہوں۔

نیا زنجپوری

اقتباسات و معلومات

قوت فکر و اجتہاد کی عجوبہ نمایاں

۱۸۶۹ء میں لایک، دن صبح کو، ایک نوجوان خستہ حال، پریشان صورت، نیویارک کے پاول اسٹریٹ میں جو سرمایہ داروں اور دو تہمندوں کا مشہور بازار ہے، نمودار ہوتا ہے اور ٹیلیگراف کمپنی کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کمپنی نے خاص اشارات کمربانی مقرر کر رکھے تھے جن کے ذریعہ سے وہ شہر کے بڑے بڑے تاجروں کو گھر سے گھر ٹی مختلف کمپنیوں کے حصوں اور اطلاق مالی کے بھاد کی اطلاع دے لکھتی تھی۔

یہ نوجوان اندر ایک کونہ میں بیٹھا ہوا نیچر کمپنی سے ملاقات کا انتظار کر رہا تھا کہ دفعہ ”وہ آلہ جس کے ذریعہ سے خبریں پہنچائی جاتی تھیں بیکار ہو گیا۔ دس منٹ نہیں گزرے تھے کہ تاجروں کے سیکڑوں خادم گھبرا کر آگئے اور نیچر بھی پریشان ہو کر اپنے کمرہ سے باہر ہو گیا۔ لیکن اتنی ہی دیر میں یہ نوجوان اس آلہ کے پاس پہنچا کہ اس کے سقم کو معلوم کر چکا تھا۔

جب نیچر اندر داخل ہوا تو اس نے بڑھ کر کہا کہ میں اس کی خبرانی کو دور کر سکتا ہوں۔ نیچر نے خوش ہو کر کہا کہ ”دست کرو“ اور اس نے فوراً پوری ہمارت کے ساتھ اسے کھولا اور جو نقص اس میں پیدا ہو گیا تھا اس کو اسی دقت دور کر دیا۔

نیچر بہت خوش ہوا اور اس کو اندر بلا کر بہت سے سوال کئے۔ جوابات سے وہ بہت خوش ہوا اور ۶۰ گنی ماہوار کے مشاہرہ پر اس کو ملازم رکھ لیا۔

آپ کو معلوم ہے یہ نوجوان کون تھا؟ یہ ٹامس ادیسن تھا جس نے بعد کو برقی قلم، فونوگراف، صورتحار کا آلہ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں ایجاد کیں۔

ادیسن کو کبھی توقع نہ تھی کہ اسے ایسی جگہ ملے گی، وہ بہت خوش ہوا اور اپنے اوقات کا اکثر حصہ تحقیق و تفتیش میں صرف کرنے لگا۔ بیان یہ کہ اس نے اشارات تلفرائی کے چھاپنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ ادیسن اس قدر سادہ مزاج تھا کہ جس دقت کمپنی کے پریسڈنٹ نے اس کو بلایا اور کہا کہ تم کس قیمت میں اپنی ایجادات کو بیچنا چاہتے ہو تو اس نے اپنے جیب میں کہا کہ ایک ہزار گنی کہو گنا اور ۶۰۰ گنی تک دیدو گنا، لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ کہیں یہ رقم بھی زیادہ نہ ہو اس نے جواب دیا کہ ”مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ کمپنی کیا دینا چاہتی ہے تاکہ میں اس پر غور کروں“ پریسڈنٹ نے کہا کہ کمپنی آٹھ ہزار گنی دینے کے لئے تیار ہے۔

ادیسن یہ سکر سخت متحیر ہوا اور سمجھا کہ شاید اس کے کان دھوکا دے رہے ہیں لیکن جب اس کو اس رقم کا چک مل گیا تو اسے یقین ہوا اور اس رقم سے اس نے اور بہت سے آلات خرید کئے اور دوسری ایجادات میں مصروف ہو گیا۔

اُدین کے حالات طفلی بھی بہت دلچسپ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً نہایت جستجو پسند و اہل ہوا تھا۔ جب اس کی عمر ۱۷ سال کی تھی تو کسی نے کان پکڑ کر اس کو اٹھایا جس سے اسے نقل سماعت ہو گیا۔ اُدین کا بیان ہے کہ اس نے قصہ آسکا علاج نہیں کیا کیونکہ وہ اس طرح زیادہ اہمک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور گرد و پیش کا ہنگامہ اس کی فکر کو اپنی طرف

ذولسائین مجمع البحرین - از میر مظفر علی صاحب اسیر
لکھنؤی قیمت ۴۰

کتاب عجائبات دنیا اردو

عجائب المخلوقات - وسیع دنیا کی ہشتا عجیب و غریب چیزیں
جن کو دیکھ کر اور سن کر آدمی نقش بدیوار حیران ہو جاتا ہے اور جس میں
معلومات کا ایک بیشمار ذخیرہ موجود ہے۔ با تصویر رنگیں قیمت
۴۰ با تصویر بلانگ قیمت للہ
ایضاً فارسی با تصویر حسب قیمت بالا۔ للہ
معلم السیاست - ترجمہ پولیشیل اکا بنی
مطلع العجائب - با تصویرات رنگیں۔ اس میں بھی عجائبات
عالم کا ذکر ہے قیمت
مطلع العلوم وجمع الفنون - تمام علوم و فنون کا نہایت وضاحت
اور عمدگی سے ذکر کیا ہے۔ قیمت
عقل و شعور - ایک انسان کے پیرایہ میں تمام علوم کا نہایت
اعلیٰ طریقہ سے ذکر کر دیا ہے اس کو پڑھ کر ایک مبتدی کم و بیش
تمام علوم میں کچھ نہ کچھ دسترس حاصل کر سکتا ہے۔ ۴۰
کارخانہ عالم صنعت و حرفت کے متعلق نہایت لاجواب اور
بہترین کتاب ہے جس میں مختلف صنعتوں پر بحث کی گئی ہے۔ ۴۰

منہج کا پتہ
مینجر نو لکھنؤ پریس صیغہ بکڈ پو لکھنؤ

اردو کے دواوین

دیوان میر حسن - صاحب بدر میر قیمت ۶
انتخاب کلیات ظفر - کلیات ظفر - بہترین انتخاب ۸
کلیات نظیر اکبر آبادی - نہایت عمدہ و صحیح ۴
کلیات صفدر - یعنی کلام صفدر قیمت ۴
دیوان داغ - مشہور و معروف کلام ۴
گلزار داغ - داغ مرحوم کا کلام ۴
کلیات اسمعیل - مولانا اسمعیل میرٹھی کا نہایت عمدہ
اور اعلیٰ کلام ہے قیمت ۴
مرآۃ الغیب - یعنی منشی امیر احمد صاحب کا کلام ۴
کلیات رعب - نہایت اعلیٰ کلام ہے قیمت ۴
صحنہ عشق - منشی امیر احمد بنانی کا دوسرا دیوان ۴
چمن بینظیر - مختلف شعرا کا کلام ۱۲
مثرہ فصاحت - یعنی جناب فصاحت لکھنوی کا کلام ۴
جواں کاسمیرایہ ناز ہے قیمت ۴
دیوان سخن - یعنی کلام خواجہ نضر الدین دہلوی - کاغذ گندہ
قیمت ۱۲
گلدستہ حفیظ اللہ خاں - اس میں متفرق شعرا کا
کلام درج ہے قیمت ۴

منوجہ نہیں کرتا۔

اڈین کا بیان ہے کہ پونے سات بجے میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ پہلے صبح کے اخبار دیکھتا ہوں اور پھر ناشتہ کر کے ٹھیک آٹھ بجے کام میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ روزانہ ہم سے لیکر دس بجے تک ایسے کام ہوتے ہیں جنہیں مجھے ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رات کو میں تمام ان مشاغل کی فہرست مرتب کرتا ہوں جو مجھے دوسرے دن انجام دینے ہوتے ہیں روزانہ مجھے پچاس تجربے علم لکھنا علم الکمبر، نو رو حرارت، آلات معاون وغیرہ کے کرنے پڑتے ہیں۔

پوچھنے والے نے سوال کیا کہ سب سے زیادہ مشکلات کس تجربہ میں اٹھانا پڑیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ سب سے زیادہ زحمت مجھے برقی روشنی کے باب میں اٹھانا پڑی کیونکہ جب میں نے اس تجربہ کو شروع کیا تو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ برقی روشنی جو بھی سکتی ہے یا نہیں اس لئے جب میں اس کے متعلق تجربات شروع کئے تو مجھے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ تجارتی نقطہ نظر سے بھی وہ اس قدر اڑاں ہو سکتی ہے یا نہیں کہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے۔

اڈین کا بیان ہے کہ جب میں نے ارادہ کیا کہ برقی قلم کے اندر کسی بہترین چیز کی جی یا ڈور استعمال کیا جائے تو میں نے ہر قسم کے کونکر پر تجربہ کر کے دیکھا اور جب اس سلسلہ میں مجھے بانس کے ریشہ کا خیال آیا تو میں نے جاپان، جنوبی امریکہ وغیرہ تمام مقامات میں جہاں جہاں بانس پایا جاتا ہے خاص آدمی روانہ کئے تاکہ وہاں سے ہر قسم کے بانس کا نمونہ روانہ کریں اور اس طرح ۶ ہزار نمونے میرے پاس جمع ہو گئے اور میں نے ان سب کا تجربہ کیا یہاں تک کہ ان میں سے ایک بہترین چیز مجھے مل گئی۔ ہر چند اس تجربہ میں بیس ہزار گنی صرف ہوئیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے یہ رقم کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

اڈین کی کامیابی کا راز اس کی موافقت عمل ہے، یعنی جب وہ کسی کام میں لگ جاتا ہے تو پھر اس کو ترک نہیں کرتا جب تک کامیاب نہ ہو جائے اور وہ اس کے پیچھے کھانا پینا اور سونا سب ترک کر دیتا ہے۔

اس کا قول ہے کہ تاریکی اور نیند انسان کی سب سے بڑی دشمن ہیں اور میرا برقی روشنی ایجاد کرنا اسی خیال کی بناء پر تھا کہ اگر اس طرح انسان روزانہ دو گھنٹے بھی زیادہ کام کر سکے گا تو سال میں ۳۷ دن کام کے اور زیادہ مل جائیں گے۔

جب اڈین فوٹو گراف کی ٹیکس میں مشغول تھا تو اس نے ایک گیت کو ۲۵۱۲ مرتبہ سنا یہاں تک کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق ٹھیک ہو گیا۔ اس کا تجربہ جب بعد کو اس نے اپنے عمال کے سپرد کیا تو ان کی یہ حالت تھی کہ ایک ہی گیت سننے سننے ان کو اختلاف سا پیدا ہونے لگا تھا۔ لیکن ان کو ۵۰۰ مرتبہ سننا پڑا اور متواتر بندہ دن اس میں صرف کرنے پڑے اور وہ بھی اس طرح کہ ۴۴ گھنٹے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ سونے کو نہ ملتا تھا۔

اڈین کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے متجاوز ہو گئی ہے اور اب بھی وہ روزانہ ۹ گھنٹے تجربہ گاہ میں اور ۵ گھنٹے اپنے دارالمطالعہ میں صرف کرتا ہے۔

اس وقت وہ ریڈ کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے کیونکہ اگر آئندہ جنگ ہوئی جس کا اس کو یقین ہے تو امریکہ کی موجودہ ریڈ ایک

سال سے زیادہ نہ چلیگی اور دوران جنگ میں باہر سے خام ربڑ کا آنا بند ہو جائیگا پھر سالانہ ۴ لاکھ ٹن ربڑ (جو جنگ میں صرف ہوگی) کہاں سے آئے گی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے وہ ہنری فورڈ اور ہاروی ویسلٹون سے بھی ملا جو اس وقت امریکہ کا سب سے بڑا کاروبار کرنے والا ربڑ کا ہے۔ اڈیسن کا بیان ہے کہ امریکہ میں ربڑ کے درخت اس قدر نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کر کے مطمئن ہو سکیں اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی اور درخت ایسا تلاش کیا جائے جس کے اندر ربڑ کا مادہ پایا جائے اور پھر اس کی کاشت کو وسیع کیا جائے۔

چین و انگلستان | اس وقت ایشیا کے سیاسی مسائل میں چین کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ مغرب کو مشرق کی طرف سے جب کسی چیز نے مضطرب رکھا وہ چین ہی کا زرد خطرہ تھا اور بحالت موجودہ چین کی بیداری بہت کچھ اس خطرہ کو زندہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہندوستان کا جغرافیائی تعلق چین سے اس قدر قریب ہے کہ اس سے زیادہ ہم آہنگی مشکل سے نصیب ہو سکتی ہے، لیکن جہاں ہماری اور غفلتیں ہیں، وہیں ایک یہ بھی ہے کہ نہ ہم اپنے اس ہمسایہ ملک کے حالات سے واقف ہیں اور نہ وہاں کی سیاسیات سے آگاہی رکھتے ہیں۔ آج کی صحبت میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ چین کا تعلق انگلستان سے کب اور کیونکر ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں۔

جو کہ چین میں چینی لوگوں کی آمد و رفت کبھی ممنوع نہ تھی، اس لئے غیر ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات قدیم تاریخوں میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ ۶۳۲ء میں غیاث الدین تغلق شاہ ہندوستان کی طرف سے ابن بطوطہ کا وہاں جانا ثابت ہوتا ہے ابن بطوطہ لکھتا ہے:-

”سلطان غیاث الدین تغلق نے مجھے سفیر بنا کر چین روانہ کیا۔ شاہ چین نے اس سے قبل سلطان غیاث الدین کے پاس ۱۰۰ اونڈیاں اور غلام ۵۰۰، ۵۰۰ تھان کھواب کے، ۵۰ من مشک، پانچ خلعت مرصع بھیج کر سلطان سے اجازت چاہی تھی کہ وہ قراچیل کے نواح میں ایک مندر بنانے کی اجازت دیکرائے“

اس کے بعد ابن بطوطہ نے چین کے حالات لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ: ”چین میں بہت امن ہے اور ایک شخص مع قیمتی سامان کے تنہا سفر کر سکتا ہے اور اس کو کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہر منزل پر ایک کاروانسرا ہے جہاں مسافروں اور انکی سواری کے جانوروں کے قیام کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسافر بعد مغرب ہو چلتا ہے تو یہاں کا حاکم آتا ہے اور مسافروں کے نام لکھ کر سرائے کے دروازہ میں قفل ڈال دیتا ہے اور جلا جاتا ہے۔ صبح کو پھر آتا ہے اور ہر مسافر کو اسم دار بکارتا ہے اور حالات دریافت کر کے ایک محافظ دستہ قافلہ والوں کے ساتھ متعین کرتا ہے جو دوسری منزل تک پہنچاتا ہے اور وہاں کے حاکم کی رسید حاصل کرتا ہے کہ فلاں قافلہ خیریت سے پہنچ گیا۔ اسی طرح اکثر حصہ ملک میں

رواج ہے۔ کاروان سرایوں میں ضرورت کی ہر چیز مہیا ہوتی ہے، خاصکر مرغ اور بٹ تو کثرت سے ملتی ہیں۔
الغرض چین میں غیر ملک والوں کی آمد و رفت زمانہ قدیم سے پائی جاتی ہے البتہ انگلستان سے اس کا سفیرانہ ارتباط
اخیر سو لھوین صدی میں ملکہ الزبتھ کے عہد سے پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد ۱۶۳۷ء میں انگلستان نے چین سے تجارتی تعلقات قائم کرنا چاہے اور ایک بیڑہ کپتان دڈل کی
قیادت میں روانہ کیا۔ یہ بیڑہ جسوقت کنٹن کے بندرگاہ کے قریب پہونچا تو بوگیو کے قلعے سے گئے سرکے گئے، لیکن
انگریزی بیڑہ کی توپوں نے ان کی توپوں کو خاموش کر دیا اور اس طرح یہ بیڑہ کنٹن پہونچا اور وہاں سے شکر اور سوٹھ لیکر
واپس آیا۔ اس کے بعد انگلستان کے بیڑے برابر چین جانے لگے اور ہر مرتبہ ہی زحمت پیدا ہونے لگی آخر کار شاہ چین نے ۱۶۷۲ء
میں انگلستان کو بحری تجارت کی اجازت دیدی اور ۱۶۸۵ء میں ایٹ انڈیا کمپنی نے ایک جہاز روانہ کیا تاکہ کنٹن میں ایک
کارخانہ تجارت قائم کرے اس میں ایٹ انڈیا کمپنی کامیاب تو ہو گئی، لیکن اہل چین ان انگریزوں کے ساتھ جو کنٹن میں سبیلہ
تجارت مقیم تھے، اچھا سلوک نہ کرتے تھے آخر کار ۱۶۹۲ء میں، حکومت انگلستان نے لارڈ مکرتھی کو شاہ چین کے پاس
روانہ کیا تاکہ باہمی تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے اور بلا چین میں انگلستان کا ایک مستقل سفارتخانہ قائم کیا جائے۔
لارڈ مکرتھی کو شاہ چین اپنے حضور میں بار بار تو کیا لیکن کسی سبب کی بنا پر یہ سفارت انگلستان کے کامیاب نہ ہوئی
اس کے بعد ۱۷۱۱ء میں لارڈ امہرسٹ سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ جن کشتیوں میں یہ سفارت پایہ تخت کو لیجائی گئی تھی ان کے جھنڈوں
پر لکھا ہوا تھا کہ یہ سفارت انگلستان کی طرف سے جزیہ لیکر آ رہی ہے، اور جس وقت یہ لوگ پایہ تخت میں پہونچے اسی وقت
حاضری کا حکم ہوا، لیکن چونکہ یہ سفارت کے دسی لباس میں نہ تھا اور اس کے پاس کاغذات بھی نہ تھے اس لئے اس نے
انکار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ناکام واپس آیا۔

اہل چین تجارتی تعلقات قائم کرنا تو پسند کرتے تھے لیکن وہ چاہتے یہ تھے کہ جو سفیر غیر ملکوں کے آئیں وہ اس طرح ملیں
گو یا بہت زیر دست ہیں اور کم از کم انگلستان اسے منظور نہ کرتا تھا۔

رشتہ کی ضرورت

ایک مسلمان (سید) ایم لے ایل ایل بی جو ڈیشل انسر تخواہ دار ۷۰۰ روپیہ عمر ۳۷ سال ایک روشن خیال تعلیم یافتہ سلیقہ مند
خوش مزاج، خوبصورت لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے کسی قومیت یا ذات کی قید نہیں کیونکہ ان اگر کم عندا اشتہر اقام (تم میں
خدا کے بیان عزت والا وہی ہے جو نیک سیرت ہے) فولڈ خط و ذیل کے پتہ سے
پتہ:۔ مولوی سر راج الدین احمد صاحب نمبر ۳۲ نیلی روڈ ڈاکخانہ کٹر شہر الہ آباد

جب لارڈ ہیرچین گیا تو اس نے کنٹن کے حاکم سے ملنا چاہا تاکہ اب کوئی جھگڑا تفویق کا پیدا نہ ہو اور یہ ملاقات دو برابر مروتہ والوں کی سی ملاقات ہو اس ملاقات میں بھی یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ کس کی کمرسی کس طرف رکھی جائے بالآخر ایک گول میز کے گرد کرسیاں بچھا دی گئیں تاکہ صدر اور بائیں کا حصہ ہی باقی نہ رہے۔ لیکن لارڈ ہیرچین مر گیا اور معاملات منقطع رہے، یہاں تک کہ انیون کی مشہور جنگ وقوع میں آئی اور چین کا جہاز انگلستان کے جہاز نے غرق کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین، برطانیہ کو اپنا مسادی سمجھنے لگا اور برطانوی تجارت کو اب کوئی خاص شکایت نہ تھی۔ لیکن چونکہ قوت و جبروت سے حاصل کی ہوئی صلح نفرت و انتقام کے جذبہ کو اور ابھارتی ہے اس لئے چین کی یہ خاموشی بالکل عارضی و اجباری تھی اور اس کے اندر ہمیشہ سے یہ اہلیت موجود تھی کہ وہ کسی وقت اپنی اہمیت کو سمجھے اور اپنی اثرات سے اپنے ملک کو آزاد کرائے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جبکہ وہاں حصول آزادی کے لئے ایک ہنگامہ پہلے، ایک امریکن کا چشم دید بیان قابل توجہ ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ:۔

اب جا کر دنیا کو معلوم ہوا ہے کہ چین بھی زندہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جدید چین، اپنے دماغ اپنے عصاب کی وجہ سے بہت زیادہ قابل التفات ہے۔

وطنیت کی وہ روح جو اصلی مرکز کنٹن میں پیدا ہوئی تھی اس وقت چین کے دو ثلث حصہ پر قابض ہے اور جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب اس مقام پر پہنچ جائیں گے جہاں ۴۰۰ چینی آبادی کو پہنچنا چاہئے۔

چین کی وطن پرست جماعت دوسری قوموں کے ساتھ سیاسی مساوات حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس قدر قوت و عزم کے ساتھ کہ وہ سوئے اپنے کسی اور قوم یا ملک کی رائے سننا ہی نہیں چاہتی اور سارے عالم کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار رہے۔ تنظیم میں وہ اس قدر ذوق سلیم کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس سے قبل چین میں کہیں اس کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ جماعت ملک کی انتہائی جنوب سے پیدا ہوئی اور شمالی ملک والوں سے ان کی معیشت و معاشرت بالکل علیحدہ رہی ہے اور ان پر مغربی انکار اور مغربی تجارت کا بہت اثر ہوا ہے۔

اس تحریک کا اصل بانی سن یات سن تھا کنٹن کے قریب اس کا مکان تھا اور نظراً و مقرطی (Memoirs of Sen Yat Sen) تھا، یہ چاہتا تھا کہ چین کی استبدادی حکومت جمہوریت میں تبدیل کجائے، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں ایک ہنگامہ اُس نے اس قسم کا پیدا کیا لیکن رشوت اور عسکری قوت سے اُسے دبا دیا گیا۔ اس کے بعد سن یات سن نے ۱۹۱۱ء میں بمقام کنٹن ایک مستقل حکومت اپنے نصب العین کے لحاظ سے قائم کی۔ اس کے بعد ۶ سال تک وہ اور زندہ رہا اس دوران میں اس قدر مصائب و تکالیف اس نے برداشت کیں کہ کھل سے اُس کو کامیاب کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی کامیابی اس کو حاصل ہوئی تو یہ کہ اب اس کی موت کے بعد ہر شخص اس کی عزت کرتا ہے۔ اور اس کے بولے ہوئے تحم کو بار آور دیکھنے کا آرزو مند ہے۔ چنانچہ اس وقت کنٹن کی حالت اس امید کی کامیابی کا آئینہ ہے کہ وہاں حزب وطنی

نے جو سن یا ت سن کی نام لیا ہے کیسا معقول انتظام کیا ہے اور چین کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وہاں کا انتظام کیسا مکمل، کس قدر مہذب و ترقی یافتہ نظر آتا ہے۔

اس جماعت میں وہی شخص شریک ہو سکتا ہے جو مقرر اعلیت، وطنیت اور جمہوریت کا حلف اٹھائے اور پڑھنا لکھنا جانتا ہو اس وقت تک اس جماعت میں ایک لاکھ سے زائد افراد داخل ہو چکے ہیں۔ یہی جماعت برطانیہ کی سب سے بڑی دشمن تسلیم کی جاتی ہے۔ اور روس کے اثر سے بڑی حد تک متاثر ہے۔

ہر چند اس وقت تک تمام ملک چین میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ اتنے بڑے ملک میں اس قدر جلد اس کا امکان ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اب یہ تحریک وہاں کامیاب ہو کر رہے گی اور ہندوستان کی طرح اسپر وہ دور نہیں آئے گا جس کیلئے دوبارہ حشر کی ضرورت ہے۔

کائنات کی شعاعیں اور عناصر کی تخلیق

دور کتنا ہی تیز و شدید ہو لیکن ایک باریک سادق کا غذا کا بھی اس کے لئے حجاب ہو جاتا ہے۔

۱۸۹۲ء تک یہ حقیقت مسلمہ عام تھی لیکن ۱۸۹۵ء میں ایک اور شعاع دریافت ہوئی جو نور آفتاب سے زیادہ قوی تھی اور جو گوشت اور لکڑی کے اندر سے بھی نفوذ کر جاتی ہے۔ اس کا نام شعاع رنجنی ہے۔ یہ شعاع باوجود اس قدر قوی ہونے کے سونا، ہڈی اور سیسہ میں بالکل نفوذ نہیں کر سکتی۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ فضا سے ایک اور شعاع اس قیامت کی پیدا ہوتی ہے جو سیسہ کی ۱۷- انچہ کی موٹی تختی سے سے بھی گزر جاتی ہے۔ یعنی یہ شعاع رنجنی شعاع سے ۱۰۰ گنا زیادہ قوی ہے۔

اس شعاع کے دریافت میں ایک جرمنی، ایک امریکی اور دو سوئٹزر لینڈ کے دماغ مشترک تھے۔

یہ شعاعیں نہ صرف فضا، ارض سے باہر بلکہ کنکشاں سے بھی پرے جو فضا ہے وہاں سے آتی ہیں۔ اور اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عمل تکوین اب بھی کائنات میں جاری ہے اور وہ دقیق ذرات جو مادہ کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں اب بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

پروفیسر ملکن کا بیان ہے کہ ماوراء بخوم جو اہر ہڈ و چین اور ہلیم کے چار عناصر بنتے ہیں۔ ان کیسب جو حیات کے لئے ضروری ہے، گلنزیم جو روشن ہو جاتی ہے اور جس کی روشنی میں رات کو تصویریں لی جاتی ہیں سلکون جو ریت اور شیشہ کی ترکیب میں داخل ہے اور جو تھے لوہا۔

امریکہ کی آبادی ایک چولائی کی مردم شماری سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ میں اس وقت ۱۲۰ ملین (۱۲۰ کروڑ) آدمی رہتے ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں یہاں کی آبادی ساڑھے دس کروڑ تھی۔ گزشتہ ۱۰ سال میں بڑے

کروڑ آبادی بڑھ گئی جس کا بڑا سبب وہاں کا محکمہ حفظان صحت ہے جو شہروں کی صفائی اور امراض کے دور کرنے کی تدابیر میں پوری سعی کرتا ہے اور دوسرا سبب وہاں کی ماؤں کا تعلیم یافتہ ہونا ہے جو بچوں کی پرورش کے اصول کو

ہائی ہیں اور ان کی عمر بھی کم ہو چکی ہے۔

کتابیں فلم کی صورت میں ڈاکٹر ہونٹی نے جو برقی کچنی کا مہتم ہے اس نے فلم بنانے کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے تمام کتابیں بجائے کاغذ پر چھپنے کے فلم میں منقوش ہو چکی اور جن کا مطالعہ بجائے

آئینہ کے کان سے ہوا کرے گا۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہو گا کہ وقت کم صرف ہو گا بلکہ دماغ پر بھی زیادہ زور نہ پڑے گا۔

معاذہ کیا گیا ہے کہ ان کتابی فلموں کی قیمت بھی معمولی کتابوں کی قیمت کی طرح ہوگی اور ہر لاسکی دوکان سے مل سکیں گی۔

کپڑے کے ہوائی جہاز اجیرنی کے ایک سائنس دان نے لکڑی اور کپڑے کو مختلف دھاتوں کے پانی میں غسل دیکر فولاد کی طرح مضبوط بنادینے کے کامیاب تجربات دکھائے تھے خیال کیا جاتا ہے کہ دھات کے پانی میں غسل دیئے ہوئے کپڑے کو اب ہوائی جہازوں کی تعمیر میں صرف کیا جائیگا اور اس طرح نہایت مضبوط کپڑے ہوائی جہاز تیار ہونے لگیں گے۔ ان میں بیٹرول رکھنے کے خانوں کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ بنادینے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

گرافوں کے نئے ریکارڈ اگر افسوں کے نئے ریکارڈ تیار ہوئے ہیں جو بہت باریک ہیں اور اس درجہ ملائم ہیں کہ اگر انہیں لیٹ کر افسوں کے نئے ریکارڈ کر کسی ننگی میں رکھ دیا جائے تو انہیں کوئی نقصان نہیں پہونچتا یہ ریکارڈ فروخت کے لئے

باز اریں آنے والے ہیں۔

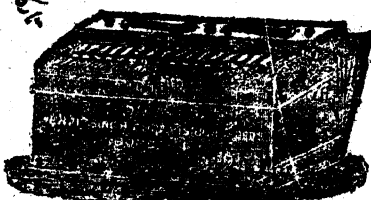
ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے اور یاں اور جبری سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہمیں ایک کارڈ لکھئے۔ ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ادراں ملتا ہے والی ریاست بڑے بڑے دوسا ہمارے ہی یہاں سے مل سکتے ہیں۔

فہرست اردو یا انگریزی کی سنگاگر ملاحظہ فرمائیے ہمارا کارخانہ صداقت کیوجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے۔

المشتر

محمد حسین اینڈ کوٹنٹ مہر چٹا فتح گڑھ (پٹی)



اگر آپ کو ہر قسم کے ایسے دار و نمودار کامیابی جاپ کی زندگی کا ساتھ دیکھیں تو صرف ہم سے خط و کتابت کیجئے۔ ہمارے یہاں کے بڑے بڑے دار و نمودار اس قدر شہر میں سرور کے ہیں کہ کہیں ادھل ہی نہیں سکتے ہر قسم کے ایسے دار و نمودار ملنے ہیں نہایت مختلف ہیں۔ فہرست مفت۔

Chait Singh, Gurba K Singh & Bros.

292 N. Sandhurst Road
Bombay (4)



قواعد رسالہ نگار

- ۱ - رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے
- ۲ - رسالہ پہنچنے کی صورت میں بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت دیا گیا جائیگا
- ۳ - خط و کتابت کے وقت اپنا پتہ فرمادی ضرور لکھئے جس پر فریاداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیے جاتے ہیں
- ۴ - جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا اس کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
- ۵ - مضامین صاف اور خوش خط آنے چاہئیں۔
- ۶ - سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	بڑا صفحہ	نرخہ اشتراکات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	بڑا صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) ہجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	بڑا صفحہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	تین ماہ سے زائد اشتراک دینے والے ان کو کمیشن فیصد کا کٹوتہ دیا جائیگا	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	بڑا صفحہ
				(۳) سیوا و شمار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون پرست کی ایک تہ	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	بڑا صفحہ
					تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	بڑا صفحہ

نگار ایک کنسی لکھنؤ جو تھائی قیمت پیشگی آتی لازم ہے

مردانہ غالب	نہات انش	مولانا شبلی	سفر نامہ و شام	میرزا غالب
۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳
۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸
۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳
۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
۲۹	۳۰	۳۱	۳۲	۳۳
۳۴	۳۵	۳۶	۳۷	۳۸
۳۹	۴۰	۴۱	۴۲	۴۳
۴۴	۴۵	۴۶	۴۷	۴۸
۴۹	۵۰	۵۱	۵۲	۵۳
۵۴	۵۵	۵۶	۵۷	۵۸
۵۹	۶۰	۶۱	۶۲	۶۳
۶۴	۶۵	۶۶	۶۷	۶۸
۶۹	۷۰	۷۱	۷۲	۷۳
۷۴	۷۵	۷۶	۷۷	۷۸
۷۹	۸۰	۸۱	۸۲	۸۳
۸۴	۸۵	۸۶	۸۷	۸۸
۸۹	۹۰	۹۱	۹۲	۹۳
۹۴	۹۵	۹۶	۹۷	۹۸
۹۹	۱۰۰	۱۰۱	۱۰۲	۱۰۳



نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے نمبر میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ ہم ہندوستان سے باہر ملازمہ وصول معہ

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۲۵ء

۸۷	محمود اسرار علی	دین کے مبلغ (نظم)	۲	لاحظات
۸۸	اثر رامپوری	غزلیات :-	۹	من و چرخ المفلک چرخ خیال (فسانہ) مجنوں گورکھپوری
	تبسم نظامی	"	۲۱	فلسفہ مذہب سید مقبول احمد بی بی
	حافظ غازی پوری	"	۲۹	مارغسیم (فسانہ) ملک محمد باقر
	حامد کاکردوی	"	۳۸	غالب نقاب کے حجابات عبدالمالک آروی
	فرخ بنارسی	"	۵۲	صدائے شکست (فسانہ)
۹۰	محمود الد آبادی	"	۵۷	باب المراسلہ والمناظرۃ
			۷۸	باب الاستفسار
			۸۳	اعتراف (نظم) اختر شیرانی
۹۱-۹۲	اقتباسات علیہ		۸۵	فردوسی شہزادی (نظم) مدوش صدیقی

نکار

اڈیسٹریز۔ نیاز فتحپوری

شمار ۴

اکتوبر ۱۹۲۸ء

جلد ۱۳

ملاحظات

گزشتہ مادے کے ملاحظات میں سب سے زیادہ اہمیت جس واقعہ کو میں نے دی تھی وہ لکنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجتماع تھا جس نے ہندو کیٹی رپورٹ پر غور کر کے ایک ایسی صورت پیش کر دی تھی کہ اس پر اتحاد کر کے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق اچھی توقعات قائم ہو سکتی تھیں، لیکن اس اجتماع کا متفرق ہونا تھا کہ مخالفت کی تاوازیں کانوں میں آنے لگیں اور غالباً مولانا شوکت علی کی سیاسی زندگی کا یہ سب سے زیادہ روشن کارنامہ ہو کہ سب سے پہلے انہوں ہی نے اس سے اختلاف کیا اور اختلاف بھی اس قدر اہمیت و اہمیت کے ساتھ کہ نوبت ذاتیات تک پہنچ گئی۔ مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری کی تحریریں جو سوال و جواب کی صورت میں شائع ہو رہی ہیں وہ ناظرین نگار کی نگاہوں سے گزر چکی ہوگی اور اس لئے امرایہ السنزع کو متعین کرنا ان کے لئے بھی دشوار نہ ہوگا۔ سب سے زیادہ قوت اختلاف اس امر پر صرف کی جا رہی ہے کہ پنجاب میں باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی تعداد وہاں زیادہ ہے، کیوں نشستوں کی تعیین نہیں کی گئی اور مخلوط انتخاب کیوں رد کر رکھا گیا۔

مولانا شوکت علی کا پنجاب کے مسئلہ میں اس قدر قوت مخالفت صرف کرنا جبکہ خود اہل پنجاب کی کثیر جماعت اس کو تسلیم کر چکی ہو، اگر اس وجہ سے نہیں کہ ان کو پنجاب خلافت کمیٹی کے ساتھ کچھ ذاتی پختیں اور شکایتیں بھی ہیں تو سخت حیرت کا مقام ہے کہ مولانا شوکت علی ایسا شخص جو اپنے آپ کو نہایت ہی غیر غامض متبع اسلام سمجھتا ہے وہ عہد اسلام کے ان واقعات کو فراموش کر دے جب ایک اور سو

کی نسبت سے بھی مسلمان خائف نہ ہوتا تھا اور آج پنجاب کے مسئلہ میں باوجود ہندوؤں کی اقلیت کے ان سے اس درجہ خائف نظر آئے کہ وقار قوی کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ ہم اس سے قبل کبھی یقین نہ کرتے اگر کوئی شخص یہ خبر دیتا کہ مولانا شاکت علی کے اتنے بڑے تن و توش کے اندر بہت ہی چھوٹا دل ودیعت کیا گیا ہے۔

ایک قوم یا جماعت کی ترقی کا اصلی راز اس کے اندر سعی و جستجو، کاوش و مسابقت کے جذبات پیدا کر دینا ہے، اگر آج کوئی جماعت یہ یقین کرنے کہ وہ اپنے مدعا کو حاصل کر چکی ہے منزل مقصود تک پہنچ گئی ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ کل سرسبز شہر، مدعا اسکے ہاتھ سے چھوٹ جانے والا ہے اور منزل مقصود سے کچھ ہٹ آنا یقینی ہے۔ اگر آج پنجاب اور سندھ کے مسلمان (اس مخصوص مسئلہ میں) مطمئن ہو جائیں گے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے اندر کوئی اہلیت نہ پیدا کر سکیں گے اور ان کی وہ ناقابلیت جو باوجود ان کی کثرت کے، ہندوؤں کی قلیل جماعت کے مقابلہ میں ان کو پنجاب میں رعبہ بر اندام بنائے ہوئے ہے علی حادہ قائم نہ ہوگی اور ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے ان پر بند ہو جائیگا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پنجاب و سندھ میں جہاں مسلمانوں کی کثرت ہے ہندو اپنی قابلیت و وجاہت، اپنی ثروت و دولت کی وجہ سے مسلمانوں کی کثیر آبادی پر بھاری ہیں اور ممکن ہے کہ ان کی اقلیت کے ساتھ ان کی یہ گراں اہمیت مل کر پلہ کو جھکا دے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آج وہاں خلوت انتخاب کو ہٹا کر لمبا آبادی نشہ ستوں کا تعین کر دیا جائے تو کیا اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ ہو سکتا ہے کہ وہاں کے مسلمان بدستور اسی گری ہوئی حالت میں رہیں اور پھر اس کے مقابلہ میں دوسرے صوبہ کے مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جہاں وہ نہ صرف آبادی بلکہ علم و ثروت کے لحاظ سے بھی ہندوؤں سے کم ہیں

ہمارے نزدیک مولانا شاکت علی کی یہ مخالفت بالکل قرین صواب نہیں ہے اور اپنی بے باکی و نااہلی پر ایک مردِ موم ثبت کر دینا جو جس طرح ہندو کبھی اس امر میں کامیاب نہیں ہو سکتے کہ وہ مسلمانوں کی موجودگی میں ایک خاص ہندو حکومت ہندوستان میں قائم کر لیں سیدھا مسلمانوں کی یہ تمنا کہ وہ اپنی اقلیت کو سپر بنا کر ہندوؤں سے تمام اپنے مفید مطلب خواہشات کو تسلیم کرالیں، ناممکن ہے اگر ہندو ترقی کر رہے ہیں، اگر وہ علم و دولت، فہم و فراست، کے لحاظ سے آگے بڑھے جارہے ہیں تو مقابلہ کی ترکیب یہ نہیں ہے کہ ان کا دامن پکڑ کر کھینچے یا کسی اور سے فریاد کیجے کہ خدا کے لئے انہیں روکو آگے نہ بڑھنے دو، بلکہ اس کا واحد ذریعہ یہی ہو سکتا ہے کہ خود جیت کر کے ان تک پہنچو بلکہ ان سے آگے نکل جانے کی سعی کیجئے اور یہ اسی صورت سے ممکن ہے جو جب مسابقت کے لئے محرکات فراہم رہیں، ورنہ مسلمانوں کی اس نیند کا موت میں تبدیل ہو جانا یقینی ہے۔

خود پنجاب میں اس کے متعلق دو گروہ پیدا ہو گئے ہیں اور ان میں باہم جس انداز سے مخالفت ہو رہی ہے وہ اس درجہ شرمناک ہے کہ اس کا ذکر نا بھی خلاف انسانیت ہے جسکو تحقیق کا شوق ہو وہ زمیندار اور انقلاب کے حال کے برحوں کو دیکھ لے۔

مسلمان اخباروں میں دہلی کے ہمدرد نے اپنی روش یقیناً قابل تقلید لکھی اور اگر اس ایک اقتضا حید کو علیحدہ کر دیا جائے جو عبد الماجد صاحب دیا بادی کے شمار میں تھا تو ہم اس کے طریق عمل کو بہت صاف و صلیحانہ جانتے ہیں۔ جناب عبد الماجد صاحب

دریابادی نے ہندو کمیٹی کی رپورٹ پر اسے زنی فرماتے ہوئے اس قدر عجیب و غریب بات لکھی ہے کہ شاید ہی اس کی نظر ”تایج“ تنقید“ میں کہیں مل سکے آپ فرماتے ہیں کہ۔

”ہندو کمیٹی رپورٹ میں کیا کچھ نہیں۔ رعایا کے حقوق، حکومت کے اختیارات، برطانیہ سے تعلق، قانون ساز مجلسوں کی ترکیب، ان

مجلسوں میں مختلف قوموں کا تناسب، طریق انتخاب..... اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر تفصیلی تبصرہ اور تحقیقی فیصلہ“

یعنی یہاں تک تو وہ قسیم کہتے ہیں کہ ہندو کمیٹی رپورٹ ایک بہترین سیاسی دستاویز ہے جس پر ہندو مسلمان اطمینان سے اپنے اپنے متحفظات ثبت کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے بعد ہی جس طرح کوئی بھولا ہوا خواب یاد آجائے، چونکہ کہ فرماتے ہیں کہ:۔

”لیکن اس ۵۰ صفحہ کی کتاب میں شروع سے اخیر تک خدا کا نام نہیں آئے پایا ہے ماریت کی اس نقار خانہ میں قوم کی روحانی

و اخلاقی زندگی کی کہیں بہتک تک نہیں پڑنے پائی ہے۔ حکومت کا اصلی اور اعلیٰ مقصد نامہر حکومت ہی کو رکھا گیا ہے نہ کہ زمین

پر خلافت الہیہ یا خدمت اللہ کو وغیرہ وغیرہ“

اگر عبدالمجید صاحب ایک سیاسی رپورٹ میں خدا کا نام، روحانی و اخلاقی زندگی خلافت الہیہ وغیرہ کی جستجو کرتے ہیں اور یہ باتیں اس میں نہ پا کر چین بے چین ہوتے ہیں تو ہندو کمیٹی رپورٹ والوں کو بھی اسی قسم کی تنقید کا حق حاصل ہے اور وہ بھی ہدایہ، شامی، جلالین، بخاری بلکہ خود قرآن میں یہ جستجو کر سکتے ہیں کہ ان میں کہیں ہندوستان کے متعلق سورج، کھدر، چرخا، کونسل، اسمبلی اور ہندو کمیٹی کا ذکر ہے یا نہیں اور پھر اخیر میں مایوس ہو کر ان کتابوں کے مفید ہونے سے انکار کر سکتے ہیں۔ کاشکے عبدالمجید صاحب خود ہی کوئی الہامی رپورٹ مرتب کرتے تاکہ دنیا کا ہر شخص اسے ”آیت من آیات اللہ“ سمجھ کر قسیم کر لیتا اور جس کی رو سے سیاسی اور سنیا سنی میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔

اسی کے ساتھ قیصر باغ، بٹر پیلےس یعنی ملک کے صاحب ثروت لوگوں کا ذکر انھوں نے جس جن کے ساتھ کیا ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے کیونکہ وہ تو ان کے نزدیک ہمیشہ سے ”طالبہما کلاب“ میں داخل ہیں، اور ایک دولت مند کے مقابل میں غریب آدمی تسکین پر شک و حسد اسی طرح کیا کرتا ہو سچ ہے۔

ہر ہوسنا کے نہ اندجام و سندان باختن

حکومت ہند کے سب سے بڑے ایوان کا اجتماع گزشتہ سیشن میں توئی نقطہ نظر سے کافی کامیاب رہا۔ قانون تحفظ عوام۔

(PUBLIC SAFETY BILL) جناب صدر آئرلینڈ پیل کے فیصلہ کن ووٹ سے ناکامیاب رہا۔ اگرچہ پیل کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو شاید وہ اس قدر جبارت سے کام نہ لیتا اور یہ قانون منظور ہو کر ایک نیا دوازدہ دار و گیر کا کھول دیتا ایک قانون اہل مطالع و صحافت کو شکستہ میں کسے کے لئے پیش ہونے والا تھا، لیکن وہ پیش ہی نہ ہو سکا اور اس طرح یہ بلا پھر چند دنوں کے لئے تل گئی اور اعتبارات سے بھی یہ سیشن کامیاب رہا، کیونکہ صدر اور حکومت کے درمیان جو شرکر رنجی پیدا ہو گئی تھی اس پر حکومت نے

انہما و معذرت کرو کے اس قضیہ کو ختم کر دیا۔ ڈبلی ٹیلی گراف لندن اور ٹائمز آف انڈیا بمبئی کے نامہ نگار نے صدر کی غیر جانبداری کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر انہی نیت پر بھی حملہ کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر نے ان نامہ نگاروں کو پریس گیلری سے علیحدہ کر دیا۔ راکٹر کے ٹائمز نے جس کو اسمبلی کی کارروائیوں کے متعلق ہم سال کا تجربہ ہے، اول الذکر دونوں نمائندوں کی اس نازیبا حرکت کو بہت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور حکومت نے بھی اس باب میں اسمبلی کے صدر سے اتفاق کیا۔

یوپی کونسل کے اجلاس نئی تال کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ سامن کمیشن سے اتحاد عمل کی قرارداد و آخر کار منظور کر ای لی گئی اور سات آدمیوں کی ایک کمیٹی منتخب کی گئی جس میں ہم ہندو، ایک انڈیو اور دو مسلمان ممبرین، مسلمانوں کے دو ممبر خان بہادر حافظ ہدایت حسین اور ڈاکٹر شفاعت احمد خان ہیں۔

اس قرارداد کی منظوری کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب تک تمام قومی جماعتیں پہلے ایوان کونسل سے احتجاجاً باہر نکل نہیں آئیں اس وقت تک یہ تجویز منظور نہ ہو سکی۔ راجہ جگن ناتھ بخش سنگھ نے جو طر عمل اختیار کیا تھا اور جو بڑی حد تک اس طریقہ کی منظوری کا باعث ہوا اس کا انتقام اس طرح لے لیا گیا کہ راجہ صاحب موصوف پر بے اعتمادی کا نوٹس دیدیا گیا اور وزیر مذکورہ کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا۔

ممکن ہے کہ یوپی کی حکومت اور اس کی معاون جماعتیں اپنی اس کامیابی پر مسرور ہوں کہ سائیں کمیشن کا ”یوسف گزشتہ“ اس طرح پھر ماتھ آگیا۔ لیکن اہل نظر اس نوع کی کامیابی کو جس میں حقیقتاً تقارر انسانی کو قربان کرنا پڑتا ہے، بدترین شکست سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

گزشتہ ماہ میں ہم نے میناق کیا لگاکا ذکر کرتے ہوئے دنیا کے مستقبل کے لئے فال نیک بتایا تھا اور خیال تھا کہ شاید اب دنیا چین سے بیٹھ سکے گی، لیکن جب مزید اطلاعات موصول ہوئیں تو معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ حد درجہ ناقص ”تعبیر امن“ ہے۔ ایک طرف اہل مغرب اس کا عہد بھی کرتے ہیں کہ جنگ نہیں کریں گے اور دوسری طرف اسلحہ سازی کو بھی ترقی دیتے جاتے ہیں۔ اگر حقیقتاً جنگ کا محو کر دینا منظور ہوتا تو سب سے پہلے آلات حرب کو دور یا برد کرنا چاہئے تھا۔ اسی کے ساتھ اس میناق میں برطانیہ و فرانس نے یہ عجیب و غریب شرط رکھی ہے کہ وہ اپنے مستعمرات اور زیر اثر علاقوں کو محفوظ اور محکوم رکھنے کے لئے ہر طرح کی دفاعی جنگ کا حق رکھیں گے اور روس پر بھی حملہ کر سکیں گے۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ لندن پیرس کا مقابلہ تو کیسی نہ ہوگا لیکن انگلستان اور فرانس میں باہم جنگ ہو جائے تو کوئی مصالحتہ نہیں کیونکہ یہ دونوں مستعمرات رکھتے ہیں اور مستعمرات کی حفاظت کا حق انہیں حاصل ہی ہے، یا بلافاصلہ دغریوں سمجھئے کہ اگر ہندوستان کو ڈومنینیہم رول مل جائے تو بھی وہ ”استخوان جنگ“ بننے کے حدود سے باہر نہیں ہوتا، یہ ہندوستان کی اہمیت کہ اس وقت دنیا کا کوئی سیاسی معاہدہ ایسا نہیں ہوتا جس میں ہندوستان کے پوزیشن کو فراموش کر دیا جاتا ہو۔ عالم ہمہ افسانہ ما درود و مایج !

افغانستان کا جو ان بخت فرما نردایوں تو ابتداً جلوس ہی سے اپنی روشن خیالی اور حریت فکر و ضمیر کا ثبوت دے رہا تھا، لیکن اب سفر یورپ کے بعد سے جو تیزی اصلاح و ترقی میں صرف ہو رہی ہے اُس نے اس وقت تمام یورپ کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً بہت فکر مند بنا رکھا ہے۔

قومی جرگہ یا (NATIONAL ASSEMBLY) کا قیام، ہر شخص کے لئے فوجی تعلیم کا لازم کردار، ملک کو مسلح کرنے کے لئے ہر متغصن برتن افغانی (کا بلبل سکھ) کا ٹیکس عاید کرنا، حکام کے اقباب موقوف کر دینا، یہاں تک کہ خود بادشاہ کو بھی صرف الفاظ ”جناب من“ (MY DEAR SIR) سے مخاطب کرنا، قدیم افغانی لباس کو مغربی صورت میں تبدیل کرنا، تعداد ازدواج کو ممنوع قرار دینا، پردہ کو اٹھا دینا، ریلوے لائن کا افتتاح، اسلحہ کی خریداری و تیاری، ہوائی جہازوں کی تعمیر، سولویوں اور مذہبی علماء کا اخراج ————— یہ سب وہ روشن علامات ہیں جو بیک وقت افغانستان میں ظاہر ہو رہی ہیں اور اسی کے ساتھ جو ایک خاص بات ان سب سے زیادہ غور طلب ہو رہی ہے کہ کابل میں اس وقت جتنا اثر ماسکو اور بالشویک حکومت کا ہے اتنا لندن اور دہلی کا نہیں۔

برطانیہ نے ہندوستان کی طرح کبھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ مصر میں بھی جمہوریت کے جراثیم پیدا ہو جائیں چنانچہ مرحوم سعد غلoul پاشا جب تک زندہ رہے، برطانیہ کے پہلو میں خارجی کی طرح کھٹکتے رہے کیونکہ ان کی وطن پرستی زیادہ خطرناک حدود تک پہنچ چکی تھی، ان کے بعد جب مصطفیٰ الخاس پاشا دیر ہوئے تو بھی وہی خشن باقی رہی اور آخر کار ملک فواد مجبور ہوئے کہ ان کو معزول کر دین اور محمود پاشا کو رئیس الوزرا مقرر کریں۔

انہوں نے خزان و وزارت ہاتھ میں لیتے ہی پارلیمنٹ کو توڑ دیا، قواعد انتخاب منسوخ کر دئے اور ایک کامل شخصی داستبدادی دور حکومت مصر میں شروع ہو گیا لیکن برطانیہ اور ملک نواد کو غالباً زیادہ عرصہ تک اس حالت پر مسرور رہنے کا موقع نہ ملیگا، کیونکہ اب اہل مصر میں کافی احساس قومی خوداری کا چھوٹا چھوٹا اور یہ ظلم استبداد بغیر ٹوٹے رہ نہیں سکتا۔

غالباً یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ مسلمان بادشاہوں کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ اور ہوا۔ یعنی احمد ز و غوبے جو سکنہ ثلاث کے لقب سے مملکت البانیہ میں تخت نشین ہوئے ہیں۔ ہر چند جمہوریت البانیہ کا مملکت البانیہ میں تبدیل ہو جانا کوئی دل خوش کن خبر نہیں ہے، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اب جبکہ ساری دنیا سے سلطنت شخصی کا اقتدار اٹھتا جا رہا ہے البانیہ کی مس دور حکمرانی کی عمر زیادہ طویل نہیں ہو سکتی اور احمد ز و غوبے جلد صدر کے درجہ پر پہنچ جائیں گے جو یقیناً سلطان کو زیادہ محترم و

کسی قوم کی بیداری کا سب سے بڑا ثبوت اس کی وسعت نظر اور رواداری ہے، اس لئے اگر ایران کی بیداری کی خبریں

آرمی ہی تو حیرت نہ کرنا چاہئے کیونکہ وہاں کی موجودہ حالت کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو وہی رواداری اور وسعت نظر ہے، ایران ایک زمانہ تک اپنی عصبت اور تنگ نظری کی وجہ سے بدنام رہ چکا ہے اور وہاں کی مذہبیت بہت کچھ ترقی کی حامل رہی ہے، مگر اب وہاں بھی نیا دور شروع ہو رہا ہے اور رضا شاہ پہلوی کا یہ کہنا کہ ”اس باغِ خدک پر نہ لڑو جو موجود نہیں بلکہ سرزمینِ ایران کی ترقی کی طرف متوجہ ہو کہ ہمارا باغِ خدک یہی ہے“ ثابت کرتا ہے کہ مولویوں کا اثر وہاں سے بھی اٹھ گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں مذہب کا مفہوم بہت وسیع ہے اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن مولویوں کا تو مذکورہ ہے جنہوں نے مذہب کا مفہوم صرف اپنی شکم پُری قرار دے رہا ہے۔ تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لباس بھی مغربی ہوتا جا رہا ہے اور پردہ اٹھا دیا گیا۔

ترکی کی نہایت تازہ اصلاح جو اس نے اپنے علم و ادب میں کی ہے وہ بجائے عربی حروف کے لاطینی حروف کا اجراء ہے یعنی ترکی زبان لاطینی رسم خط میں لکھی جائے گی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اسلام خطوط و نقوش سے بہت بلند واقع ہوا ہے اور امپیر لاطینی و ترکی، عربی و فارسی جینی دجا پانی کسی خط کا بھی اثر نہیں پڑ سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ اس انقلاب کے اسباب کیا ہیں بظاہر اس امر کا محرک صرف یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ عہد قدیم کی کوئی چیز باقی رکھنا نہیں چاہتے اور اصول ارتقاء کے اس مسئلہ پر عمل کر رہے ہیں کہ تجدید کیلئے پہلے بالکل صفحہ سادہ ہو جائے ضروری ہو، بہر حال سبب یہ ہو یا کوئی اور، ہمارے نزدیک یہ تفسیر کسی طرح مستحسن نہیں ہو سکتا اگر کوئی قوم اپنی قومیت کی خصوصیت کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتی تو اس کو دوسری قوم بنکر ترقی کرنے پر کوئی فخر و ناز بھی نہ ہونا چاہئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب سے جمہوریت البانی نے احمد زوغو کو اپنا فرمانروا تسلیم کیا ہے اس وقت سے مصطفیٰ کمال پاشا صدر جمہوریت ترکی بھی اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور شاید وہ بھی اپنی قیصریت کا اعلان کر دیں کیونکہ ان کے پاس بہت سی درخواستیں ایسی پہنچی ہیں جنہیں خواہشِ خفا ہر گئی ہے کہ سلطنتِ ترکی کو جمہوریت سے نکال کر شخصی سلطنت بنا دیا جائے۔ ہمارے نزدیک اس غیر کاغذی ہونا ویسا ہی مشکوک ہو جیسے اور بہت سی خبریں ترکی کے متعلق غلط نکلتی ہیں کیونکہ باوجود صدر ہونے کے بھی مصطفیٰ کمال پاشا حقیقتاً ترکی کے سلطان ہی ہیں اور ان کو بالکل وہی اختیارات حاصل ہیں جو ایک فرمانروا کو ہوا کرتے ہیں۔ بادشاہ ہونے کے بعد وہ اپنے اختیارات میں کوئی اور اضافہ نہیں کر سکتے۔ رہا یہ امر کہ اس طرح وہ اپنے خاندان میں حکومت کو منتقل کرنا چاہتے ہیں، سو یہ امر مصطفیٰ کمال ایسے روشن دماغ انسان کے پوشیدہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی یا کسی اور مستبد حکمران کی یہ خواہش کس حد تک پوری ہو سکتی ہو جبکہ زمانہ کا سیلاب بڑی سی بڑی مستبد سلطنتوں کی بنیادیں کھوکھلی کئے ڈالتا ہے۔ بہر حال اگر مصطفیٰ کمال نے اس خیال کو عملی صورت دی تو حکومتِ ترکی کا اقتدار بہت گھٹ جائیگا اور ان سلطنتوں کی حمایت وہ ہاتھ سے کو بیٹھے گا جن کا اندیشہ ترکی کی دشمن حکومتوں کو دستِ آزر دہانے کی اجازت نہیں دیتا۔

دہلی کے روزنامہ ہمدرد کا جدید دورانہ صرف ترتیب و ضخامت بلکہ فراہمی مضامین و اخبار کے لحاظ سے بھی بہت اُمید افزا ہے صفحات کا مواد ارجس میں علاوہ تازہ ترین خبروں کے مختصر و محسوس تنقید مسائل حاضرہ اور مضامین خاصہ بھی ہوتے ہیں۔

علی الخصوص ایسی صورت میں کہ مولانا محمد علی اس کو بہت ہی سقیم حالت میں چھوڑ گئے تھے، یقیناً جدید کارکنان ہمدرد کی قابلیت نظم و انتظام کا کافی ثبوت ہو۔ میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کا کوئی اردو روزنامہ ہمدرد سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہو اور اس وقت جبکہ نہ صرف پنجاب بلکہ دہلی میں بھی صحافت کا مقصد صرف غیر شریفانہ انداز تحریر سمجھ لیا گیا ہے، ہمدرد کی یہ تین روش بے انتہا قابل داد ہے۔

معاصر مدینہ کی ادارت میں بھی کچھ تغیر ہوا ہے یعنی اب ہمارے عزیز دوست مولوی نور الرحمن بی لے اڈیسٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اس سے قبل جناب بدر جلالی کے زمانہ میں مدینہ نے کافی ترقی کی اور انشاء کے محاسبے اس نے ابھی شہرت پیدا کی، لیکن جب بڑا نقص اس میں یہ تھا کہ وہ صرف مولانا محمد علی اور ہمدرد کی زبان و حلقوم بنا ہوا تھا اور خود اپنی کوئی رائے نہ رکھتا تھا۔ اس لئے مجھے یہ دیکھ کر سرت ہونے لگا کہ مولوی نور الرحمن صاحب نے آتے ہی سب سے پہلے اس نقص کو دور کیا اور اب معلوم ہونے لگا کہ مدینہ بھی اپنی حیثیت، اپنی رائے، اپنا وجود و معیار علیحدہ رکھتا ہے اور اس کا مدعا صرف ”خاک از تودہ کلاں بردار“ نہیں ہے۔

نگار مشین پریس میں ایک اور نیا رسالہ ”العراقی“ چھپنا شروع ہوا ہے جو لار (گورکھپور) سے شائع ہوتا ہے اس کے اڈیٹر ابوالمعانی علی احمد تقی ہیں، جنہیں تاریخ و انساب اور خصوصیت کے ساتھ اپنی عراقی قوم کی تاریخ پر کافی عبور ہے۔ اس رسالہ کا نام یقیناً ہی ظاہر کرتا ہے کہ وہ صرف عراقی جماعت کے لئے مخصوص ہوگا، لیکن اس کی ترتیب میں ہر طبقہ جماعت کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ میری نگرانی میں شائع ہوتا ہے اور یہ صرف اس لئے کہ اس کے مضامین پر ایک نگاہ میں بھی ڈال لیتا ہوں۔ ورنہ اس کی ملکیت یا اشاعت وغیرہ سے مجھے کوئی تعلق نہیں ہو مگر غالباً مفت ملتا ہے جو حضرات دیکھنا چاہیں وہ منیجر العراقی، لار (گورکھپور) سے طلب کر لیں۔

میں اپنے ان احباب سے عدد درجہ محبوب ہوں جن کی کتابوں کا ریویو اب تک شائع نہیں ہو سکا۔ میں اپنا فرض تو پورا کر چکا ہوں، یعنی ریویو لکھ کر کس میں محفوظ کر لیا ہے، لیکن چونکہ نگار کے صفحات (باوجودیکہ وہ ۹۷ صفحات پر شائع ہوتا ہے) مجھے ہمیشہ کم نظر آتے ہیں یہاں تک کہ ہر ماہ بعض اہم مضامین روک لینا پڑتے ہیں اس لئے اب تک ریویو کے لئے جگہ نہ نکال سکا۔ آئندہ ماہ میں تمام کتابوں کا تبصرہ شائع کر دینا چاہتا ہوں اور وہ اس طرح کہ کچھ صفحات رسالہ میں بڑا دوں۔ امید ہے کہ یہ عذر بہ سہی میں کچھ تخفیف پیدا کر دینگا

مجھے فروری ۱۹۲۵ء اور جولائی ۱۹۲۵ء کے نگار کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی صاحبِ جِد کرنا چاہیں تو منیجر نگار کو لکھیں اور قیمت طے فرمائیں ممنون ہوں گا

مازخیم

(فسانہ)

”ہاں، ہمارے ہاں مختلف قسم کے پردے ہیں۔ بعض خریدار نادانف ہوتے ہیں تو میں اس وقت اُن سے اپنے اس نازد علم کا فائدہ اٹھاتا ہوں۔ اور بعض مشتبہ ہوتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے دوکاندار سے موم بتی کو اس طرح اوپر اٹھایا کہ جس کی تمام روشنی گاہک کے چہرہ پر پڑنے لگی۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”تو اس وقت میں اپنی اس پہچان کا نفع حاصل کرتا ہوں۔“ مازخیم ابھی ابھی دن کی روشنی میں گلی سے آیا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ابھی تک پوری طرح دوکان کی تاریکی سے آشنا نہ ہوئی تھیں۔ اس لئے اِن چھپتے ہوئے الفاظ پر جبکہ موم بتی کا شعلہ اس کی آنکھوں کے قریب آگیا اس نے منہ ایک طرف پھیر لیا۔ دوکاندار ایک نہایت کمزور اور خوفناک ہنسی ہنسا۔ ”تم میرے پاس کمرس کے دن آئے ہو“ اس نے بھر کھنا شروع کر دیا۔ اُس دن جبکہ تم جانتے ہو۔ میں گھر میں اکیلا ہوں۔ دوکان میں نے مذکر رکھی ہے۔ اور یہ اصول بنا رکھا ہے۔ کہ آج کوئی کام نہ ہوگا اس لئے تمہیں اس کا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ تمہیں میرے اس وقت کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو میں نے آج حساب کی پڑال کے لئے مقرر کیا تھا۔ علاوہ ازیں تمہیں اس طرز عمل کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ جو تم نے اس وقت اختیار کیا ہے۔ میں نفیات کا ماہر ہوں اور تم سے کوئی استفسار نہ کر دوں گا۔ مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جب کوئی خریدار مجھ سے آنکھیں میں ملاتا تو اُسے اس کا بھی معاوضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔“ دوکاندار نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ اور پھر اسی کاروباری لہجہ میں مگر طنز آکھنے لگا۔ ”تم حسب معمول بھر بیان کر سکتے ہو۔ کہ تم نے مال کہاں سے پایا۔ کیا اب کی بھی یہ تمہارے مرحوم چچا مرحوم کی الماری سے نکلا ہے؟ اس کو جینوں جمع کرنے کا عجیب شوق تھا۔ یہ کہہ کر پستہ قد، گول مول اور زرد روہ دوکاندار بیچوں کے بل گھڑا ہو گیا۔ اور اپنے سنہری آئینہ کے فریم کے اوپر سے مازخیم کو دیکھنے لگا۔ جس کے چہرہ سے اضطراب ظاہر ہو رہا تھا۔

”اس دفعہ تم غلطی پر ہو“ مازخیم نے کہا ”میں بیچنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ خریدنے کے لئے آیا ہوں۔ میرے پاس اب فروخت کرنے کے لئے نادرات روزگار ختم ہو چکے ہیں۔ اور میرے چچا کی الماری میں چوکھٹا تک باقی نہیں رہا۔ اس دفعہ میرا مدعا صرف ایک دوشیزہ کے لئے کمرس کا تحفہ خریدنا ہے۔ اور واقعی میں تمہارے اوقات میں۔“ حاج ہوا ہوں جس کی میں معافی چاہتا ہوں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ کیونکہ کل غفلت سے یہ کام نہیں ہو سکا۔ اور آج دوپہر کے کھانے پر مجھے یہ تحفہ پیش کرنا ہے اس کے علاوہ تم یہ بھی جانتے ہو۔ کہ ایک امیر لڑکی سے شادی کرنے میں غفلت نہیں برتنی چاہئے۔ ایک سکوت طاری ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوکاندار اس بیان کی صداقت پر غور کر رہا ہے۔ گھڑیوں کی ٹک ٹک اور گاڑیوں کا نرم شور جو قریب کی شاہراہ سے گزر رہی تھیں۔ اس سکوت کے وقفہ کو بھر کر رہا تھا۔

آخر دوکاندار بولا بہتر ہے جناب، آپ میرے پڑانے لگا ہک ہیں۔ اور اگر آپ کے لئے واقعی اچھی شادی کرنے کا موقع ہے تو میں اس میں روڑا نہیں اٹکانا چاہتا، یہ لیجئے۔ یہ خاتون کے لئے نہایت اچھا تحفہ ہے۔ یہ دستی آئینہ، پندہویں صدی کا ہے اور ایک اچھے ذخیرہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ خریداروں کے واسطے دینے والے کا نام محفوظ رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی آپ کی طرح شریف آدمی ہے۔ جو اپنے چچا کی جائداد کا مالک بنا تھا۔

دوکاندار یہ کہتا ہوا آئینہ کو الماری سے اٹھانے کے لئے جھکا۔ اور مارخیم کے بدن میں برقی رو کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ایک لمحہ کے لئے مرتعش ہو گئے۔ اور ہنگامہ خیز جذبات اس کے چہرہ پر آ گئے۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی حالت کو درست کرتے ہوئے آئینہ کو بکرا لیا۔

”آئینہ؟“ اس نے کھانستے ہوئے کہا کیونکہ اس کی آواز گلے میں آ کر رک گئی تھی۔ ”آئینہ؟ کمرس کے لئے؟ ہرگز نہیں“ دوکاندار سے استفسار کیا۔ ”اور کیوں نہیں؟“

مارخیم نے ناقابل بیان انداز میں دوکاندار کو دیکھا اور کہا ”تم مجھ سے بڑھتے ہو کیوں نہیں؟ ذرا اس کو دیکھو اس میں دیکھو اپنے آپ کو دیکھو۔ کیا تم اس کو دیکھنا پسند کرتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ نہ میں اور نہ کوئی اور آدمی پسند کرے گا۔“ دوکاندار نے چونک کر اس طنز کا جواب یا تو میرے خیال میں آپ کے تحفہ کے لئے میری دوکان میں کوئی چیز نہ ملیگی۔

مارخیم بولا ”میں تحفہ کے لئے کوئی معتد جہیز طلب کرتا ہوں وہ تم مجھے یہ دیتے ہو۔ یہ صدیوں کی یادگار۔ گناہوں اور جرموں کی یادگار۔“ دوکاندار نے عجب کی طرح ملاحظہ کیا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ مارخیم مذاق نہیں کرتا تھا بلکہ سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا دوکاندار بولا ”مگر اس سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“

دوسرے نے جواب دیا ”کہ تم کسی سے محبت کرتے ہو نہ کوئی تم سے محبت کرتا ہے؟ تم صرف روپیہ جمع کرنا جانتے ہو اور کچھ نہیں؟ دوکاندار نے ذرا ترش روی سے جواب دیا ”میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا جانتا ہوں“ مگر پھر ذرا ہی لہجہ بدل کر قہقہہ لگایا اور کہا ”دیکھو یہ تمہاری شادی کا معاملہ ہے اور یقیناً اس دوشیزہ کا جام صحت پیئے رہے ہوں گے“

مارخیم نے اُسے روکتے ہوئے تعجب آمیز لہجہ میں پوچھا ”تم نے ہی کسی سے محبت کی ہے؟ مجھے اس کے متعلق بتاؤ“ دوکاندار نے جواب دیا ”میں نے؟ کسی سے محبت کی ہے؟ میرے پاس اتنا وقت ہی نہ تھا۔ اور نہ ان خرافات کے لئے

آج میرے پاس دقت ہے۔ تم آئینہ لو گے یا نہیں؟“

مارخیم نے جواب دیا ”مگر اس میں جلدی کوئی ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر باتیں کرنا نہایت دلخوش کن ہے اور زندگی اتنی قلیل اور محدود ہے کہ میں کسی خوشی کے موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ہمیں چاہئے کہ جو کچھ حاصل ہو سکے وہ حاصل کریں اس لئے گپ میں دقت صرف کرنا سب سے بہتر ہے آؤ ہم ایک دوسرے کے متعلق باتیں کریں۔ اور دوئی کا پردہ اٹھا دیں اور اپنے راز کو کھول دیں۔ ممکن ہے کہ ہم دونوں دوست بن جائیں؟“

دوکاندار نے کہا ”میں صرف یہ کہوں گا کہ یا تو سودا خرید و یا دوکان سے باہر چلے جاؤ“

مازخیم نے جواب دیا ”بالکل درست تو اچھا مجھے کچھ اور دکھاؤ“

دوکاندار ایک دفعہ پھر آئینہ کو دیکھنے کے لئے جھکا۔ مازخیم اس کے قریب ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں

ڈالا۔ اور ایک گہرا سانس لیا اس وقت مختلف قسم کے جذبات اس کے چہرہ سے ظاہر ہو رہے تھے۔

”غالباً یہ تمہارے لئے اچھا رہیگا“ دوکاندار بولا۔ لیکن جب وہ کھڑا ہو رہا تھا تو مازخیم اپنے شکار پر چھپتا۔ خنجر ہوا

میں چھپکا اور دوکاندار کی پشت میں پیوست ہو گیا۔ دوکاندار لڑکھڑا کر گر ا۔ تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو کر رہ گیا۔

مازخیم نفس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کمرے پر ایک خاموشی طاری تھی۔ موسم بتی جل رہی تھی اور وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ نیش

اس وقت تک یہاں رہسکی۔ جب تک کوئی اس کو ڈھونڈ نہ نکلے۔ ڈھونڈھنی جائیگی؟ اور پھر تو کیا یہ مردہ گوشت کا ڈھیر

کوئی ایسی آواز پیدا کرے گا جو تمام انگلستان میں گونج اٹھیں گی؟ اور دنیا کو تقاب کی صداؤں سے بھر دے گی؟

یہ خیالات ابھی اس کے دماغ میں جکڑے ہوئے تھے۔ کہ پہلے ایک۔ پھر دوسری اور پھر تیسری اور پھر اسی طرح مختلف

گھڑیوں نے مختلف رفتار اور آواز سے دن کے تین بجائے۔ اس سنان کمرہ میں ان آوازوں نے اس کو گھبرا دیا اور

اس نے کمرہ میں ٹھلنا شروع کر دیا اُس نے کمرے کے آئینوں میں بہت سے عکس دیکھے جو اسے گھور رہے تھے اس کی آنکھیں ان

عکسوں کو دیکھتیں اور دل کا راز معلوم کرتیں۔ اس کے قدموں کی چاپ کمرے کی خاموشی کو توڑتی اور اسے جبری معلوم ہوتی۔

اور اسی طرح جب وہ ٹھل رہا تھا۔ تو اس کو اپنے طریقہ عمل میں ہزاروں نقص نظر آنے لگے۔ اس کو چاہئے تھا۔ کہ اس سے

زیادہ خاموشی وقت اس کام کے لئے منتخب کرتا۔ اس کو چاہئے تھا کہ جائے واردات سے عدم موجودگی کی شہادت بنالینا

اسی خنجر اس کام کے لئے نہیں استعمال کرنا تھا۔ بلکہ دوکاندار کا گلا گھونٹ کر مار دینا تھا۔ اس کو ذرا زیادہ دیر ہونا

چاہئے تھا۔ اور نوکر کو بھی قتل کر دینا چاہئے تھا۔ غرض کہ اس کو تمام انتظام دوسرے طریقہ پر کرنا چاہئے تھا۔ اس اثنائیں زیادہ

خوفناک خیال اس کے دماغ میں اس طرح جکڑے لگے۔ جس طرح کسی دیران جگہ میں چوہے دوڑتے ہیں۔ سب اسی کے ہاتھ اس کے

کندھے پر پڑیں گے اور اس کا تمام بدن ان کے من سے بکڑی ہوئی چمپلی کی طرح مرتض ہو گا۔ عدالت کا کھڑا قید کی کوٹھری

بھانسی کا تختہ وغیرہ یہ تمام چیزیں سرعت کے ساتھ اس کے دماغ سے گزرنے لگیں۔ اور گلی کے لوگوں کا خوف فوج کی

طرح اس پر محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ انھوں نے اس لڑائی کی آواز مزدور سنی ہوگی۔ اور وہ اب بھی ابطرف

کان لگائے ہوں گے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ تمام دنیا بجائے کمرے کے میزوں کے گرد خاموش بیٹھی ہوئی وہ رسا بن

رہی ہوگی جس سے اُس کو بھانسی دی جانے والی ہو۔ کبھی اس کو خیال آتا کہ وہ آواز پیدا کئے بغیر نہیں چل سکتا اور وہ

بٹھ جاتا۔ کبھی گھڑیوں کی ٹنگ ٹنگ اُسے اتنی ملید معلوم ہوتی کہ وہ کانوں کو بند کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ کبھی کمرے کی خاموشی

اس پر گراں گزرنے لگتی اور وہ زور زور سے اس طرح چلنے لگتا۔ گویا کہ ایک کاروباری آدمی اپنے کام میں مصروف ہو۔

یکایک باہر گئی میں سے ایک پُر مذاق آدمی نے ڈنڈے سے دوکان کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دوکاندار کا نام لیکر پکارا۔ مارخیم کا خون اس کی رگوں میں جم کر رہ گیا اس نے مردہ کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ وہ بالکل چپ تھا اور تمام آوازوں کے لئے اس کے کان بہرے تھے۔ وہ خاموشی کے بحرے بایاں میں ہمیشہ کے لئے غرق ہو چکا تھا۔ اور اس کا جو نام کسی وقت پکارے جانے پر اس کو فوراً متوجہ کرتا تھا۔ اب اس کے لئے ایک بے معنی حقیقت رکھتا تھا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد اس آدمی نے کھٹکھٹانا بند کر دیا اور چلا گیا۔

اب اس کے لئے کام کو ختم کرنے کا موقع تھا۔ اس کے لئے موقع تھا کہ وہ اس نعرے سے دور بھاگ جائے لندن کی میٹرو آبادی میں گم ہو جائے۔ ایک آدمی آچکا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد دوسرے کے آنے کا امکان تھا۔ علاوہ اسکے کام کر چکنے کے بعد اس سے فائدہ نہ اٹھانا محض حماقت پر مبنی تھا۔ اب اس کو دولت کی مزدت تھی جو اس کا منتہا ہے مدعا تھا اور چابیوں کی جو دولت کا وسیلہ تھیں۔

اُس نے نیم دروازہ کی طرف دیکھا جس میں سے روشنی اور راہروں کے سائے سنیا کی فلم کی طرح گزر کر سامنے دیوار پر پڑ رہے تھے اور پھر اُس نے ایک حرکت کی اور مقتول کے نزدیک پہنچ گیا، زندگی کی روح جسم سے مفقود تھی بازو زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ گردن دوہری ہو رہی تھی، مگر بھر بھی مارخیم اس کو چوتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے شانے پکڑ کر لاش کو اٹھایا پیٹھ کے بل لٹا دیا۔ لاش بالکل ٹکی اور نرم تھی۔ بازو اس طرح زمین پر پڑے تھے گویا ٹوٹے ہوئے ہیں۔ چہرہ سے اندرونی جذبہ کی کوئی علامت ہویدانہ تھی مگر موم کی طرح زرد تھا۔ اور اس کی کپٹی خون سے لٹھری ہوئی تھی جو مارخیم کے لئے اذیت دہتی تھی۔ وہ ایک لمحہ کیلئے لاش سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جرم کی نوعیت پر غور کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ یہی ڈھانچہ ہر ایک جذبہ کا حامل تھا اور اب اس کی زندگی کی نشیں اسی طرح قائم کر دی گئی تھی جس طرح کہ ایک گھر ہی ساز گھر ہی کو اٹھکی سے بند کر دیتا ہو۔

آخر کار ان خیالات کو دماغ سے نکال کر اس نے چابیوں کو تلاش کیا۔ اور دوکان کے کھلے دروازہ کی طرف بھاگ کر باہر بارش ہو رہی تھی۔ اور جب مارخیم دروازے کے قریب پہنچا تو اس کو سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پھر ارادہ کو مضبوط کر کے دروازہ کھول دیا۔

مدھم اور دھندلی روشنی فرش پر پڑنے لگی۔ بارش کا شور اتنا زیادہ تھا۔ کہ مارخیم کو اس میں سے مختلف قسم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ قدموں کی چاپ، فاصلہ پر سپا ہیوں کا چلنا۔ روپیہ کے گتے کی آواز مینہ کے گرنے کے ساتھ اسکو سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے یاگل ہو رہا تھا کہ وہ مکان اکیلا نہیں۔ ہر طرف سے اس پر موجودات کا رعب چھایا ہوا تھا۔ وہ دوکان کی اوپر کی منزل پر بہت سے لوگوں کو چلتے سن رہا تھا۔ اور جب وہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا تو اسکے آگے اور قدم بھی نہایت خاموشی سے چڑھ رہے تھے۔ اور پیچھے سے اس کا قاقب کیا جا رہا تھا۔ کیا یہی اچھا ہوتا کہ وہ بہرا ہوتا اور اس ذہنی اذیت سے محفوظ رہتا۔ اس کا سر اس کی گردن پر ہر طرف بار بار حرکت کرتا اور آنکھیں ہر سمت

جلدی جلدی پھرتی۔ سیرڑی کے جوہیں زینے اس کے لئے جوہیں عذاب تھے۔

پہلی منزل پر تین دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جو اس کو تین توپوں کے دہانے نظر آ رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ کاش اپنے گھر کی دیواروں میں محصور ہوتا۔ اور بستر کے اندر تمام کائنات سے علیحدہ ہو کر چھپ جاتا۔ وہ قدرت کے انتقام سے خائف تھا کہ مبادا اس کے جرم کے لئے کوئی شہادت مہیا کر دے یعنی ہو سکتا ہے کہ ٹھوس دیوار میں منور اور شفاف بن کر اس کے جرم کو فاش کر دیں۔ ہو سکتا ہے کہ مضبوط تختے اس کے پاؤں تلے سے نکل جائیں اور اس کو گرفتار کر لیں ان توہمات سے وہ خائف تھا۔ اور درحقیقت یہی اوہام خدا کا انتقام کہلاتا ہے۔ مگر وہ خدا کی طرف سے مطمئن تھا۔ کیونکہ اس کے عذر ایسے تھے جو خدا جانتا تھا۔ اور جو انصاف پر مبنی تھے۔

جب وہ گول کمرہ میں بحفاظت پہنچ گیا۔ اور دروازہ بند کر چکا۔ تو سابق خطرات کے خیال نے اس کو بھر پھر لیا کمرہ سامان آرائش سے خالی تھا۔ فرش ٹوکی نہ تھا۔ تصویروں جو کھٹوں کے بغیر دیوار پر الٹی لٹک رہی تھیں مختلف بوسیدہ الماریاں کمرے میں رکھی ہوئی تھیں۔ مارخیم نے الماری میں ایک ایک کچی لگانا شروع کی۔ یہ نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ دقت گزر رہا تھا اور ہو سکتا تھا کہ الماری خالی ہو۔ مگر اس کی مصروفیت نے اس کو مطمئن رکھا۔ باہر گلی میں مینہ کی آواز اب اسے غیر معمولی معلوم نہ ہو رہی تھی۔ ایک طرف سے پیاؤ کی سرسبز اور دلکش آواز آ رہی تھی، بچے گلی میں دوڑ رہے تھے اور گر جا سے پادری کی لطیف آواز سنائی دے رہی تھی۔

الغرض وہ یوں مصروف بیٹھا ہوا تھا کہ سیرڑیوں پر قدموں کی چارپ سنائی دی۔ اور وہ یکایک گھبرا کر اٹھ بیٹھا اس کا خون رگوں میں منجمد ہو گیا۔ ایک آدمی سیرڑیوں پر چڑھ رہا تھا۔ کھٹ سے دروازہ کی چٹنی کھلی اور پٹا کھل گئے خوف سے مارخیم کام خشک ہو رہا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ کہ آنے والا کون ہے۔ کیا اسی مردہ نے جیلنا شروع کر دیا ہے یا پولیس کے آدمی ہیں۔ یا کوئی اتفاقی گواہ ہے۔ جو اس کو بھانسی پر ٹکانے کے لئے آ رہا ہے۔ مگر جب ایک آدمی دروازے کے اندر داخل ہو کر دوستانہ انداز میں ہنسا۔ اور اندر داخل ہو کر اس نے دروازہ بند کر دیا تو مارخیم کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوا

”کیا آپ نے مجھے یاد فرمایا؟“ اس نے نہایت دلنوش کن لہجہ میں سوال کیا

مارخیم کھرا ہو گیا۔ اور تعجب آمیز انداز میں اس کو دیکھنے لگا۔ شاید اس کی آنکھیں اس کو دھوکا دے رہی تھیں مگر نہیں وہ پوری جسامت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بعض دفعہ اس کو شک ہوئے لگتا کہ وہ کوئی ارضی ہستی نہیں معلوم ہوتی مگر پھر وہ عام آدمیوں کی طرح اس کے روبرو کھڑا تھا۔ اور اس نے پھر عام آدمیوں کی طرح یہ سوال کیا ”کیا آپ دولت تلاش کر رہے ہیں؟“

مارخیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوسرے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا ”میں تمہیں مطلع کرتا ہوں۔ کہ مالک مکان کی ملازمہ اپنے کام سے فارغ ہو چکی ہے، اور جلدی یہاں پہنچ جائیگی۔ اگر تم یہاں پائے گئے تو تم کو اس کا حتمیہ زہ بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہئے“

”تو کیا تم مجھے جانتے ہو؟“ قاتل نے سوال کیا

آنے والے نے ہنستے ہوئے جواب دیا ”آپ مجھے مدت سے عزیز ہیں، اور میری دیرینہ خواہش ہے کہ آپ کی مدد کروں مارخیم چلایا ”تم کون ہو؟..... بے شیطان؟“

دوسرے نے جواب دیا ”میری شخصیت اس خدمت پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ جو میں آپ کے لئے انجام دینے والا ہوں

مارخیم نے جواب دیا ”ڈال سکتی ہو ڈالتی ہو۔ کیا میں تم سے مددوں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تم سے نہیں۔ تم مجھے نہیں جانو خدا کا شکر ہے کہ تم مجھے نہیں جانتے۔“

آنے والے نے جواب دیا ”میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہیں باطن تک جانتا ہوں“

مارخیم چلایا ”مجھے جانتے ہو؟ ایسا کون ہو سکتا ہے میری زندگی خود مجھ پر عیاں نہیں۔ میں ہمیشہ اپنی فطرت کو دھوکا دیتا رہا ہوں

تمام آدمی ایسا کرتے ہیں۔ تمام آدمی اس پردے سے بہتر ہوتے ہیں جس میں وہ بظاہر بیٹے ہوئے نظر آتے ہیں انہیں زندگی ہر طرف کھینچے پھرتی ہے۔ اگر ان کو اپنے آپ پر قابو ہو۔ اور اگر تم ان کے چہرے دیکھ سکو تو تم ان کو مختلف بادگے اور وہ تمام بیغیربزی اور قائد ہوں گے۔ میں گناہوں کا لہو ہوں لیکن میری پاس ان کے لئے نہیں جگہ خدا جانتا ہے، پھر اگر مجھے موقع ملے تو میں سب کچھ ظاہر کر دوں“

”مجھ پر؟ آنے والے نے استفسار کیا۔

قاتل نے جواب دیا ”میرا خیال تھا تم نہایت طباع ہو۔ میں سمجھتا تھا کہ چونکہ تم یہاں موجود ہو اس لئے میرے دل کا

راز سمجھ لو گے۔ مگر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگانا چاہتے ہو!۔ خیال کرو کہ میرے اعمال کیا ہو سکتے ہیں۔ میں دیوؤں میں پیدا ہوا۔ اور دیوؤں میں زندگی بسر کرتا رہا ہوں۔ حالات کے دیوؤں میں اور پھر تم میرا اندازہ میرے اعمال سے لگاتے ہو؟ کیا تم میرا باطن نہیں دیکھ سکتے؟ کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ مجھے گناہ سے نفرت ہے؟ کیا تم میرے صاف ضمیر کو نہیں دیکھ سکتے جس پر گناہ کی سیاہی کا کوئی دھبہ نہیں؟“

جواب ملا ”تم نے اپنے جذبات نہایت اچھی طرح بیان کئے ہیں مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں یہ نکات میری عقل

سے بالاتر ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ کہ تم نے کن حالات کے زیر اثر کیا کیا۔ بہر حال تم راہ راست سے بھٹک رہے ہو مگر

وقت گزر رہا ہے۔ اور مامانے دیر لگا دی ہے۔ مگر وہ قریب آ رہی ہے اور اس کا قریب آنا تمہارے لئے بھانسی کا قریب

آنا ہے۔ کیا میں تمہاری مدد کروں! تمہیں بتاؤں کہ دولت کہاں رکھی ہے؟“

مارخیم نے سوال کیا ”اس کا عوض کیا ہوگا

دوسرے نے جواب دیا ”میں اپنی خدمت کر سمس کے تحفہ کے طور پر پیش کرتا ہوں“

مارخیم بولا ”نہیں میں تمہاری مدد بالکل نہ لوں گا۔ خواہ میں پیاس سے مر جاؤں۔ میں اس جام سے پانی نہیں پیونگا جبکہ تمہارے ہاتھ میرے لبوں کیساتھ لگائیں۔ میں نکار کرنے کی ہمت کو برقرار رکھوں گا خواہ تم اس کا یقین نہ کرو۔ مگر میں کسے دیتا ہوں کہ میں گناہ نہیں کروں گا؟“

آنے والے نے طنزاً کہا ”قرب الموت آدمی کا اپنے گناہ پر افسوس کرنا کوئی بات نہیں۔“
مارخیم نے جواب دیا ”کیونکہ تم اس کے اثر کا یقین نہیں رکھتے۔“

دوسرے نے کہا ”میں اسکو اور زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یعنی جب زندگی ختم ہو جاتی ہے تو میرا کام ختم ہو جاتا ہے۔ آدمی میری خدمت کرنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ مذہب کو خراب کرنے کے لئے اور گھبوں کے کھیت میں کاش بونے کے لئے۔ مگر جب وہ مرنے لگتا ہے تو صرف ایک کام کر سکتا ہے یعنی اپنے گناہوں پر افسوس اور اس طرح مسرور ہونا چاہتا ہے۔ میں جابر ہوں۔ مجھے آزماؤ میری مدد قبول کرو۔ اور اپنی زندگی کے باقی لحاظ ابھی طرح گزارو۔ میں ابھی ایک مرنے والے کے پاس سے آ رہا ہوں۔ اس کا کمرہ دوستوں سے پُر تھا۔ جو اس کے آخری الفاظ سن رہے تھے۔ مگر جب میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا جو رحم کے خلاف حقیقت کی طرح سخت تھا۔ تو وہ منہں رہا تھا۔ کیونکہ اس نے بھی مرنے وقت خدا سے صلح کر لی تھی۔“

مارخیم نے کہا ”اور کیا تم مجھے بھی دیا سہی سمجھتے ہو؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ میرے دل میں گناہ کرنے کے سوا اور کوئی جذبات نہیں؟ میرا دل اس خیال پر اچھل رہا ہے۔ کیا فطرت انسانی کے متعلق تجربے تمہیں یہی سکھایا ہے؟ اور کیا قتل کا عمل اتنا بُرا ہے کہ نیکی کو اس کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برباد کر دیا جائے؟“

دوسرے نے جواب دیا ”قتل میرے لئے کوئی مخصوص گناہ نہیں۔ تمام گناہ اس طرح قتل کے برابر ہیں۔ لیکن میں گناہ کا تعاقب کرتا ہوں اور اس کی تکمیل کے بعد تک اس کو دیکھتا رہتا ہوں۔ میں نیکی کا بھی تعاقب کرتا ہوں اور یہ حقیقت مجھے اب معلوم ہوئی ہے۔ کہ گناہ اور نیکی میں میں ناخن بھر کا فرق نہیں۔ ہر ایک موت کے فرشتہ کے لئے درانتی ہے۔ گناہ جس کے لئے میں زندہ ہوں۔ اعمال میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ضمیر میں۔ مجھے گناہ گار آدمی عزیز ہے نہ کہ گناہ کا عمل جس کے نتائج بعض اوقات کسی پیغمبر کے عمل سے بھی بہتر ہو سکتے ہیں۔ اور میں تمہاری مدد اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ تم نے درکار کو قتل کیا ہے۔ بلکہ تم مارخیم ہو۔“

مارخیم نے جواب دیا ”میں اپنا دل تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔ یہ جرم جو تم نے دیکھا ہے میرا آخری جرم ہے اس سے میں نے کئی سبق حاصل کئے ہیں یہ کہ میں نے جو کام کیا ہے وہ مجھے نہ کرنا چاہئے تھا۔ اس جرم کا سبب میری غربت تھی۔ بعض انسانوں میں ایسے صفات ہوتے ہیں جو ان کو ایسا کام نہیں کرنے دیتیں مگر وہ مجھ میں نہ تھیں میں خوشی کا بھوکا تھا۔ اور اس لئے میں نے یہ کام کیا۔ مگر آج اس جرم کے بعد مجھ میں اور حوصلہ کی طاقت عود کر آئی ہے جو مجھے پھر مارخیم بنا دیگی۔ میں پھر آزاد آدمی ہوں۔ میں اپنے آپ کو تبدیل کیا ہوا پاتا ہوں۔ اب یہ ہاتھ صرف نیکی کے لئے استعمال ہوں گے اور اس نل میں صرف نیکی کا خیال ہوگا۔“

آنے والے نے کہا ”تو تم یہ روپیہ اسٹاک ایک پیچہج پر استعمال کرو گے۔ جہاں تم قبل ازیں کئی ہزار روپیہ ضائع کر چکے ہو۔“
 مارخیم نے کہا ”مگر اس دفعہ منافع یقینی ہے۔“
 دوسرے نے کہا ”مگر اس دفعہ تم پھر ضائع کر دو گے۔“
 مارخیم بولا ”مگر نصف میں اپنے پاس رکھوں گا۔“
 جواب ملا ”تم وہ بھی ضائع کر دو گے۔“

مارخیم کی پیشانی پر پسینہ کے سفید سفید قطرات چمکنے لگے ”تو بھڑکیا ہوا“ وہ بولا ”فرض کرو میں سب کچھ ضائع کر دوں گا۔ نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ میں پھر بیخۂ افلاس میں گرفتار ہو جاؤں گا اور دوبارہ پھر وہی کوشش ہوگی۔ حتیٰ کہ میں بہتر ہو جاؤں گا مجھ میں نیکی اور بدی دونوں کا مادہ موجود ہے۔ جو کہ مجھے دونوں طرف کشاں کشاں لئے پھرتا ہے۔ میں ایک چیز کی محبت نہیں کرتا بلکہ سب کی، میں غریب پر ترس رکھتا ہوں اور کسی امیر کی مخلصانہ ہنسی کو رد کرتا ہوں۔ اور اس کو دل سے چاہتا ہوں کیا تمہارا خیال ہے کہ میری زندگی کی ناخوشہ صرف میری بد طبیعتی ہے؟ اور کیا میری صفات حسنہ ہمیشہ خوابیدہ رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہیں؟ تمہیں ہرگز نہیں۔“

آنے والے نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا ”مگر تم کو دنیا میں آئے ہوئے چھتیس سال ہو چکے ہیں۔ اور میں نے دیکھا ہے کہ انقلاب زمانہ کے ساتھ تم دن بدن گر رہے ہو چندہ سال ہوئے جب تم چوری کے نام سے گھبراتے تھے۔ تین سال ہوئے تم قتل کے نام سے کانپ جاتے تھے۔ مگر اب کوئی ایسا جرم یا کوئی ایسا کمینہ فعل ہے جس سے تمہیں خوف معلوم ہوتا ہو؟ تم دن بدن نیچے اور نیچے کی طرف جا رہے ہو اور تمہاری اس رجعت کو موت کے سوا کوئی نہیں روک سکتا۔“
 مارخیم بولا ”یہ بالکل صحیح۔ میں نے کسی حد تک بدی کا ساتھ دیا ہے۔ اور ہر ایک انسان ایسا کرتا ہے۔ بڑے بڑے اچھے آدمی ماحول کے زیر اثر ایسا کرتے ہیں۔“

دوسرے نے روکتے ہوئے کہا ”میں تم سے ایک سوال کرتا ہوں۔ جس کے جواب پر میں تمہارے اخلاق کی کیفیت بتا دوں گا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم کسی گناہ میں کامیاب ہو کر اپنے آپ کو سدھار سکے ہو؟“
 ”کسی گناہ میں!“ مارخیم نے مضطرب لہجہ میں دہرایا ”تمہیں میں ہر دفعہ نیچے ہی نیچے جاتا رہا ہوں۔“
 دوسرے نے جواب دیا ”تو پھر قتل رکھو۔ تم کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اور تمہارے خیالات کبھی عملی جامہ نہیں پہن سکتے۔“
 مارخیم دیر تک خاموش کھڑا رہا حتیٰ کہ آنے والے نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا ”تو پھر کیا مارخیم بولا“
 ”اور عزت؟“

دوسرے نے جواب دیا ”کیا تم اس کو بارہا پہلے نہیں آنا چکے؟ تین سال گزرے جبکہ میں نے تم کو گرجا میں اقرار گناہ کرتے ہوئے تلافی کے لئے دعا مانگتے دیکھا تھا۔ کیا یہی تمہاری آواز سب سے زیادہ بلند نہیں تھی؟“

اس موقع پر دروازہ کی گھنٹی بجی اور آنے والے نے فوراً اوصاف انداز بدلتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا ”ماما بس آگئی ہو۔ جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے اطلاع دی تھی کہ وہ آنے والی ہے۔ اب تمہارے لئے ایک اور راستہ کھلا ہے۔ اور وہ یہ کہ تم ماما کو اندر داخل کرو۔ اور کہو کہ اس کا مالک بیمار ہے۔ دیکھو کسی طرح کا خوف یا اضطراب تمہارے چہرہ سے ظاہر نہ ہونے پائے۔ اور جب لڑکی اندر داخل ہو جائے۔ تو پھر اس کے ساتھ اسی عمارت تمامہ کے ساتھ جی سلوک کرو۔ جو اس کے مالک کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اس طرح سے تمہارا آخری خطرہ ختم ہو جائیگا۔ اس کے بعد تم اپنی خوشی کو دوکان لوٹ سکتے ہو۔ یہ خطرہ کے پردہ میں تمہارے لئے مدد ہے۔ جلدی کرو“ وہ چلایا ”دوست جلدی کرو۔ تمہاری زندگی اس وقت ترازو کے بلبرٹوں میں تل رہی ہے۔ جلدو کرو اور اسپر عمل کرو“

ماخیم نے نہایت نرمی سے جواب دیا ”اگر میری قیمت میں بڑے کام کرنا ہی لکھے ہیں تو کوئی کام نہ کرونگا جو جیسا کہ تم کہتے ہو۔ کبھی میں جھوٹے سے جھوٹا رزبل کام کرنے کے لئے طیار ہو جاتا تھا۔ مگر اب ان سب سے مخلصی پانے کے لئے میں کچھ نہ کرونگا۔ مجھ میں گونگی کی محبت فنا ہو چکی ہے مگر ابھی تک بدی کی نفرت زائل نہیں ہوئی“

آنے والے کی ہنست میں نمایاں تبدیلی ہونے لگی۔ اس کے نقوش مدہم پڑ گئے۔ اور آہستہ آہستہ وہ غائب ہو گیا۔ مگر ماخیم نے اسے دیکھنے یا اسپر سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی کیونکہ وہ کچھ سوچتا ہوا فوراً نیچے اتر گیا۔ جہاں نعش کے قریب موم جلی رہی تھی۔ دوکان پر ایک مہیبت ناک سکوت طاری تھا۔ وہ رکا اور مختلف خیالات اس کے دماغ میں جکر بگڑنے لگے۔ اتنے میں پھر گھنٹی بڑے زور سے بجی۔

اس نے ہنستے ہوئے ماما کا خیر مقدم کیا اور بولا ”بہتر ہوگا کہ تم پوس کو بلا لاؤ کیونکہ میں نے تمہارے مالک کو قتل کر دیا ہے“

ملک محمد باقر

(اسٹینوس)

دیوان میر حسن	صاحب بدرنیر	۶
انتخاب کلیات ظفر	بہترین انتخاب	۸
کلیات نظیر اکبر آبادی	نہایت عمدہ صحیح	عمر
کلیات صفدر	یعنی کلام صفدر	عمر
دان داغ	داغ مرحوم کا کلام	عمر
گلزار داغ	مشہور و معروف کلام	عمر
مرآۃ الغیب	یعنی مفتی امیر احمد صاحب مینائی کا کلام	عمر
کلیات رغب	نہایت اعلیٰ کلام ہے	عمر
صنعت خانہ عشق	مفتی امیر احمد صاحب مینائی کا دوسرا دیوان	عمر
چمن بینظیر	مختلف شعر کا کلام	۱۲
ثمرہ فصاحت	یعنی جناب فصاحت اکٹونی کا دہ کلام	عمر
مینجر نگار پرہیز نظیر آباد لکھنؤ	جو کا سرمایہ ناز ہے	عمر

”غالب بے نقاب“ کے حجابات

اور جناب ”آرگس“ کے تنقیدی مغالطات

بست بہ خندہ مرا می کشد چه بد بختم
کہ داد و خوس اہل بخت من میخارا

لب یار کی جنبش میں میجائی، تبسم میں دلربائی، ادب لطیف کی یہ نازک خیالیاں سا کرتا تھا لیکن درد دل رکھنے والے خندہ یار میں جکی میجائی کے وہ مقرب بھی ہیں، اجل کا سامان پارہے ہیں، نہیں معلوم یہ خندہ، خندہ استہزا ہے، یا خندہ طنز، جو کچھ بھی ہو لیکن اس میں شاعر کے لئے ہلاکت اور بربادی کا سامان ضرور موجود ہے۔

شیراز کا ایک نوجوان بلکہ جوان مرگ، دسویں صدی میں یہ تخیل عالم کے سامنے پیش کرتا ہو، دوسو برس گزرنے کے بعد، غالب نے عرفی کی اس نزاکت ذوق پر، توجہ کی ہو یا نہ ہو، لیکن، چودھویں صدی میں یہ شعر غالب کی طرف سے ایک قریاد کی صورت میں ضرور پیش کیا جاسکتا ہو۔ کیوں اور کیسے؟ سطور ذیل اس کا جواب ہیں۔

جناب آرگس کی طبعی لطافت، آپ کی کثرت مطالعہ، آپ کا ذوق کاوش ”ہنگار“ کے ارباب مطالعہ سے مزید تعارف کا محتاج نہیں، ساتھ ہی یہ بھی اعتراف ہو کہ جناب ممدوح، کسی نہ کسی انقلاب انگیز تنقیدی نظریہ پر اپنی علمی کوششوں کی بھینٹ چڑھ چکی جدوجہد کیا کرتے ہیں، اس شورش میں ملک وطن کا کوئی طبقہ، مدح و تحقیر کا ہدیہ پیش کرتا ہو اور کوئی سب و شتم کا، میں ان دونوں سے جدا گوشہ عزلت میں بیٹھا جناب آرگس کی اس ہنگامہ رانی کا بعض اوقات سرور آفریں، لیکن اکثر ”ظفارہ“ ملال آگین ”کرتا ہوں، آج بے اختیار غالب کا یہ شعر در زبان ہو، ۵

خون ہر دل خاک میں احوال بتان پڑتی ان کے ناخن ہوئے محتاج خاتیر کبید

افسوس جو فیاض عاشق، ناخن یار کی محتاجی خاطر، گوشہ لمحہ میں خون بہانکی متار کرتا ہو، اب زمانہ کی شورش، یا ارباب علم کی مخالفتانہ تنقید پر جسے ”ناخن خاشدہ“ سے زیادہ تعبیر نہیں کر سکتے، قبر کے اندر خون بہائے یا نہ بہائے، لیکن اس کے جذبہ دل کی سحر آفرینی قلوب پر اثر کر چکی، اور ارباب نظر و فکر جانتے ہیں کہ مرزا کی ہستی، اس الزام سے کس قدر پاک تھی، جناب آرگس کا مضمون ”غالب بے نقاب“ جو فروری سہ ماہی کے شمار میں شائع ہوا ہو، اور جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش

کی گئی ہو کہ غالب نے مقدمین کے کلام سے اکثر سرقہ کی حد تک فائدہ اٹھایا۔ ارباب علم و ادب کی نگاہ سے گزر چکا ہے اور بعض حضرات نے اس پر تنقید بھی کی ہو، لیکن جس طرح جناب آرگس کا مضمون عصیت سے خالی نہ تھا اسی طرح اس کا جواب بھی معقول نہیں لکھا گیا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں جناب آرگس کے خیالات پر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالی جائے۔ لیکن چونکہ تنقیدی مضامین، اکثر ناخوشگوارانہ تعلق کا باعث ہو جایا کرتے ہیں۔ اس لئے سب سے پہلے جناب آرگس سے اپنی ناموزونیت طبع کے چند نشتر کی معافی چاہوں گا، میں ایک طالب علم ہوں، اور مجھے اپنی علمی زندگی کے مرحلہ اول میں ہی میں تنقیدی خیالات کی ترجمانی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ جان اسٹوارٹ بلیک، جو ڈنیرالونیورسٹی میں یونانی زبان کا پروفیسر تھا، اپنی عالمانہ تصنیف ”تربیت نفسی“ (سلف کلچر) میں لکھتا ہے: ”سب سے بڑی چیز جو ایک نوجوان کے لئے، تربیت میں ہو سکتی ہو، وہ اس کا ذوق تنقید ہے یہ مسئلہ ایک تجربہ کار تصنیف العمر شخص کے لئے موزوں ہے، لیکن ایک دانشمند نوجوان سے اس کا وقوع بالکل بے محل ہے۔“ تاہم میں یہ ناروا حبارات کرتا ہوں۔ اور ”چشم عفو میرا دم“

جناب آرگس ایک جگہ فرماتے ہیں، مگر تعجب کی کوئی انتہا نہیں ہوتی، جب دیکھتے والا دیکھتا ہے کہ اس دنیا کے اکثر جیسے، ستارے، اور اس بحر ناپید انکار کے بہت سے موتی حاصل دریوزہ گری ہیں، دوسری جگہ فرماتے ہیں ”میری تہذیب مضمون سے جو کچھ مطلب نکالا جاسکتا ہے وہی ہے کہ میں غالب کے شعر دل کو بھی حد سرقہ میں لانا چاہتا ہوں، ہرگز نہیں میرا مقصد یہ نہیں ہے،“ تیسری جگہ لکھتے ہیں ”یہ دیکھ کہ غالب کے یہاں بہت سے مضامین دوسروں کے یہاں سے لئے گئے ہیں ایک مبصر کی نظر سے پہلے سرقہ اور توارد کی بحث پر جاتی ہو؟“

میں نہیں کہہ سکتا کہ سطور بالا میں کس حد تک مغالطہ منطقی سے کام لیا گیا ہو جو چیز ”حاصل دریوزہ گری“ اور ”ستارے“ اور دریوزہ گر، اور مستعیر نے اسے اپنی جائزہ حاصل کردہ ملکیت بتائی ہو، تو اسے صریح سرقہ نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟ اب فاضل مضمون نگار کی یہ نکتہ سنجی کہ ”تیس حد سرقہ میں لانا نہیں چاہتا“ بالکل بے معنی سی بات معلوم ہوتی ہے، میں میں یونان کے مشہور خطیب سوفکلس کے الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ ”اگر کلام غالب حاصل دریوزہ گری، اور ”ستارے“ ہے تو شاعر پر الزام سرقہ صحیح، اور اگر سرقہ نہیں ہے (جیسا کہ فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں) تو اس کے لئے حاصل دریوزہ گری“ اور ”ستارے“ کے ناموزوں مصطلحات بھی فضول ہیں۔ ارباب فکر ”حاصل دریوزہ گری“ ستارے اور سرقہ کے مترادف سے انکار نہیں کر سکتے، جناب آرگس نے تو ارد اور سرقہ کی نامکمل بحث پیدا کر کے، غالب پر مخفی طور سے الزام سرقہ لگانے میں جس ناکام کوشش سے کام لیا ہے اس کا علم بادی تامل شخص کو ہو سکتا ہے کیونکہ خود انہیں کے بیان سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ غالب کے کلام میں تو ارد زیادہ ہے اور یہ کوئی عیب نہیں ہے اس لئے نظام الدین احمد بن محمد صالح صدیقی لکھنوی، کے ”مجمع الصنائع“ کا قلمی نسخہ موجود ہے، جو بلاغت شاعری کے متعلق فارسی زبان میں لکھا ہوا صدی کی مستند تصنیف ہے، اس نے تو ارد اور سرقہ کے متعلق مکمل اور شفیق بخش بحث کی ہے، تو ارد کے متعلق لکھتے ہیں، ”حکم بہ اخذ سرقہ نہ باید نمود، تا معلوم نہ بود کہ شاعر دوم از شاعر اول بردہ، و در ہنگام انشاء شعر اور ابہ خاطر داشتہ، والامی

تواندہ ہو کہ از قبیل تواریخ طربا باشد، یعنی بہ ذہن شاعر اول خطور کند، چہب اتفاق بہ ذہن این ہم خطور کردہ باشد“ اس کے بعد مصنف نے تواریخ کی مختلف مثالیں پیش کی ہیں، جن کے متعلق بعد میں تفصیل سے بحث کروں گا۔

سب سے پہلے مجھے بتانا ہو کہ سرقت کی کتنی قسمیں ہیں، اور یہ کہ جب کلام غالب کو تواریخ کے احاطہ میں نہیں لایا جاتا، تو حاصل درپورہ گری کہنا، الزام سرقت لگانے کے بالکل برابر ہے۔

بحث سرقت سرقت شعر ہے کہ کوئی شاعر دوسرے شاعر کے شعر یا مضمون کو اپنی طرف منسوب کرے، اگر دو شاعروں کا کلام عام معنی میں متوارد ہو۔ مثلاً خدا کی تشبیہ گل سے، اور قد کی تشبیہ سرو سے، تو یہ سرقت نہیں، مصطلحات شاعری میں سرقت جسے کہتے ہیں، اس کی دو قسمیں ہیں، سرقت ظاہر، اور سرقت غیر ظاہر، اور ان میں سے ہر ایک کی تین قسمیں ہیں،

سرقت ظاہری کی پہلی قسم یہ ہے کہ کسی کا شعر اس طرح اپنی طرف منسوب کر لیا جائے، کہ نہ تو اس میں لفظی و معنوی تغیر ہو، نہ ترتیبی، سرقت کے اس طریق کو نسخ اور انتحال سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ صاحب مجمع الصنائع لکھتے ہیں ”در سند ہزار و نچاہ و شش ہجری“..... کمرترین با پدر بزرگوار در رکاب بادشاہ ہزارہ عالی مقدار مراد بخش جہان و جانیان بودیم، شبے در بلخ بہ مجلس مذکور شعری شد، مولانا عبد اللہ نام جو انے، ایں دو بیت حسن رفیع را بے بیج تغیر بنام خود خواندہ سبزہ از ترنگان من سرش دابی گرفت رنگس از چشم ترم تعلیم بے خوابی گرفت

نقد شک لابز در از مردم چشم رہ بود گراو گروم کہ باج از مردم آبی گرفت سرقت ظاہر کی دوسری قسم یہ ہے کہ دوسرے کا شعر تمام و کمال لے لیا جائے، یا اس کے بعض الفاظ لے جائیں اور بعض الفاظ کے بجائے دوسرے الفاظ لے آئے جائیں :-

میر معزی کہتے ہیں :-

مردم بہ شہر خوش ندارد بے خطر گوہر بکان خوش ندارد بے ہما

حکیم نوری کہتے ہیں :-

بہ شہر خوش دروں بے خطر بود مردم بکان خوش دروں بے ہما بود گوہر

سرقت ظاہری کی تیسری قسم یہ ہے کہ شعر کا مفہوم لے لیا جائے، اور الفاظ بالکل بدل دے جائیں، چنانچہ دہری فرماتے ہیں :- من نگویم کہ ابرمانندی کہ نہ نیک آید از خرد مندی ادہی بخشد ادہی گرید تو ہی بخشی ادہی خندی مولانا محمود خوارزمی کہتے ہیں :-

گفتن کہ دست تست بہ دقت سخا سحاب حصیت در نہایت ایجاز و اختصار

اوگرید و چغف دہر چند قطسیرہ تو خندی وہ لطف کنی بدل بیشمار

سرقت ظاہر کے اسی اخیر طریق کو ”انارہ“ اور ”سخ“ سے تعبیر کرتے ہیں۔

سرقہ غیر ظاہر کی پہلی قسم یہ ہے کہ مضمون شعر مشابہ ہو، چنانچہ عربی میں حریر کہتا ہے
فلا یمنعک اذیاب لبحاھم
سواى ذوالعمامہ والخنار

ابن طیب کہتے ہیں
ومن فی کفہ منہم قتات
اسی طرح فارسی میں رودکی کا یہ شعر ہے
ہر کہ باعنت گزشت از روزگار
ہیج ناموز و زامسیج آموزگار

ابو شکر کہتا ہے

مگر پیش پیش آیدت روزگار کہ بہ زد نیابی تو آموزگار
سرقہ غیر ظاہر کی دوسری قسم یہ ہے کہ کسی کے شعر کا مضمون لیکر اسے دوسرے معنی اور لباس میں پیش کیا جائے مختاری کہتا ہے
کجا خدائے زقبائے دریدہ و خوشتر
کنو باید جہش دریدہ و دخت قبا
صنی نیشاپوری نے اسی کو مدحہ لباس میں یوں پیش کیا ہے

بہ عہد خدمت در گاہ توبہ ہر طرے
بسا ملوک کہ از تاج می زند کمر
سرقہ غیر ظاہر کی تیسری قسم یہ ہے کہ شاعر کسی شعر کے معنی کو الٹ دے، اور اس کے خلاف ظاہر کرے، چنانچہ امیر معزی
کہتے ہیں

آن زلف مشکبار بران روئے چون بہار
شب در بہار میل کند سولے کو تھی
گر کوہ است کو تھی از دے، عجب مدار
آن زلف چون شب آمد و آن طعجون بہا

امیر خسرو فرماتے ہیں

اوست نور و زمن و چون قندش جعبہ پائے
ارباب بلاغت کے نزدیک سرقہ غیر ظاہر کی اکثر قسمیں مقبول ہیں، اور سرقہ کے مجموعہ اقسام میں اگر دوسرا شعر، غزبت، اور
حسن ترکیب میں پہلے شعر سے بڑھا ہو تو متقدمین کے تحنیل اور حسن بیان پر یہ معنی آفرینی علم بلاغت کے نزدیک بجائے
خود مقبول و حسن ہو، چنانچہ صاحب مجمع العنائے فرماتے ہیں ”مجموع اقسام سرقہ اگر شعر دوم بہتر باشد از اول مد سلامت، غزبت و حسن
ترکیب آن مقبول و احسن می شمارند“ چنانچہ اس کی مثال میں مصنف حکیم ازرقی کا یہ شعر پیش کرتے ہیں
صدف زہیم پلاں در شود بہ کام تنگ
زخون بر نایب اوقیت کردہ لال
لیکن حکیم انوری نے اسی کو ایک غریب اور دلکش اسلوب سے یوں کہا ہے
تھر تو گر طلا یہ بدر یا ہر دشود
در دانہ محکم حلق صدف دانہ انار

اور اگر لطافت دیا کی رنگیں دوسرا شعر پہلے شعر کے برابر بھی ہو، جب بھی مذموم نہیں، چنانچہ فرخی فرماتے ہیں ۵

بہ گفتگوی سرودیت در میانہ قبا بروئے گفتی ماہست بر نہادہ کلاہ
چوں ماہ بود، چوں سرود، نہادہ بود، سرود مکر نہ بند و سرود، دکھ ندارد ماہ

اسی کے مقابلہ میں رشید دطواط کا یہ قطعہ پیش کیا جاتا ہے ۵

بہ ماہ و سرود از انت نمی کنم تشبہ کہ این سخن بہر عاقلان خطا باشد
توئی چو ماہ اگر ماہ را کلاہ بودے توئی چو سرود، اگر سرور اقبابا باشد

اور اگر کسی کا شعر متقدمین میں سے کسی کے شعر سے نفاست کلام، حسن ادا، اور علو تخیل میں گھٹا ہوا ہو تو یہ بلاغت میں معیوب ہے۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ آیا غالب کے اشعار متقدمین کے اشعار سے کم درجہ میں ہیں یا بڑا برابر اور بڑھے ہوئے ہیں جناب آرگس نے جتنے اشعار مثال میں پیش کئے ہیں ان میں کوئی شعر متقدمین کے اشعار سے گرا ہوا نہیں معلوم ہوتا، اگر برابر ہے تو یہ بلاغت میں معیوب نہیں، اور اگر بڑھا ہوا ہے، تو کوئی اعتراض نہیں۔

ایک اور امر قابلِ گزارش ہے، وہ یہ کہ میری جانکاہی اور کہ و کاوش کے بعد بھی کہیں جناب آرگس ایک مختصر جملہ میں عذر نہ کریں کہ میں نے دعویٰ ہی نہیں کیا کہ غالب کے اشعار میں سرقہ ہے، میں نے جناب ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوردی مرحوم کے اس نظریہ کی تردید کی تھی کہ ”مرزا غالب کا ہر خیال اسی کا خیال ہے، اور کہیں سے مستعار نہیں“ مگر جناب آرگس کا یہ عذر مقبول نہ ہوگا، چونکہ انکو ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب مرحوم کے بیان پر رد و قدح کرنا چاہئے تھا۔ نہ کہ کلام غالب کو احاطہ تو اس سے الگ کرنا اور حاصل ”ریوزہ گرمی“ کا الزام لگانا سئلے جناب آرگس کو کسی طرح گریز کا موقع ہی نہیں، پس اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کلام غالب میں سرقہ ہے، تو کیا انوری، خسرو، رضی، ابو شکور تھامی، اکابر شعرائے ایران و ہند کے کلام میں سرقہ ہے؟ آپ کہیں گے ان کے کلام میں سرقہ نہیں تو ارد ہے۔ میں کہتا ہوں، آپ غالب کے اشعار کو بھی تو ارد کے احاطہ میں کیوں نہیں لاتے مگر آپ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ اس صورت میں ”مستعار“ اور ”حاصل در ریوزہ گرمی“ کا جو الزام آپ نے لگایا ہے، وہ بے معنی ہو جائیگا۔

آپ نے تو ارد کے مسئلہ بیان میں یہ بھی لکھا ہے کہ باوجود تلاش کے بھی کوئی ایسا مضمون نہ ملیگا، جو دو شاعروں کے **توارد** یہاں متوارد ہو۔ اور معروف و مشہور نہ ہو،؟ میں کہتا ہوں تو ارد کے لئے یہ تخصیص کیسی؟ تو ارد کی مثال میں بچا سول اشعار ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو مضامین و الفاظ کے اعتبار سے دو شاعروں (بلکہ متعدد شعرا) کے یہاں متوارد ہیں اور پھر بھی معروف نہیں، جناب آرگس کا اول یہ دعویٰ ہی بے بنیاد ہے چونکہ نہ تو کوئی ایسی جامع کتاب موجود ہے، جس میں تمام شعراء متوارد کلام جمع کر دئے گئے ہوں، اور نہ معروف کئے جانے کے لئے کوئی کلیہ ہے اسلئے اگر معروف سے یہی مطلب ہے کہ عام بڑھے لکھے لوگ جانتے ہوں، تو میں سوال کرتا ہوں، امثلہ بالا میں، انوری، خسرو، رضی وغیرہ کے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ فیصدی کتنے عام خواندہ اصحاب کو یاد یا معلوم ہیں، اگر معلوم نہیں ہیں تو انہیں آپ تو ارد کہیں گے یا سرقہ؟ پس یہ بات ثابت

ہو گئی کہ توارد کے لئے معروف و مشہور ہونا لازمی نہیں؛

اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ غالب کا جتنا کلام آپ نے متقدمین کے کلام سے ملتا ہوا قرار دیا ہے، وہ توارد اور صرف توارد کا نتیجہ ہے۔ کمال الدین اسماعیل فرماتے ہیں ۵

مگر توارد خاطر کہ در مجازی آن نہ مکن است کہ کس معترض خود بروس
دوراءد کہ بہا ہے روند یک سمت عجب نہ باشد اگر ادفتد بے دپے

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو شاعر طبع آزمائی کرتے ہیں، اور ان کے خیال میں ایسا توارد ہوتا ہے، کہ جو مضمون پیدا ہوتا ہے، وہ معنی اور الفاظ دونوں اعتبار سے باہم مل جاتا ہے، چنانچہ اس قسم کا ایک واقعہ خلاصۃ الاخبار میں موجود ہے۔ ایک بار میر نظام الدین نے امرتسلطان احمد سمرقندی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا، اور اصلاح کے لئے میر نظام الدین علی شیر کے پاس لائے، موصوف نے کسی قدر غور و فکر کے بعد کہا، کہ جو بیت ممدوح کے نام پر مشتمل ہے اس کے بعد دوسرا بیت چاہئے تاکہ کلام میں ربط پیدا ہو جائے، میر نظام الدین نے التماس کی کہ آپ ہی کہہ دیجئے، علی شیر نے جواب دیا تم بھی فکر کرو، میں بھی غور کرتا ہوں دونوں کاغذ، قلم، دو ات لیکر بیٹھ گئے، محو طری دیر میں دونوں نے ایک ایک بیت کہا، اور لکھ کر ایک دوسرے کو دیا، دیکھتے ہیں تو دونوں میں ایک لفظ کا بھی فرق نہ تھا وہ بیت یہ ہے، ۵

بہار باغ جوانی، ہمال گلشن عدل گل ریاض کرم، سرود جو مبارقا

صاحب مجمع الصنائع، میر محمد باقر نامی ایک شخص کا بیان نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے، میرے چچانے ایک غزل کہی تھی، دس سال کے بعد میں نے شیخ فیضی کے دیوان میں اس غزل کا مطلع بعینہ لکھا دیکھا، وہ مطلع یہ ہے ۵
عالم ز آس دیدہ ماتم گرفتہ است طوفان اشک باست کہ عالم گرفتہ است

توارد و سرقہ کی نسبت | توارد اور سرقہ میں امتیاز، خود شاعر کی زندگی کے واقعات سے ہو سکتا ہے، جب ایک عامی شخص ایک شعر کہتا ہے، اگر نفاست اور حسن ادا کے لحاظ سے یہ کسی مقدم شاعر سے مل جاتا ہے، تو اس پر سرقہ

کا الزام لگا سکتے ہیں، لیکن ایسا ہی شعر جب حکیم انوری، حکیم ارزقی کے مقابلہ میں، اور خسرو، امیر معری کے مقابلہ میں کہتے ہیں، تو اس پر بلاغت اسے سرقہ کی بجائے توارد سے تعبیر کرتے ہیں، پس معلوم ہوا سرقہ اور توارد دونوں اعتباری اصطلاحات ہیں جنہیں سخن گو فریبوں کے واقعات زندگی، ان کے مایہ علم، اور رتبہ شاعری کے لحاظ سے چسپاں کیا جا سکتا ہے۔

اب یہاں غالب کی زندگی پر ایک مختصر تبصرہ کی ضرورت ہے، تیرہویں صدی میں ذوق، غالب، مومن ہندوستان کے شعراء بالکمال ہونے کے ساتھ ہی، فضلائے عصر بھی تھے، چنانچہ جب انگریزی حکومت کو کالج کے لئے ایک فارسی دان علامہ کی ضرورت ہوتی ہے تو ارباب انتخاب کی نظر میں غالب اور مومن ہی برپڑتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، عوام میں غالب کی علمی استعداد متعارف اور مسلمہ تھی۔

اسی طرح غالب ایسا غور، اور وحدت پسند دل لیکر آیا تھا، کہ ۳۴ء میں جب ایک شخص متخلص بہ اسد کا حال سنا، تو فوراً اسد متخلص ترک کر دیا، اور غالب ”اختیار کیا، سرقہ تو کجا، غالب کو تو ارد پر بھی طیش آجاتا تھا چنانچہ خود کہتے ہیں ۵

مہر گمان تو ارد، یقین شناس کہ درد متاع من ز بہان نمانہ ازل بردہ است

جناب آؤ گئے نے غالب کے اس دعویٰ سخن آفرینی پر، نشر طنز سے کام لیا ہو، لیکن حق تو یہ ہو کہ مرزا کو اپنی طباعی کا کافی احساس تھا۔ وہ متقدمین یا معاصرین سے تو ارد کے خیال پر بھی چل جاتے تھے، اگر کلام غالب ”حاصل دریوزہ گری“ اور مستعار ہوتا، تو مرزا کے دماغ سے اس شورش وحدت پسندی کا اظہار نہ ہو سکتا، غالب کے تخیل کا علو، بیان کی لطافت، طرز انفا کی بلاغت، اسلوب استدلال کی نفاست، اگر شعرائے متقدمین کے ہاں سے مستعار، اور حاصل دریوزہ گری ہوتی تو ایک لطیف نمبر سے یا ممکن تھا کہ خود تو اردوں سے سیراب ہوتا اور انہیں کو نہا نمانہ ازل کا چرکتا یہ زبردست ادعا صاف بتا رہا ہو کہ شاعر کو اپنی ذات، اور دماغ پر کس کمال درجہ کا اعتماد تھا، اس خود اعتمادی سے جو کچھ نتیجہ نکالا جاسکتا ہو وہ یہی ہو کہ غالب کے خیالات — حاصل دریوزہ گری نہیں، اگر وہ مضامین دوسروں سے مستعار لیتے، تو ارد متقدمین پر وہ فخر کرتے، اپنا یہ کمال دکھاتے کہ میرا تخیل متقدمین سے مل جاتا ہے، جذبہ احترام کا اظہار رکھتے، نہا نمانہ ازل کا چرکتا نہا صاف ظاہر کر رہا ہو کہ اُس نے مضامین کی بھیک نہیں لی، ایسی حالت میں کہ وہ دوسروں سے مضامین مستعار لیتے، ان کے اندر اتنی جرات کہاں کہ اس بے باکی سے متو ارد کلام کو اپنا متلع اولیٰ سمجھتے اور پھر دوسرے شعر کو ”دزد“ سے تعبیر کرتے، اس قسم کا تخیل بیش کرنا تو کجا ایسا ایک ہلکا سا خیال بھی انہیں ”ایم“ سلی، ”اوگل“ کے نظریہ نفسیاتی کے مطابق، روح فرساکشیات میں مبتلا رکھتا، نفسیاتی تحقیق یہی بتاتی ہو کہ غالب سارق مضامین نہ تھے۔ انھوں نے متقدمین سے بھیک لیکر دعویٰ سخن آفرینی کیا، لیکن اردوں کے یہاں اسی قسم کا تخیل موجود ہونا مرزا کے قابو کی بات نہ تھی،

۱۵ اہلستان کا مشہور نفسی ایم سی داؤگل اپنی مقبول زبان کتاب ”نفیات جناب“ (سوشل سائکالوجی) میں لکھتا ہو ”افسوساً Remembrance“ ”تھیر ہے، ایک مرکب جذبی کیفیت سے، جو ایک ترقی یافتہ جذبہ، متعلقہ ذات، خصوصاً جذبہ اخلاقی کا مظہر ہے، کسی فرد میں اس جذبہ کی اس دقت نکون ہوتی ہو، جب اسے کسی ایسے فعل ماضی کی یاد آتی ہو، جیسے اذکات وہ گزرے طور سے افسوس کرتا ہو، تمام جذبات افسوس کی طرح یہ بھی المناک ہو، چونکہ اس کا نتیجہ یا جذبہ خواہش کا تعلق مستقبل کی بجائے ماضی سے ہوتا ہو، یہ جذبہ افسوس کی دوسری صورتوں سے مختلف ہو، چونکہ جو واقعہ اس جذبہ افسوس کا محرک ہو، اس کے حدوث کا موجب فرد متکلیف کا خود اپنا عمل ہوتا ہو، (اسی معنی میں کسی نے کہا ہو، خود کردہ معاملہ نیست) اس لئے ناخوگوار سی طبیعت کے باعث جس جذبہ غضب کی نکون ہوتی ہو اس کا تعلق افراد کی ذات ہی سے ہوتا ہو۔ پس ایسی صحت میں اظہار لعنت و لعارت سے قلب کو سکون نہیں ملا کرتا، (چونکہ یہ رشحوہ تلویم و تلغین، بھی افراد متکلیف کی ذات ہی سے وابستہ ہوتا ہو) بلکہ سکون کی بجائے الم انگیزی میں اور بھی اصفافہ ہوتا ہے۔

کلام عرفی، اور حافظ و خسرو میں توازن

ایک کھٹکایہ بھی گزرتا ہے کہ متوارد کلام کی کسی قدر تفصیلی روشناس اپنے ہدیہ ناظرین کی ہے، خیال ہو سکتا ہے، تو، ڈھونڈو گا بھی تو چند اشعار میں، یا اس قدر متعدد اشعار میں، میں کہتا ہوں کہ جن میں شعر کے کلام کو غالب کے تختل کا ماخذ بنایا گیا ہے، میں انہیں کے کلام سے اسی قدر اشعار پیش کر سکتا ہوں جو ان کے معاصرین اور متقدمین سے ملتے جلتے ہیں، عرفی کی معنی آخر میں اور گرمی سخن کا کسے اعتراف نہیں، لیکن جب ان کے دیوان پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کے بہت سے اشعار حافظ اور خسرو کے کلام سے مل جاتے ہیں، ذیل میں اس کی فرست دی جاتی ہے،

عرفی اگر ہر وی ہدیٰ منزل میں رو کہ مددی کند بہت شاہجنت

حافظ اگر قدم زنی در وہ خاندان عشق بدرقہ رہت شود بہت شاہجنت

مضمون بالکل ایک، الفاظ کی ترکیب بھی ملتی جلتی، حافظ کے ہاں بدرقہ رہت کا استعارہ البتہ زیادہ ہے۔

نظریہ حال دل آن پر غور نکشاید کہ سیر دیدہ نہ بیند متاع یغما را (عرفی)

غرض جن اجازت مگر ندادے گل کہ پرستش کنی عند لب شیدا را (حافظ)

دونوں کلام کی یک رنگی سے انکار نہیں ہو سکتا، حافظ کے یہاں عند لب شیدا کی دہجہ کی نہ کر نیکا استفہام ہے، عرفی نے علت و

معلول دونوں بتا دئے، کہ بے التفاتی سیر میں پریشانی ہے، البتہ ”متاع یغما“ کی جتنی بڑھی ہوئی ہے، جو حافظ کے یہاں نہیں،

از تیرہ کاری تو بہ خون می پلید دل انگند غمرہ تو بہ بار گراں ہنوز (عرفی)

عالم تمام پر ز شہیدان فتنہ گشت ترک مرا خدنگ بلا د کماں ہنوز (خسرو)

معنی کے اعتبار سے دونوں شعر یکساں ہیں، صرف دو تین الفاظ کا الٹ پھیر ہے خسرو کے ہاں ”خدنگ بلا د کماں“ ہے، عرفی

نے اسے ”غمرہ بہ بار گراں“ میں پیش کیا ہے، مضمون دونوں کا یکساں ہے۔

آہم آتش گشت و خاک شد بہ خاکستر بدل اندر میں رہ کس بنی داند سرا بخاتم ہنوز (عرفی)

روز اول رفت نیم دسر ز لغین تو تاجہ خیرا ہر شد دین بودا کر باخاتم ہنوز (حافظ)

دونوں شعر کا دوسرا مصرعہ ہم معنی، الفاظ بھی ملتے جلتے، پہلا مصرعہ حالات کی ابتری کے اعتبار سے قریب قریب مماثل،

البتہ عرفی کے ہاں پانی کا آگ ہونا اور مٹی کا اگر دو عبارت سے بدل جانا، کچھ زیادہ تاثر انگیز ہے۔

توہ جرم عیش عرفی من و کوچہ کہ ہر سو سرخو بچکاں فسادہ دل پیویشستہ (عرفی)

دچار حد کوئے خود فسادہ مینی بندہ را تن کیفون جاں کیفون اسر کیفون پاکیز (خسرو)

عرفی نے صرف اپنی کوچہ گرجی اور کوئے معشوق کے خوئی نظارہ کی تصویر کھینچی ہے، خسرو خود کوچہ یا را خوئی منظر بن گئے ہیں خسرو نے

اس خوئی منظر کو صرف اپنی ذات تک محدود کر رکھا ہے، عرفی نے عمومیت پیدا کر دی ہے۔ کہ کوئے معشوق کا خوئی نظارہ دونوں نے

عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہو، البتہ عربی کا حسن ادا اور لطافت تخیل قابلِ داد ہے، خسرو اظہارِ غزبات میں سبقت لے گئے ہیں ہنوز صہبائی نے کوئے یار کو منظرِ خونی، تونہ بتایا، البتہ اس میں خانماں بربادوں کا جہوم دکھادیا، یہ خانماں بربادی صرف انسانوں ہی تک محدود نہ رہی بلکہ طیور پر بھی اس کا اثر پڑا۔

بہارِ عارضہ گمشدہ را بے خانماں دارد ز دند آتش ز رویت عندلیباں کیا ہمارا
داغِ داغِ کمردیاسِ زطالکِ کم ہنوز دوزخِ دہر بن مودامِ و خامِ ہنوز (عربی)
ساقیا یک جہرے زان آبِ تشنگوں کہیں در میانِ بختگانِ عشقِ او خامِ ہنوز (حافظ)

”طالبِ کام“ ہونا اور بختگانِ عشق کے درمیان میں خامی کا احساس اور اس لئے آبِ تشنگوں کی طلبی، جذبہٴ عشق کی ایک شورش کا نتیجہ ہیں عربی کو بھی خامی کا احساس ہے اور حافظ کو بھی، ان کے یہاں بھی شوقِ طلب ہو، اور ان کے یہاں بھی قریب قریب یکساں ہیں اور معنی میں دونوں برابر،

ڈاکٹر نکلسن کی لے جناب آگس مزید تو اردکی مثالیں چاہیں گے تو میں اور بھی عربی کے کلام سے پیش کر سکتا ہوں عربی پر کیا مختصر ہے جس شاعر کو جی چاہے لے لیجئے اس کے بہت سے اشعار مقدم میں سڑکتے چلتے نظر آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ارباب تمیز کا خیال ہو، خسرو، اور جامی نظامی کی شاعری کا گھر برباد کیا، اسی طرح بختگان کا مشہور مستشرق، ڈاکٹر نکلسن جسکے ذوقِ فارسی، اور عربی کا طوفانِ مغرب سے گزر کر مشرق تک امنڈ آیا، اپنی مشہور تالیف ”منتخبات دیوانِ شمس تبریز“ کے عالمانہ مقدمہ میں لکھتا ہے، کہ مولانا روم کی شاعری مختلف شعرائے متقدمین اور معاصرین سے متاثر ہوئی، ان میں فرید الدین عطار، حکیم سنائی، سعدی، نظامی اور عمر خیام کی تفصیل ہو، ڈاکٹر موصوف اس تاثر کی بنیاد تاریخی واقعات پر رکھتے ہیں، چنانچہ فرید الدین عطار کے متعلق لکھتے ہیں کہ مولانا روم پہلے سے چلتے وقت نیشاپور سے گزرے، تو فرید الدین عطار نے انہیں اسرارِ نامہ دیا، حکیم سنائی کے متعلق ایک غزل میں خود مولانا فرماتے ہیں ۵

گفت کسے خواجہ سنائی ببرد مرگ چینِ خواجہ نہ کارِ بیتِ خرد

دس مصرعے کی غزل جو سنائی کے خاص جذبہٴ احترام و محبت کا پتہ بتاتی ہو، ساتھ ہی ڈاکٹر صاحب یہ حوالہ غنوی مترجمہ رڈ ہاؤس، افلاکی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں، کہ مولانا فرماتے تھے کلمۃ اللہ (قرآن مجید) نمبر نہ شیر ہے اور الہی نامہ (حدیقہ حکیم سنائی) اس کا جوہر ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے مولانا حکیم سنائی کے اشعار سے واقف تھے، سعدی سے مولانا کی ملاقات کے متعلق رڈ ہاؤس کا قول ترجمہٴ غنوی میں، اور رضا قلی خاں کا قول دیوانِ شمس تبریز مطبوعہ طہران کے مقدمہ میں موجود ہے مولانا اپنی غزل میں حضرت نظامی گنجوی کے متعلق کہتے ہیں۔

نظرِ آن کہ نظامی بہ نظم می گوید جفا کن کہ مرا طاق جفا کے توفیت

اسی طرح مولانا کا یہ مصرعہ ”چون فاختہ او پراں فریا دکنان کو کو“

عمر خیام کی رباعی کی ایک بیت

ویدیم کہ برنگلہ اش فاختره
آواز ہمیں داد کہ کو کو کو کو

سے ملجاتا ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں مولانا کی شاعری پر، سعدی، نغاسی اور خیام کا گہرا اثر نہ پڑا، البتہ سنائی اور عطار کے افراط تمام و کمال آپ کی شاعری میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لئے دیوان شمس تبریز مطبوعہ کیرج، کانگریزی مقدمہ دیکھئے جو ڈاکٹر بھٹن کے ذوق استقراء کا نتیجہ ہے۔

الغرض دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی استفادہ متقدمین سے گریز نہیں کر سکتا ہاں مستعار اور مستفاد میں فرق ہے، مستعار کی اصطلاح سرتقہ کی بحث لاتی ہے، اور استفادہ قانون فطرت ہے، مستعار کہنے سے معلوم ہوگا کہ شاعر نے عدا کسی کا مضمون الفاظ کے تغیر یا معنی کے الٹ پھیر کے ساتھ اپنا بنا لیا، استفادہ کہنے سے پتہ چلے گا، کہ متقدمین کے تاثرات شاعر میں قد قتی طور پر ہیں تو ضرور، لیکن اس نے ان تاثرات کو اپنا ذاتی تاثر سمجھا، ان کے انہار کے وقت اس کے ذہن میں یہ کھٹکا بھی نہ تھا کہ خارجی اثرات کو اس کے انہار فکر و احساس میں میں کچھ بھی دخل ہے، اس کے انکار میں خارجی اثرات کی یہ آمیزش اس کے شعور و ادراک سے نہیں ہوتی، بلکہ یہ وہ عمل ہے جس کی وضاحت اور تفصیل فلسفہ کی گہرائیوں میں لی جاتی ہے اور اس معنی میں ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب بجنوری مرحوم کا یہ نظریہ کہ غالب کا کلام اسی کا کلام ہے، مستعار نہیں، صحیح ہے۔

اب یہاں علم و عقل کی روشنی میں یہ پر لطف بحث پیدا ہوتی ہے، کہ آیا کوئی شاعر ایسا بھی ممکن ہو سکتا ہے، جس کا کلام سراپا اسی کا کلام ہو، متقدمین یا معاصرین سے متاثر اور مستفاد نہ ہو، ذیل میں اسی نظریہ پر بحث ہوگی۔

فلسفہ ڈاکٹر ابرار می | یورپ کا مشہور، طبیب اور فلسفی ڈاکٹر ابرار می اپنی کتاب ”قوائے عقیدہ“ میں لکھتا ہے، قوت مصورہ کو عمل میں لانے کے لئے ہم لوگ حقیقی مناظر، حوادث اور عادات کے جزوی

عناصر کو لیتے ہیں، اور ان کو خود دماغ کے ایک نظام کے ذریعہ سے نئے طریقہ سے، ترکیب دیتے ہیں، اس ترکیب سے ایسے مرکبات تیار ہو جاتے ہیں، جن کا وجود فطرت میں نہیں ہوتا، ایک نقاش اس طریقہ سے ایک مقام کی تصویر تیار کرتا ہے اس میں وہ ان تمام خوبوں، اور دلفریبیوں کو جمع کر دیتا ہے، جو بہت سے حقیقی مقامات میں پائی جاتی ہیں، اور ان کے نقائص سے قطع نظر کر لیتا ہے، ایک شاعر، یا ایک افسانہ نویس اسی طریقہ سے ایک فرضی شخص کی عادت کا ایک مرقع تیار کرتا ہے اور اس میں وہ تمام صفات خصوصی داخل کر دیتا ہے جو اسے اپنے مقصد کے مطابق اس فرضی شخص کی عادت کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں ان مرکبات کی حیثیت محض فرضی اور خود ریا نہ ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ ضروری ہے کہ انفرادی عناصر ایسے ہوں گے، جو حقیقتاً فطرت میں پائے جاتے ہیں اور یہ کہ ایسا مرکب بالکل اس سے متغیر، اور مختلف ہوگا جو وقتاً فطرت میں پایا جاتا ہے، جب یہ اصول کسی تصویر یا فسانہ میں ملحوظ نہیں رہتا تو ہم لوگ ایسی جبرک غیر فطری اور خرافاتی کھیلے

ڈاکٹر صاحب کے مفصلہ بالا نظریے سے ہلوگ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں، کہ جب کوئی شے خواہ مادی ہو یا نفسی، غیر مرئی اور تختیل جیثیت کہتی ہو، یا حسی اور بدیہی تو غیر معقولیت اور خرافات کے نقائص سے پاک ہوگی اور اس کے عناصر پہلے سے فطرت میں ضرور موجود ہوں گے، پس معلوم ہوا کہ انسانی تصورات اور تختیلات کی رسائی فطرت سے بالآخر نہیں ہو سکتی پس انسان جو چیز پیش کرے گا، تو ضروری ہے کہ اس چیز میں اس کے سابقہ معلومات، تجارب اور مشاہدات کو دخل ہو اور یہ ظاہر ہے کہ انفرادی معلومات، تجربہ اور مشاہدہ کا کامل نہیں تو بڑا حصہ، اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات سے بالواسطہ حاصل ہوتا ہے، اس سے بات ثابت ہوگئی کہ کوئی انسان ایسا تختیل نہیں پیش کر سکتا، جو سراپا اسی کے جودت ذہن اور رسائی فکر کا نتیجہ ہو، لیکن جس طرح سقراط کا عقلی علو، ارسطو کی منطق، بقراط کے طبی اکتشافات، ابن رشد کا فلسفہ، بطلمیوس کی ہیئت ذاتی ابن اشیع کا طر منظر دنیا میں انفرادی اجتادات کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، اور احترام و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح غالب بھی اپنے رنگ سخن کے لحاظ سے عزت و احترام کا مستحق ہے، حالانکہ نہ سقراطیات و بقراطیات نئی چیز تھیں اور نہ غالبیات۔

کثرت مشاغل اور تنگی وقت کا گلہ کیا جائے، یا قلت معلومات اور ناموزونی طبیعت کا اعتراف، کہ اس وقت اس مسئلہ پر مبسوط بحث نہیں ہو سکتی ورنہ یہی ایک بحث فکرہ احساس کی جولانی کے لئے کافی ہو، اور جس سے یہ ثابت ہو جائیگا کہ بہت سی باتیں متقدمین سے حاصل کرنے کے باوجود قابل ستائش ہوا کرتی ہیں، انسانی تختیل اور افکار کا زیادہ حصہ تقلید اور تتبع پر منحصر ہے ہاں یہ تقلید اگر اچھی تقلید ہے اور یہ تتبع سراپا تتبع ہے تو معیوب ہے، اور اگر اس میں انفرادی کا دوش ذہن اور فکری جولانیوں کا اضافہ ہے، تو مستحسن ہے، خدا کے فضل سے مہر التعلق غیر مقلد (المجدید) قرعہ سے ہے، اور میں اسی معنی میں تقلید کا انکار کرتا ہوں ورنہ نظری تقلید کا کسے انکار ہے؟

اس وقت میں مختصر آسائیر الاقدین (میٹھا لوجی) اور ہیئت سے نظائر پیش کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ انسانی طبائع کا بچان کس طرح باوجود اختلافات زبان، ملکی حالات، قطع رسل و رسائل اور بلا مراط و اختلاط، ذہنی اور فکری ضیات سے مائل پایا جاتا ہے، ہیئت سے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ افراد محض ایک دو مسائل کی تحقیق کا اضافہ کرنے پر، فخر ملک و قوم شمار کئے جاتے ہیں، اور ہیئت اجتماعی کی نظریں معزز اور محترم ہیں، اس سے یہ بات ثابت ہو جائیگی کہ ہو سکتا ہے یا نہیں غالب کا کلام مستعار اور حاصل در یوزہ گری صرف غالب ہی کے تختیل کا نتیجہ ہو، ہاں اس تختیل کے عناصر، قومی اور اجتماعی معلومات، تجارب اور مشاہدات سے بالواسطہ لئے گئے ہوں، اور سچا سے مرزا نے خاقانی اور جامی، سعدی اور حافظ، فیضی اور عرفی، خیام اور حنری کے ان منوار دکلام کو آنکھوں سے تو دیکھا ہو، لیکن اس کا اثر مطلق ان کے دماغ میں موجود نہ ہو، پھر یہ بھی ماننا کہ غالب کے کلام میں گود ایک بھی طغرائے امتیاز آپ کو نظر آتے ہیں؟ — تو علمائے ہیئت کی طرح غالب بھی قابل فخر و ستائش تسلیم کرنا پڑے گا

آسائیر الاقدین | علمائے مغرب کی کاوشوں کی بدولت، اس موضوع پر جامع تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں

یونانیوں اور رومیوں کے فسانے، مصر اور ہند کے توہمات، چین اور جاپان کے اساطیر، بابل اور اسیریا کی قدیم عجائب پرستیاں، میکسیکو اور پیرو (امریکہ) کے ادہام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں، ڈونلڈ اے میکسنزی، اپنی کتاب ”بابل و اسیریا کے ادہام و فسانے“ میں لکھتا ہے، جس طرح ہم نے راکششوں کو مارا، اسی طرح ہر نزل نے کیڈن کا خاتمہ کیا اہل بابل کا یہ فسانہ جس میں گلگیش کا سفر بادیہ پیمائی، اونچے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں سے گزرنا، باغ و دریاغ سے گزرنا، بحر و راج کے سوا حل تک رسائی دکھائی جاتی ہے ہندوستان کے اس فسانہ سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے، جیسے ہنومان کے واقعات بادیہ پیمائی، اور صحرا زوردی کے مناظر دکھائے گئے ہیں جوت وہ سینا جی کی تلاش میں سرگرداں تھے، اسی طرح اہل ہند کے فسانہ میں سسٹر فوڈیلٹلنے سری کرشن جی کی نوازی اس کے دلکش اور غیر معمولی تاثرات، اور بتی کی نوجوان لڑکیوں پر جنہیں ”گوپا“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اس کے ساحرانہ جذبہ کشش کا منظر دکھایا ہے، وہ یونانیوں کے اس ہیرو کی ترانہ سنجی اور نغمہ پروازی، اس کے غیر معمولی کرشمہ ترنم اور مناظر فطرت پر اس کے حیرت انگیز اثرات سے ملتا جلتا ہے جو ”گولڈن فلیس“ کی تلاش میں، اور پھر دوبارہ اپنی بیوی کی اچانک فاقہ کے غیر معمولی رنج و الم میں عالم سفلی (انڈر ورلڈ) کے سفر میں جا رہا تھا۔

حلول اور حل کے متعلق، یونان، مصر، ہند اور سب سے بڑے قدیم اہل عرب کا ایک عقیدہ معلوم ہوتا ہے، یونان میں حضرت مسیح کے پانچویں برس قبل ایک فلسفی فیتا غورس تناسخ کا قائل تھا، اسی طرح ہند میں بھی آج تک یہ خیال موجود ہے، ڈونلڈ اے میکسنزی اپنی دوسری تصنیف ”قدیم اہل مصر کے فسانہ و ادہام“ میں لکھتا ہے کہ جب مصر میں کوئی شخص مرجا تا تھا تو اس کا ایک مجسمہ اس کی قبر پر رکھ دیا جاتا ان کا عقیدہ تھا کہ متوفی کی روح اس مجسمہ میں داخل ہوتی ہے، ورنہ حلول کے لئے ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی ہے، اس لئے وہ اس مجسمہ کے نزدیک اکل و شرب کا انتظام کرتے تھے۔ ان کے خیال میں تین روحوں ہوتی تھیں، اس مجسمہ میں جو روح حلول کرتی تھی اسے ”دہ کا“ کے نام سے موسوم کرتے تھے، احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ حلول روح کے متعلق، قدیم عرب بھی دہم میں مبتلا تھے چنانچہ امام بخاری مناقب میں عبدالرحمن ابن قاسم بن محمد بن ابی بکر بنی روایت نقل کرتے ہیں کہ وہ کہتے تھے کہ میرے والد قاسم بن محمد، جنازہ کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے۔

انکا خیال تھا کہ متوفی کی روح، کسی پرندہ کے جسم میں حلول کرتی

ہے، جب کوئی نیک عمل کرتا ہے، تو کبوتر وغیرہ کے جسم میں اس کی روح جاتی ہے، اور بد ہوتا ہے تو کوسے وغیرہ میں۔ میکسنزی نے اپنی اس تصنیف میں اہل مصر کی شجرہ پستی کا بھی حال لکھا ہے، جو آج تک ہندوستان میں مروج ہے، اسی طرح مجھے یاد آتا ہے، کہ اہل میکسیکو، و پیرو (امریکہ) کے واقعات ادہام میں یا اہل جاپان کے توہمات، میں جو یوس اسپنسر، اور ہڈ لینڈ ڈیوس کی تصنیفات ہیں، جن میں مصنف نے ان قدیم باشندوں کی تصویریں بنائی ہیں اور آفتاب کے سامنے تعبدانہ رنگ میں کھڑا دکھایا ہے، ہند میں آج تک آفتاب کی پرستش ہوتی ہے۔

اب بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ جب تک قدیم اہل بابل، امریکہ، مصر، جاپان، ہند وغیرہ میں ذرائع آمد و رفت نہ تھے،

کہ ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاق، طرز عبادت، اور عقاید کا علم ہوتا تو یہ مماثلت کیسی؟ گو قدیم ہندوستان کے اسباب رسل و رسائل و جہاز رانی کے متعلق بینی لکاسر کار نے اپنی علمی تصنیف ”ننون حکمید میں اہل ہند کا کمال“ میں لکھا ہے اسی طرح مصر و ہند کے ذرائع آمد و رفت کے متعلق ہیروڈوٹس یونان کا قدیم مورخ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے، لیکن یہ نسانے اور ادھام اس قدر قدیم ہیں کہ تاریخ کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی، آمد و رفت کے ذرائع، اور رسل و رسائل کے اسباب بعد کی پیداوار ہیں۔ اس سے نتیجہ یہی نکالا جاسکتا ہے، کہ انسانی جذبات و احساسات یکساں ہیں ماحول کے مناظر نے اختلافات پیدا کئے، لیکن اصول میں نوع انسانی کی رفتار و تحنیل ایک محور کے ماتحت ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ غالب کی شاعری اور شاعرانہ تاثرات، اہل فارس کی تقلید کا نتیجہ نہ ہوں، بلکہ فطری مناظر نے غالب پر اثر ڈالا ہو اور اہل فارس سے توارید اور تمثیل کی وجہ سے وہی نوع انسانی کے مرکزی جذبات و احساسات کی مقارنت ہو۔

ہیئت موجودہ علم ہیئت پر نظر ڈالی جائے، تو معلوم ہوگا کہ بتدریج اس میں انفرادی اضافے ہوتے گئے، اس فن کے سربراہ اور وہ علما ہیئت داں کے لقب سے مشہور ہوئے، گو انھوں نے متقدمین کی تقلید ہی کی ہو اور صرف و ایک ہی مسئلہ میں اجتہادی نظر ڈالی ہو، چنانچہ بطلمیوس، مصر کا مشہور ہیئت داں بروج کی تخصیص، اور ان کے تسمیہ میں اہل بابل کا مقلد ہے، بطلمیوس پر کیا منحصر ہے، آج تک اقوام عالم میں بروج کے متعلق وہی انکار ہیں، جو قدیم اہل بابل کی رسائی ذہن کا نتیجہ ہیں، میکسنزی نے اس نظریہ کو بھی شد و مد سے پیش کیا ہے، اسی طرح بطلمیوس سے لیکر البطانی (جسے بطلمیوس عرب کہا جاتا ہے) عباسیہ اور فاطمہ کے علمائے ہیئت بنو شاکر، ابو الحسن، اور ابن یونس کے زمانہ تک ایک نظریہ رہا، یہاں تک کہ یورپ میں کوپرنیکس پیدا ہوا اور اس نے بطلمیوس کے نظام میں یہ تغیر کیا کہ زمین بھی ایک کرہ ہے اور بجائے ارض کے آفتاب اس نظام کا مرکز ہے۔

البطانی جو عرب اسلام میں سب سے پہلے مشہور ہیئت دان گزر رہا اس کی شہرت کا مدار زیادہ تر اس کے اس اجتہادی نظریہ پر ہے کہ اس نے ہیئت اور علم مثلث کے حساب میں وتر دائرہ کے بدلے جیب متساوی () کا استعمال کیا، دسویں صدی عیسوی میں بنو الحجاز کی شہرت ہیئت دانی اس نظریہ پر ہے کہ انھوں نے حرکات قمری کا اندازہ لگایا، حمد ماموں میں بنو شاکر نے پہلے پہل منطقہ البروج کے انحراف کا انکشاف اور تفسیرات فی ہیئت القمر کا معائنہ کیا۔

اب اٹھارہویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے علمائے مغرب کی کاوشوں کو دیکھئے، مسٹر جین نے کرہ ارض کی ہیئت کے متعلق اپنی تحقیق پیش کی، لینکلے نے جبل و پہاڑی بر آفتاب کے متعلق اپنی نگرانی قوت کو جولانی دی، کلف آفتاب کے متعلق پرنسپل سیمپسن کی تحقیق موجود ہے، مشنری پر کرہ ہوا کے وجود کے متعلق تین علمائے رصد گاہ ایڈمیرل اسمتھ مسٹر میکس اور ڈاکٹر میرسن نے نظریات کا اضافہ کیا، مولٹن نے ”سائنس ان مارڈن لائف“ (جدید زندگی میں علم و حکمت) کی پہلی جلد میں اس طرح کی مبسوط مثالیں پیش کی ہیں،

لطیف اسلوب بیان اور دلکش فارسی ترکیبوں کے استعمال میں، آج اردو غالب کی بہت کچھ مرہوں منت ہزاروں میں خواجہ حافظ کے طرز میں کسی نے کچھ کما تو میسے خیال میں وہ مرزا غالب ہی ہیں، بے باکی، مذہب سے لاپرواہی، رند منشی مشرب مدام کیف و مستی اور اس بے صوفیانہ خیالات کی روانی، جذبہ و احساس کا دھور، ذوق و نشاط کا سیلاب جو تغزل کی جان ہیں، جس طرح خواجہ حافظ کے ہاں پائے جاتے ہیں اسی طرح مرزا غالب کے یہاں ہیں،

عبدالملك آروی

دوست! ایک بار دیکھو! سب اشیا کی بچائی قیمت صرف دس روپیہ 15/-
 قریبی ایک لاکھ دیت نہیں

مندرجہ ذیل باخول اشیا کی قیمتوں کا میزان اختیار ہو رہی ہے لیکن سب اشیا پر ایک طلب کرنے پر وہ مخصوص لاکھ پینکٹ صرف دس روپیہ میں فروغ ہو گی۔ آج کے دن کی عینک سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ اس کی قیمت زیادہ ہے مگر اس کی ضرورت ہر شخص کی ہے۔ اس کی قیمت صرف دس روپیہ ہے۔

ٹول الارم بھینس

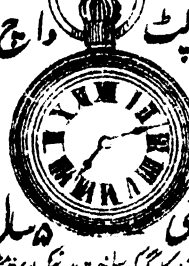


دلاہت کی جدید ساخت ہے ایک مرتبہ سیاحی ہو کر صفحہ کے صفحہ گھما دے۔ گولڈن بیک اور اس کے ساتھ ہات دہانی سے چلتا ہے اور برسوں کام کرتا ہے۔ قیمت مدد محمول ڈاک بھجور

گولڈن بیک



لیور پلٹ واک



تیسرے



سہری



افنیٹ: جو صاحب قاضی بن یا چڑیاں دونوں میں سے ایک اشیا خریدنا نہ چاہیں ان کو بقیہ چاروں اشیا میں سے دو روپیہ میں روایت کیا جاتی ہے۔ روٹ مدد جو صاحب قاضی بن اور چڑیاں دونوں اشیا خریدنا چاہیں ان کو بقیہ تینوں گھڑیاں دے دیں۔ روایت کیا جاتی ہے۔

پتہ: چپٹا چ اوں حمیری گیٹ 8 دہلی

صدائے شکست

(فسانہ)

ملہ راؤ جس وقت میوزک کالج میں پرنسپل کی حیثیت سے آئے تو سب نے ان کی صورت دیکھ کر حاکم نگار یا کہ یقیناً یہ شخص موسیقی کا بڑا ماہر ہو گا کیونکہ قدرت اس قدر ظالم نہیں ہو سکتی کہ ایک انسان کو اس قدر بد صورت بنائے اور پھر اس کی تلافی کسی اور طرح نہ کرے۔ سیاہ فام چہرہ، چپکے داغوں سے ناتھوار، چوڑی ناک، بانے کے قریب بالکل جھپٹی، آنکھیں غیر معمولی طور پر بھیاں لگ ہونے کی حد تک بڑی، ہونٹ اس قدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے لیکر ٹھوڑی تک ایک سطح نظر آتی اور کوئی خط، کوئی نشیب و فراز درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا جس سے دہن کا وجود متعین ہو سکتا قد چھوٹا، قامت ناموزوں، ہاتھ پاؤں بد نما، الفرض ظاہری وجہانی ساخت کے لحاظ سے وہ انتہائی بد قسمت انسان تھا اور بد صورتی کا ایک مجسمہ لیکن اسی کے ساتھ خدا نے موسیقی کی ایسی زبردست دولت اس کو عطا کر دی تھی کہ دنیا اس کی عزت کرنے پر مجبور تھی اور جس وقت وہ اپنے گلے سے کوئی آواز پیدا کرتا تو اس کی اسی مکروہ صورت پر اک خاص قسم کا روحانی حن چھا جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ یہ کوئی دیوتا ہے جو مصلحتاً ایسی صورت اختیار کر کے آسمان سے زمیں پر اتر آیا ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری دولت اس کی لڑکی رجنہ تھی، جو کسی طرح بہ لحاظ صورت اپنے باپ کی بیٹی نہیں معلوم ہوتی تھی لیکن ذوق موسیقی کے لحاظ سے ماننا پڑتا تھا کہ سوائے ملہ راؤ کے وہ کسی اور درخت کا پھل بھی نہیں سکتی۔ یونہی وہ غیر معمولی کیا، معمولی حسین بھی نہ تھی، اور اس کا کوئی عضو علیحدہ علیحدہ کسی مخصوص جمال کا مالک نہ تھا، لیکن جنسیت مجموعی وہ بہت دلکش چیز تھی اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی شخص اس کو ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ نظر اٹھانے پر مجبور نہ ہو جائے اگر کسی عورت کے خد و خال میں نمایاں نقص نہ ہو، تو سناؤ لارنگ اور کتانی چہرہ، یہ دو چیزیں ایسی ہیں کہ شباب کے ساتھ ملکر کافی قیامت ہو جاتی ہیں، چہ جائیکہ قامت میں رعنائی ہو اور اداؤں میں تہذیب کی دلکشی کہ پھر تو مرد کا اس کے سامنے سراپا ”عذر“ ہو کر بجا ناگزیر ہے۔

رجنہ جس کی عمر ۲۱ سال کی ہوگی۔ ان خصوصیات کے لحاظ سے یقیناً غیر معمولی چیز تھی اور چونکہ وہ مدراس یونیورسٹی کی گریجویٹ بھی تھی اس لئے اس کے دلکشی جمال ایک ایسی سنجیدہ فضا پیدا کر دیتی تھی کہ وہاں تک پہنچنے کی ہمت ہو کسی کو بھی کہو کہ یہی حب وہ کالج میں اپنے باپ کے ساتھ آتی (اور ہفتہ میں دو چار بار ضرور آتی) اور کسی درجہ کی تعلیم کو اگر دیکھنے لگتی تو کبھی یہ ہوتا کہ استاد گھبرا کر خود خاموش ہو جاتا اور کبھی وہ خود اس کے ہاتھ سے ساز لیکر درس میں مشغول ہو جاتی۔ طلبہ بے چینی کے ساتھ منتظر رہتے کہ کاش رجنہ بائی ان کے درجہ میں آجائے نہ اس لئے کہ وہ عورت تھی اور جوان و دلکش عورت، بلکہ محض اس بنا پر کہ اس کا ہر دہن

موسیقی اک منتقلِ نغمہ حیات“ ہو کر رہا تھا اور اس کی آواز کا ہر ہر جزو، ہر ہر نشیب و فراز، ایک ایسا نقشِ روح ہوتا تھا جو کبھی مٹ نہ سکتا تھا۔

یوں تو وہ ہر ساز کو تکمیل کے ساتھ جاسکتی تھی کیونکہ اس کا باپ حقیقتاً بین کاری تھا اور اس نے رجنہ کو بھی بین ہی میں ماہر کیا تھا جس کی مہارت تمام سازوں کا مالک بنا دیتی ہو۔ لیکن وہ اپنی نظری ذوق کے لحاظ سے زیادہ تر سردیوں کی طرف مائل تھی اور حقیقت یہ کہ جس وقت وہ بین کی نواؤں کو (جو حقیقتاً خود اسی کے ذوق کی نواؤں تھیں) سرد میں ظاہر کرتی تھی، تو نہ سرد و سرد رہتا تھا اور نہ وہ معینہ۔ وہ ترقی کر کے کوئی ایسا ساز ہو جاتا جو اس وقت تک ایجاد نہیں ہوا اور یہ ایک معینہ کی حیثیت سے بڑھ کر کوئی ایسی ہستی نظر آتی جو صرف اساطیر و صنایع میں پائی جاتی ہو۔

رجنہ اپنے اخلاق و اوقات کے لحاظ سے اس قدر صحیح نمونہ انسانیت و انسانیت کا تھی کہ اس کو دیکھ کر قدیم آریہ ویت کی وہ دیویاں یاد آ جاتی تھیں، جن کا ذکر اب صرف کہانیوں میں پایا جاتا ہو۔ چونکہ ماں عرصہ ہو امر چکی تھی اس لئے اپنے باپ کی آسائش اور دو چھوٹے بھائیوں کی پرورش و تربیت بھی اسی کے ذمہ تھی اس کی شادی کسی میں ہو گئی تھی لیکن قبل بلوغ اس کا شوہر مر گیا اور وہ باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے دوسری شادی کی مخالفت تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مجھے ساری عمر باپ ہی کے گھر میں بھائیوں ہی کی خدمت میں صرف کرنا ہوگا اس لئے وہ اپنے موجودہ حال پر حد درجہ قانع تھی اور اس نے اپنے باپ کے گھر کو اپنے سلیقہ و ذہن، اپنی روحانی شگفتگی اور اپنی اخلاقی و لادریزی سے ایک مختصر سی جنت بنا رکھا تھا جس میں سوائے اس کے باپ کے کسی اور جنتی کی گنجائش نہ تھی جو اس حد کے شامل سے متاثر ہوتا۔ اول تو یوں بھی ملہراؤ کے گھر بہت کم آدمی آتے جاتے تھے، کیونکہ وہ خود اپنے اندر سوسائٹی کی کوئی دلچسپی نہ رکھتا تھا اور جو لوگ آتے بھی تھے سو وہ اس متناسک کو لیکر کہ رجنہ باپ سے ملاقات ہو جائے گی، لیکن اس کی اوقات کچھ ایسے مصروف تھے کہ مشکل ہی سے کبھی اس کو لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا

وہ بہت صبح اٹھتی اور اسی وقت نہا کر، پوجا میں مصروف ہو جاتی۔ اس کی پوجا یقیناً وہ پوجا نہیں تھی جس میں مورتیوں کو سامنے رکھ کر گھنٹیوں کی آواز سنائی جاتی ہو یا چھوٹے چھوٹے چچوں سے ان پر پانی گرایا جاتا ہو۔ اسٹو کوں کا در دھوتا ہو، چنہیر پڑھنے والا خود نہیں سمجھتا بلکہ اس کی پوجا صرف خیال و مراقبہ کی تھی، محویت و استغراق کی تھی یعنی بجائے اس کے کہ وہ خود کسی بت کو پوجتی، خود بت ہو جاتی تھی اور پرستش کے لائق کبھی کبھی وہ اس کے بعد گاتی بھی تھی اور یہ گانا اس کا اس درجہ بلند، اس قدر پروردہ روح اور ایسا آہانہ ہوتا تھا کہ وہ خود بھی اس کی تکرار دوسرے وقت نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت اس کا گانا اس کی وہ دلی التجائیں وہ روحانی تمنائیں ہوتی تھیں جو مقصود و مدعا سے بے نیاز کو کے تھوڑی دیر کے لئے انسان کو خدا بنا دیتے ہیں۔ وہ نغمہ اصباحی کے بعد اس کی نارغ گریہ آنکھوں میں ملہکا سا نم جن کے اندر سے آنکھ کی چمک ایک محبِ شیشہ کا جلا دینے والا نقطہ نور معلوم ہوتی تھی وہ اس کے رخسار کی رنگین تازگی، وہ صبح صادق کی سی وسیع پیشانی، ان الغرض تمام وہ دلکشاں جو کسی فرضِ خداوندی سے نارغ ہونے کے بعد ایک مطمئن قلب انسان کی ہمت میں پیدا کر دیتا ہے، کچھ ایسی تکمیل کے ساتھ اس کے چہرہ پر

منو دار ہو جاتی تھیں کہ بقول ہمارے ایک دوست کے (جنہوں نے ایک دورِ قہر سے اس کو صبح کے وقت دیکھا تھا) بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ اس کے سامنے دوڑنوا ہو جاؤ۔

وہ صبح کی پوجا کے بعد طلوع آفتاب سے قبل تمام خانہ داری کی ضروریات سے فارغ ہو کر، اپنے بھائیوں کو لیکر بیٹھ جاتی اور ان کو پڑھاتی، یہاں تک کہ اسکول کا وقت آجاتا اور وہ بچوں کو روانہ کر کے کبھی میوزک کالج چلی جاتی اور کبھی گھڑی پر مطالعہ لکھتیں۔ مصروف ہو جاتی۔ وہ مذہباً کچھ بھی ہو لیکن اعتقاداً و عملاً بالکل تھیا سوفسٹ (صوفی) تھی اور خدا اور مذہب کا ایک خاص مفہوم اس کے ذہن میں تھا۔ وہ تفریقِ مذہبی اور جماعتی عصبیت سے بالکل ناواقف تھی اور وہ ہر انسان کو خواہ وہ کسی مشرب و ملت کا ہو، نگاہِ لطف و اخوت سے دیکھتی تھی۔ الغرض یہ بھی بلند سیرت و رجنائی جس نے ایک عام صفتِ محبوبیت اس کے اندر پیدا کر دی تھی،

————— (۲) —————

میوزک کالج کے طلبہ میں راج کمار پوس، خاص اہمیت رکھتا تھا۔ بنگال میں موسیقی معاشرت کا ایک ضروری جزو ہو کر رہ گئی ہے اس لئے وہاں کا ہر فرد کچھ نہ کچھ ذوق اس کا رکھتا ہے، لیکن راج کمار کا خاندان چونکہ خصوصیت کے ساتھ فنونِ لطیفہ کا ماہر مانا جاتا تھا اس لئے اس کے اندر یہ ذوق زیادہ پھیل کے ساتھ پایا جاتا اور وہ بنگال اور مدراس کی موسیقی کے فرق کو سمجھتا تھا، اس لئے جب اس نے یہ سنا کہ مدراس کا مشہور نایک ملہر ادمیوزک کالج میں پرنسپل ہو کر آیا ہے تو اس نے بھی ایک اسکالر کی حیثیت سے اپنے آپ کو کالج سے وابستہ کر دیا اور چند دن میں اس کی غیر معمولی ذہانت اور فطری ذوق نے ایک استادانہ حیثیت حاصل کر لی

رجنابائی کے عام اخلاق اور مہارت فن نے جس طرح اور شخص کی نگاہ میں اس کو عزیز و محبوب بنا رکھا تھا اسی طرح راج کمار پر بھی اس کا خاص اثر تھا، لیکن فرق یہ تھا کہ دنیا جب رجنابائی کو محوِ ترم دیکھتی تھی تو میناب ہو جاتی تھی اور داد دینے پر مجبور۔ لیکن یہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے نہایت خاموش و لطیف تھا تا اور جس وقت سارے مجمع کی نظریں حریص ہو کر رجنابائی پر پڑتیں، اس کی نگاہ صرف ایک پرستش خاموش ہو کر نکلتی اور اس کا پیام اعتراف صرف اُس کے چہرہ کا وہ رنگ ہوتا جس کے تغیر کا سمجھنے والا مجمع میں سوا ایک ہستی کے اور کوئی نہ ہوتا۔

راج کمار قصداً ان موقعوں کو بچا جاتا جب اسے رجنابائی سے مخاطب ہونا پڑتا اور رجنابائی یہ سمجھ کر کوشش کرتی کہ کوئی موقع ایسا ہاتھ نہ آئے اور اس میں بڑی حد تک اس کا جذبہٴ نسائیت بھی شامل ہوتا۔ چھ عینے گزر چکے ہیں اور کالج کی فضا کا کوئی شخص خواہ وہ طالب علم ہو یا استاد ایسا نہیں ہے جس کو رجنابائی سے گفتگو کرنے بلکہ ایک حد تک بے تکلف ہو جانے کا موقع نہ ملا ہو۔ لیکن راج کمار کو ابھی تک یہ عزت نصیب نہیں ہوئی، اور اگر کبھی وہ اس کا خیال بھی کرتا تو کانپ اٹھتا کیونکہ اس حجاب و شرم کی عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی تھی وہ اسی قدر زیادہ شدت کیساتھ محسوس کرتا جاتا تھا کہ کہیں یہ سکوت کسی خاص ہنگامہ کی پرورش تو نہیں ہے۔ چہناب کی مخصوص جذب و کشش کا مقابلہ تو نہیں ہو اور کہیں ایسا تو نہیں ہو کہ اس نفلِ خوشی کا ٹوٹا کسی ظلم کا ٹوٹ جانا ثابت ہو۔

باب المراسلة والمناظرة

(دارالعلوم مدینۃ العلماء)

مصدر و لطف و کرم - ہدیہ سپاس دنیا ز

آپ نے ستم کیا کہ میری ”غلط فہمی“ کے خیال سے اپنی ”چھیڑ“ ملتوی رکھی، میں تو ان شامت زدوں میں ہوں، جو اس چھیڑ چپاٹ سے لطف اندوز ہوتے ہیں، غلط فہمی کیسی؟ آپ کا یہ شکوہ کہ ”میں نے غضب کیا کہ خلوت کی ملاقا توں کا ذکر یوں آزادی و میاکی سے کر دیا“ سر آنکھوں پر، گزارش ہے کہ میرا غضب تو محدود تھا جناب ہی کی بارگاہ قدس تک، لیکن غضب آپ نے کیا کہ راز و روئی پر دہشت از بام کر دیا آپ کی و لچپ تمہید میرے لئے بایں سرور نشاط و مسرت ثابت ہوئی، یہ تو تہی خارج از موضوع گفتگو چاہتا ہوں کہ اصل موضوع پر بھر جناب کی کچھ توضیح اوقات کروں،

کر حملے تو مارا کر دگستاخ

شاید میں اپنا مافی الضمیر صحیح طور سے پیش نہ کر سکا، جن چیزوں کا آپ نے جواب مرحمت فرمایا ہے وہ محض ضمنی ہیں، یعنی اپنے عوام معین اور فن قلم کا لوگوں کے بالکل علی الرغم اظہار و اعلان، بلاشبہ میرا یہ مطالبہ تھا اور مجھے اس سے مسرت ہوئی کہ آپ نے اپنے خیالات و دعا عیات، منظر عام پر پیش کر دئے، لیکن اصلی اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ”تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کو وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر سمجھنا“ کہاں تک مستحسن ہے؟ آخر وقت و زمانہ کا اتقنا کیا ہوتا ہے، تہذیب و تمدن کا معیار کیا ہے؟ کیا ہر عالمگیر حکومت کا نظام تہذیب غلاموں کے لئے، وحی آسمانی ہے، کیا ہر جنگیتی چیز سونا ہے کیا ہر رنگ و بو والی چیز لطیف ہوتی ہے؟ کیا ہر نقش و نگار والی چیز مرکب جذب کش ہو سکتی ہے اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہو تو گزارش ہے بصدد عجز و نیاز، سوال ہے بصدد احترام و آداب کہ کیا یورپ کی تہذیب تہذیب ہے؟ کیا یورپ کا تمدن تمدن ہے؟ مانا کہ یورپ کے بتان سپین بدن دنیا کو تسخیر کر چکے، تسلیم کروں شان یورپ نے عالم انسانیت میں ایک موح تازہ پیدا کر دی، اقرار کہ دنیا یاق فرنگ نے عالم ایجاد و اختراع میں، عالم علم و عمل میں، عالم تہذیب و تمدن میں، عالم انشائیت و شائستگی میں ایک جدید راستہ پیدا کر لیا، لیکن غور طلب یہ ہے کہ کیا یورپ کی حضرات رحمۃ اللعالمین ہے؟ کیا یورپ کا تمدن باعث فوز و نفع ہے؟ کیا یورپ کی شائستگی لائق اعتماد ہے؟ کیا یورپ کی ذہنیت

لائق تقلید ہے؟ ہو سکتا ہے کہ جوانی کے نشہ میں، غفلت کی ترنگ میں، نادانی کے دہن میں، ہم اس کی کورانہ تقلید شروع کر دیں، ممکن ہے کہ اس کی ہر ادا ہمارے لئے حجت بھگاد اور فردوس گوش ہو، نامکن نہیں کہ اس کے خیالات و ادعیات ہمارے لئے باعث دلچسپی ہوں، لیکن کیا اس صورت میں حقیقتہً وہ معلم اخلاق، مصلح تمدن، اور بانی بنائے انسانیت و شائستگی تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ آپ کا ارشاد ہے کہ ”جس دور سے اس وقت مسلمان گزر رہے ہیں، وہ ان کے اعطاط و ذوال کا انتہائی دور ہے“ میری گزارش ہے کہ یورپ اس وقت جس صراطِ مستقیم سے گزر رہا ہے وہ یقیناً صراطِ مستقیم ہے، لیکن حکم میں ”بل صراط“ کے ہے، جو بال سے زیادہ باریک اور متواتر سے زیادہ تیز ہے اس کے نیچے ایک غار ہے جو نہ معلوم کتنی مہذب و متمدن قوموں کو حنم کر چکا ہے لیکن اب تک اس کی شکم سیری نہیں ہوئی، مدہوش یورپ مستقبل بدوش یورپ، مست و بیخبر یورپ اب سر کر کے عالم میں ہے اس کے قدم میں تسرزلزل، اس کی حرکت میں ارتعاش، اس کی اداؤں میں اضطراب پیدا ہو چکا ہے، وہ عنقریب اس کا شکار ہونے والا ہے، جیسے اس جیسی نہ معلوم کتنی مہذب و متمدن قومیں ایسی گریں کہ آج ان کے نام کے سوا کوئی یادگار باقی نہیں،

یورپ آج ”برہتہ کنٹرول“ کی لعنت میں مبتلا ہے، جانتا ہے کہ اس مصیبتِ عظمیٰ سے رہائی نامکن ہے، سمجھتا ہے کہ اس لعنتِ سرمدی سے نجات نامکن ہے، محسوس کرتا ہے کہ اس کی کشتی عمر بھنور میں ہے، تو اب وہ یہ نہیں کرتا کہ اپنے ناپاک وجود سے دنیا کو پاک کر دے۔ یہ نہیں کرتا کہ استقلال و ثبات سے اپنی سب سے بڑی زندگی کو ختم کر دے، بلکہ کوشش کرتا ہے اس کی کہ یہ لعنت عام ہو جائے یہ گندے جراثیم تمام اقوام و مل میں راسخ ہو جائیں، تاکہ حشرِ ب کا ایک ہو، بلاشبہ یورپ نے عورتوں کو آزادی دی ہے لیکن آج وہ

سعدی از دست خویش تن فریاد

کا صحیح مصداق ہے، پچھتا رہا ہے اپنی اس حماقت پر، کف افسوس ملتا ہے اپنی اس نادانی پر، تاسف کرتا ہے اپنی اس جہالت پر، چارلی چپلن کے ساتھ اس کی بی بی نے جو کچھ کیا وہ بے لک میں آچکا ہے، اسی قسم کے، بلکہ اس سے بھی بڑے ہونے و اوقات و حادثات ہر روز پیش آتے ہیں، اب وہ خود نادم ہے کہ اس نے اعتدال کو چھوڑ کر افراط کا جو راستہ اختیار کیا تھا وہ کتنا غلط تھا؟ کتنا گمراہ کن تھا؟ کتنا حماقت انگیز تھا۔ آزادی اسلام نے بھی دی، لیکن ”باند اذہ طرف“ یورپ نے بھی آزادی دی لیکن ”بقدر ذوق“ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اعتدال و افراط میں کیا فرق ہے، آپ نے دیکھ لیا

کہ عوام کی ان بیٹیوں کو آزادی مینے کے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں؟ پھر جب قرآن کہتا ہے کہ ”ان کی خدمت عظیم“ تو ماتھے پر شکن پڑ جاتی ہو، ابرو دوں پر بل آجاتا ہو، سلام نے عورتوں کو مسیحیت کی طرح لعنت نہیں سمجھا ہے، اس نے مسجدوں میں جانے کی اجازت دی ہو، کام کاج کرنے کی اجازت دی ہو، میدان جہاد میں خواتین اسلام نے خدمات انجام دے، معرکہ کارزار میں عورتوں نے مرہم پٹی کے فرائض انجام دے، تفسیر فی الدین کیا، علوم فنون پر عبور حاصل کیا لیکن کلب کی ممبری کبھی نہیں کی، مسجدوں میں جانے کے لئے اصرار کیا ملاحظہ ہو:

”حدثني عن مالك، عن يحيى بن سعيد عن عائكة بنت زيد بن عمر، وبن نفيل امرأة عمر بن الخطاب انها كانت تستاذن عمر بن الخطاب الى المسجد فيسكت فتقول والله لاخر جن الا ان تمنعني فلا يمنعهها مؤطا امام مالك من المطبوع من بني حضرت عمر بن الخطاب في زوجه بنت عمر بن الخطاب اجازت حضرت عمر بن الخطاب من طلب فرمايا کرتی تھیں آپ خاموش رہتے تھے، تو فرماتی تھیں خدا کی قسم جب تک آپ مجھے منع نہ کریں گے میں برابر کلوں گی مگر آپ منع نہیں فرماتے تھے“

خواتین اسلام ہی عمر فاروق جیسے باجبروت و باہمت خلیفہ کو برسرِ ممبر ڈک دیتی تھیں، مگر بارگ کی سیر، لوگوں سے اختلاط اور کلب کی ممبری، کبھی آپ کا شیوہ نہیں رہا، وہ انیس خلوت اور رفیقہ حیات ثابت ہوئیں لیکن مشیر کار کی حیثیت انکی کبھی نہیں رہی، اور غالباً جناب نے بھی اپنے اکثر افاضان و کاموئع ہی رکھا، پھر اس انقلاب خیال اور تعمیر عمل کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک طرف تو عورتوں کے لئے افسانہ نگاری اور غزل گوئی کو آپ سرحدِ ممنوعہ کہتے ہیں دوسری طرف کھلے بندوں پھرنے کی اجازت بھی دیتے ہیں،

ابن جبر بوالعجبی است؟

کہا جاتا ہے کہ یورپ رواداری کا علمبردار ہے، مساوات کا مبلغ ہو، اس لئے کہ اس کی حضرات معراج کماں پر پہنچ چکی ہو ایسی تنگ نظری اس سے نہیں سرزد ہو سکتی، قطع نظر کیجئے اس عہد حالات سے جب یورپ پر کلیسا کا اقتدار تھا یورپ کی فرماں فرمائی تھی۔ اس عہد میں نہ فرماؤں کہ دنیائے کربا وجودیکہ یورپ، مذہب کو سیاست سے علیحدہ کر چکا ہو کلیسا کو بے دخل کر چکا ہو لیکن اب بھی لٹش کے واقعات روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ کالوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے کسی گورے کی توہین کی، ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہو، آگ میں جلایا جاتا ہو، یہ سب کچھ آئین نوازوں کا تہذیب

پرست مہج کرتا ہے، بغیر عدالت میں چارہ جوئی کے، پولیس نگاہ غلط انداز سے دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے، سرخیل ہند بان یورپ امریکہ نے ابھی حال ہی میں ہندوستانیوں کو حقوق شہریت سے محروم کیا ہے جس پر ایک غیور خود دار ہندوستانی نے خودکشی بھی کر لی، سرحد منصفین زائد برطانیہ جو سارے جہاں کا درد ہمارے جگہ ہیں

کی صبح مصداق ہے، چین کی طرف سے نظر توجہ ہٹا کر مصر کی طرف پھر توجہ مبذول فرمائی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نحاس پاشا سے وزارت چھین گئی، محمود پاشا برسر اقتدار ہو گئے، پالکینٹ شکست ہو گئی، اور پھر سر اسٹین جیمبرین کا ارشاد ہے کہ ہم مصر کے اندرونی معاملات میں باطل دخل نہیں دیتے، پل کی پل میں بیک گردش چشم نیلوفر، عراق پر بھی ہماری سسر کار دولت مارے ہوئی جہاز اڑنے لگے، ایران سے بھی معاہدہ ہو گیا، تہذیب و تمدن، انسانیت و شائستگی، حضارت و مدنیت، کا یہ کتنا شاندار اور دلفریب مرقع ہے؟

کہا جاتا ہے کہ طفل یورپ پان اسلام ازم کے ہوسے سے خائف نہیں ہے جس عرض کرتا ہوں کہ یہی تو وہ دھڑکا ہے جس کے تحلیل کے ایک طفل یورپ رعشہ بر اندام ہو جاتا ہے، گزشتہ جنگ عمومی میں یہ ہوا جناب لائڈ جارج صاحب جمیع القابہ کو نظر آیا تھا اور بڑی بیجا رگی اور بکبی کے لہجہ میں ارشاد ہوا تھا کہ مسلمانوں کی ایک دیوار ہے، جو چین سے لیکر ”تائیچاک کا شہر“ ہندوستان سے لیکر مصر اور مصر سے لیکر تمام دنیا تک قائم ہے، اس آہنی دیوار سے جو اپنا سر ٹکرائے گا، خود اس کا سر پاش پاش ہو گا مگر اس دیوار میں تسرزل بھی نہیں نہیں ہو سکتا، اور طفل یورپ کا یہی وہ دھڑکا تھا جس نے کابل کے سیدار بخت و جواں ہمت فرماں روا کو ہندوستان کی سیاحت نہیں کرنے دی اور ہاں یہی وہ ہوا تھا جسے ابن سعود کے ہاتھوں موثر اسلامی کا خاتمہ کرایا، اور یہی وہ ہوا تھا جس نے عبدالعزیز ثعلبی کو تیونس سے جلا وطن کرایا، جس نے برکت اللہ بھوپالی کا ”دیا وغیرہ“ میں ”وطن سے دور“ خاتمہ کرایا، انسانیت اور شائستگی کا یہ کتنا دلفریب نمونہ ہے؟

غرض یورپ کے کن کن کمالات و احسانات کا شکریہ ادا کیا جائے، اس نے عالم انسانیت پر جو عظیم احسانات کئے ہیں، دنیا نے خدع و فریب میں جو جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، مشکل ہے کہ اس کو زہ میں اس دریا کی دست آسکے، مختصر آیوں سمجھئے کہ:-
 ذفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم، کرشمہ دہن دل میکشد کہ جای خاست

ارشاد کیا گیا ہے کہ چونکہ تجزیہ شاد ہے کہ باندازہ درازی داری کی مصیبت پر درسی بڑھتی جاتی ہے اس لئے یقیناً اب داری رکنا صورت ہی بگاڑنا ہے، اور نماز اس لئے اور یقیناً قابل مضحکہ ہے کہ اس سے ہمت اجتماعی کے فوائد میں حاصل ہوتے، عرض ہے کہ ”بزم میں اہل تماشا“ کے ہونے سے اہل نظر کے فقدان کا تو حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ یہی نماز تو اس سے صرف ہمت اجتماعی کا پیدا کرنا مقصد نہیں تھا بلکہ ذاتی نیایش و عبودیت کا اظہار بھی تھا، اور یہ مقصد ہر حال حاصل ہے۔

مجھے امید ہے کہ میرے ان ناچیز خیالات کو نگار میں جگہ دیکر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے، بہتر ہو تاکہ آپ ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر آپ اپنے خیالات کا اظہار فرماتے، تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں،

رہیں احمد جعفری

(نگار)۔ عزیز من، آپ نے جس جوش و ولولہ کے ساتھ یہ تحریر سپرد قلم کی ہے اس کی داد تو یقیناً آپ کو ملتی چاہئے لیکن استدلال و استنتاج کے لحاظ سے (معاف فرمائیے) اگر یہ کہوں کہ آپ کی یہ تمام ”کا و کا و خامہ فرسائی“ شورش کثابت کی تسکین کے سوا اور کچھ نہیں ہے نہ اس لئے کہ قضایا کی ترتیب ناقص ہے، نہ اس لحاظ سے کہ نتیجہ آپ جو کچھ پیدا کرنا چاہتی ہیں وہ دلائل کے منافی ہے، بلکہ صرف اس سناو ہے کہ شاید جس طرح آپ اپنا مافی الضمیر اس سے قبل صحیح طور سے نہ پیش کر سکے تھے، اسی طرح میری غالباً اپنا مدعا نہ سمجھا سکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو یورپ کی تہذیب و معاشرت پر گفتگو کرنی پڑی حالانکہ وہ بالکل خارج از بحث امر ہے۔

میرا یہ کہنا کہ تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل کا وقت کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں ”ہرگز اس نتیجہ کو مستلزم نہیں ہے کہ ہم یورپ کی تہذیب و معاشرت کو کلیتہً قابل تقلید سمجھ کر اس کی پیروی کرنے لگیں۔ میں نے آج تک کبھی اس کی تائید نہیں کی اور میں افرنجیت و تفرنج کو مستحقاً فطرت انسانی سمجھتا ہوں۔

میرا مدعا یہ ہے کہ اب سے ۱۳۰۰ سال قبل ملک عرب میں پٹھکرجو قوانین ہماری معاشرت و تمدن کے لئے مرتب ہوئے تھے، وہ آج، ہندوستان، ترکی، ایران، افغانستان، افریقہ، مصر، چین، ہر جگہ عموماً کے ساتھ قابل عمل ہیں ہو سکتے اور اس لئے اگر ماحول کے لحاظ سے ضروریات زمانہ کے اقتضا سے، سیاسیات و قت کی بنا پر اختلاف آب و ہوا کی وجہ سے، دیگر اقوام عالم کی ترقی علوم و فنون و دوش بدوش دنیا میں عورت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے، ان قوانین کو بدل دینے کی ضرورت ہو، تو یقیناً انہیں بدل جانا چاہئے۔

اگر اسلام اس امر کا مدعی ہے کہ وہ ناسخ ادیان سابقہ اور ماحی مذہب ہمدیہ ہے، یعنی اگر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انسان کو جذبہ و شائستہ بنانے کے لئے، جامعہ انسانیت کو شین حیثیت ہی اکل ”تاہم کون میں سر بلند و ممتاز کرنے کے لئے اسلام آخری تعلیم اور بالکل آخری لفظ ہے، اگر ”انتم الامم الا علون ان کنتم مومنین“ کوئی الہامی پیشین گوئی، کوئی خداوندی کلیہ ہے، اور اگر مسلمان انسان ہے اور انسانیت نام ہے صرف عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اتنا بڑا دعویٰ بغیر دلیل کے تسلیم کیا جاسکتا ہے، اور اگر ہم آپ تسلیم بھی کر لیں تو کیا ہوتا ہے، دنیا تو اس کے لئے بھاری نہیں ہو سکتی۔

پھر غور کیجئے کہ آپ کے پاس اس دعوے کی کیا دلیل ہو؟ سو اے اس کے کہ آپ اپنے ہاں کی تعلیم کو پیش کریں اور کیا کر سکتے ہیں، پھر اگر وہ تعلیم اس قدر عمدہ و گہرے اتنی وسیع اور اس درجہ پچھلی ہو کہ ہر وقت و زمانہ ہر ملک و قوم کے حالات و طبائع اور امیال و عواطف کا ساتھ دے سکتی ہو تو بیشک آپ کا دعویٰ صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے ورنہ نہیں۔

کلام مجید میں سوئے بعض معاشری احکام کے (جن میں طلاق، نکاح، ترکہ وغیرہ شامل ہیں) اور جن کا اُس وقت کی ضروریات کے لحاظ سے نقص قطعی کی صورت میں پیش کرنا ضروری تھا، اور جن میں اب ضرورتِ زمانہ کے لحاظ سے تفسیر ضروری ہو اور تمام تعلیمات ایسی ہیں جن میں ازل سے ابد تک کسی وقت کسی تغیر کی ضرورت نہیں، نہ اس لئے کہ انکا تعلق ایسے حقائق مسئلہ اور بدیہیات واضحہ سے ہے کہ ان پر بحث کرنے کی کسی وقت حاجت ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ہماری حیات و ارتقاء کا انحصار انہیں پر ہے مثلاً خدا کی وحدانیت انبیاء کی رسالت کہ ان کا تسلیم کرنا انسانی سرایتگی کے دور کرنے اور اجتماعی فضا ط پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ یا درس اخلاق کہ اس کی اہمیت بھی کسی وقت کم نہیں ہو سکتی اور دنیا خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اس کو نظر انداز نہیں کر سکتی یہاں تک کہ آج یورپ بھی جو علم بہت سی بد اخلاقیوں کا مرکز ہے، مگر اب اس کا دعویٰ حمایت کرتا ہو۔ یقیناً یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اخلاق کی تعلیم اور اخوت کا درس تو ہر مذہب نے دیا ہے پھر اسلام میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بنا پر اس کو خاتمہ الکلام اور مقطع الخدایہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کا جواب فرنگی محل اور دیوبند یا اپنے دارالعلوم ندوہ کی مضامین سے ڈھونڈئے، بلکہ اس کے لئے خود تھوڑی سی توسیع نظر اور اجتہاد فکر سے کام لیجئے جو ہر شخص کا فطری حق ہے اور اس وقت آپ کو معلوم ہو گا کہ کلام مجید کیوں دوسرے صحف آسمانی اور کتب الہامی سے ممتاز ہے۔

یہ امر مسئلہ عالم ہے کہ صحیح معنی میں رشد و ہدایت کی زبان و تجنیل وہی ہو سکتی ہے جو جماعت مخاطب کی فہم و ادراک سے قریب تر ہو۔ اگر عام لوگوں کے سامنے بجائے اصول و ضرورت مذہب کے فلسفہ مذہب کی تاریخ پر گفتگو کی جائے تو وہ بالکل نہیں سمجھ سکیں گے کہ کسے والا کیا کہہ رہا ہے اور اس لئے ان پر کوئی اثر بھی نہ ہو گا۔ اسی نکتہ کو پیش نظر رکھ کر تمام صحف آسمانی یا کتب ملئمہ کا نزول ہوا۔ پھر چونکہ موسیٰ، عیسیٰ، بودھ، کرشن وغیرہ تمام انبیاء سابقہ کے زمانہ میں دماغ انسانی نے اس قدر ترقی نہ کی تھی کہ وہ اعمال نیک و بد، جزا و سزا کے معمولی اور سطحی مفہوم کے سوا حقیقی معنی کو سمجھ سکیں، اس لئے ان کے سادہ دماغوں کے سامنے کوئی پیچیدہ مسئلہ پیش نہیں کیا گیا اور مابعد طبیعیات کی دنیا قائم کر کے بہشت و دوزخ، عذاب و ثواب آخری کی زبان میں لوگوں کو عمل نیک کی دعوت دی گئی اور یقیناً وہ اثر ہوا جو مقصود تھا۔

جب نبی آخر الزماں کا ظہور ہوا تو اس وقت بھی دنیا کوئی خاص ترقی نہ کر چکی تھی، لیکن خدا کے علم میں تھا کہ وہ دور نبضت و ارتقاء جو منتہائے نظر فطرت ہو سکتا ہے، اسی دور ظلمت و تاریکی کے بعد آنے والا ہے، اس لئے قرآن کو اُس تعلیم کا حامل بنا کر نازل کیا جس کے بعد پھر کسی اور تعلیم کی ضرورت نہ ہو، یعنی اگر اس میں ایک طرف بلید دماغ والوں کے لئے وہی تعلیم کی ”سادگی“ ملحوظ رکھی گئی جو اہم سابقہ کے لئے ان کے انبیاء نے اختیار کی تھی تو دوسری طرف وہ ”ہر کاری“ بھی پیدا کی گئی جس کے سمجھنے کے بعد تمام اور تعلیمات

حرف غلط ہو کر رہ جاتی ہیں۔

دیگر ادیان کی تعلیم کا ناقص پہلو باعتبار دنیاوی ترقی کے، جز اور سزا اور حیات بعد الموت کی تعلیم میں یہاں تھا، لیکن قرآن ہی اول وہ صحیفہ آسمانی ہو جس نے اس خیال اور تعلیم کی حقیقت کو ظاہر کیا اور بتایا کہ جو کچھ انسان کو اس باب میں اس وقت تک بتایا گیا وہ صرف ایک تعبیر مصالحت تھی، درنہ حقیقت یہ ہو کہ دوزخ و جنت، عذاب و ثواب سب اسی دنیا سے متعلق ہے، یہاں تک کہ احیاء مومنوں سے بھی مراد صرف مردہ اور جاہل قوموں کا زندہ ہو جانا ہے۔

کلام مجید میں کوئی ایک تعلیمی آیت بھی ایسی نہیں ہو جس میں درس عمل نہ دیا گیا ہو اور محض زبانی حمد و ثنا یا مقامی تسبیح و تہلیل کی طرف ترغیب دلائی گئی ہو۔ اسلام نے ظاہری مراسم یا سطحی باتوں کی طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اُس نے صرف ”جما کسبت قلوبکم“ کو دیکھا اور اسی پر آخری حکم لگایا سو جہاں سیئات کا ذکر کیا، اُس سے غیر عملی اور غیر مجاہدانہ زندگی مراد لی اور جہاں حسنات کا ذکر کیا اس سے عمل اور اجتہاد مراد لیا۔ اس نے بتایا کہ جنات عدن سے مقصود سوائے قومی ترقی کے اور کچھ نہیں ہو اور جہنم کا مفہوم اجتماعی انحطاط و زوال ہو۔ خود و تصور کو نردسلیل کے معنی نبی آخر الزماں کے ظہور سے قبل خواہ کچھ بھی رہے ہوں لیکن محکم کے ذریعہ سے خدا نے ان الفاظ کا مفہوم صرف دنیاوی فلاح و ترقی قرار دیا، کیونکہ اگر نہ کے بعد کسی عالم کو تسلیم کر لیا جائے تو وہاں کی خوشحالی یہاں کی تکالیف کا کیا بدل ہو سکتی ہو جبکہ اس کے بعد پھر کوئی حیات عمل انسان کو دی جانے والی نہیں ہے۔ الغرض میں نے جہاں تک غور کیا ہو یہ تعلیم ————— صرف قرآن پاک نے دی اور یہی وہ امر ماہہ الامتیاز ہے جو صحیفہ محمدی کو صحف موسوی و عیسوی وغیرہ سے جدا کرتا ہے۔

پھر جس مذہب میں ترقی کی تعلیم اس قدر زبردست ہو اس کا اس قدر قدامت پسند ہونا کہ سیکڑوں سال قبل جو ایک طریقہ مقرر کر دیا گیا ہو اس میں کسی تغیر کو قبول نہ کرے کس حد تک قرین عقل و انصاف سمجھا جاسکتا ہو آپ خود اپنے ہاں کے قیاس، اجتہاد اور اجماع کو دیکھئے کہ یہ کیا ہیں۔ کیا یہ تغیر و تبدل کے مقتضی نہیں ہیں کیلئے کا وجود اس لئے نہیں ہو کہ ان کے ذریعہ سے ہم وقت ضرورت کے مطابق قانون معیشت و معاشرت بنا سکیں۔

پھر جب یہ امر نہ صرف قرآن حدیث بلکہ اکابر امت کے اقوال و عمل سے بھی ثابت ہو تو آج میرا یہ کہنا کہ ”ہماری تمام معاشرتی اور تمدنی مسائل وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر ہیں“ کیوں چین پینانی کا باعث ہوتا ہو آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس تغیر سے مراد یہی ہو کہ بالکل یورپ کی زندگی کو اختیار کر لیا جائے۔ یہ تو میں نے کبھی ظاہر نہیں کیا، لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر اہل یورپ میں کچھ باقین قابل تقلید ہیں تو ان کو کیوں نہ اختیار کیا جائے۔

جب کہ ارشاد نبوی

الحکمة ضلالة المؤمن۔ ”موجود ہے“

آپ نے اہل یورپ کی موجودہ معاشرت کے جو جو نقائص ظاہر کئے ہیں ان سے انکار نہیں لیکن اگر آپ اسی سلسلہ میں

”نیشنل میگزین“ پر بھی عمل کرتے تو بہتر تھا۔ اگر اہل یورپ میں سو سبب ہیں تو دو چار خوبیاں بھی ہونگی، لیکن ہمارے معائب و محاسن میں تو یہ نسبت ہی نہیں ہے، پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے عادات و خصائل پر نکتہ چینی کا کیا حق حاصل ہے اور اس کو سوائے اس کے کہ *Poor man's Consolation* سے تعبیر کیا جائے اور کیا کہہ سکتے ہیں، اگر دانا یا نازنگہ کی ایجاد و اختراع، علم و عمل آپ کے نزدیک لغو و بیکار ہے، اگر ان کی دنیاوی حقیقی آپ کے نقطہ نظر سے زوال و انحطاط ہے، اگر ان کی ذہنیت آپ کے لئے لائق تقلید نہیں ہے تو خدا کے لئے بتائے آپ کس راہ پر نفع انسان کو بچانا چاہتے ہیں اور وہ صراطِ مستقیم آپ کی کوئی ہے جس کے نیچے کوئی غار“ نہیں پایا جاتا۔

اگر آج یورپ ”برہنہ کنٹرول“ کی لعنت میں مبتلا ہے تو کیا ایشیا میں افزائشِ نسل کے ساتھ فائدہ کنشی کو برکتِ خداوندی گہیں گے۔ اگر علوم و فنون کی ترقی آپ کے نزدیک خدا سے انحراف ہے تو خدا کے لئے بتائے کہ جہل و جمود کیونکر خدا تک پہنچا تا ہے اگر یورپ کا انسان اپنے اعضاء سے کام لیکر رات دن محنت کرتا ہے تو آپ کے ہاں کا وہ زاہد شہزادہ و پرجہ توکل پر پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا ہے کیوں اس پر ہنسنے، جبکہ وہ بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ خدا نے ہاتھ کی بائخ و انگلیاں اسی لئے بنائی ہیں کہ انسان پھاوڑا لے اور زمین کھودے ورنہ محض تسبیح ہلانے کے لئے صرف ایک انگوٹھا اور کلہاڑی لگنی کافی تھی۔

آپ نے مغربی عورت کی آزادی کا جند موم پہلو پیش کیا ہے وہ بالکل صحیح و درست ہے، لیکن بندہ نواز یہاں کی ”پرہیزگار“ حرمِ ناز“ کی تردستی بھی تو اس حد سے گزر گئی ہے کہ اس کو بچوڑ کر فرشتوں کو وضو کی دعوت دیجائے۔

اگر وہاں کا مرد عورت کی آزادی سے پریشان ہے تو یہاں کی عورت مرد کے ظلم و استبداد سے چیخ اٹھی ہے، اگر وہاں اخلاقی انحطاط زیادہ ہے تو نقشہٴ دولت کی وجہ سے، لیکن انسوس تو ہم پر ہے کہ دولت ہی نہیں اور حسنِ اخلاق ہی نادر۔ وہ اگر معصیت کرتے ہیں تو ”غدا رہا پذیر“ کے ماتحت، اور آپ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اس حال میں کوئی حیلہ غیر شرعی ہی موجود نہیں۔ وہ تو علانیہ کہتے ہیں کہ عصمتِ انسان کی کوئی بڑی ممدوح و مہتمم بالشان صفت نہیں ہے کیونکہ اگر آج دنیا مصوم ہو جائے تو کائنات میں خاک اڑنے لگے۔ لیکن آپ تو اس کو غایتِ انسانیت سمجھتے ہیں اور پھر ترک کئے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح میں یورپ کے ظلم و استبداد، غیر رواداری، عدم مساوات وغیرہ تمام سیاسی و اخلاقی معائب کا معترف ہوں، لیکن میں کبھی احمادِ ذکر مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ یورپ کے بدترین اخلاق کے مقابلہ میں جب ہم ایک بھی کوئی اس کا ضد پیش نہیں کر سکتے، تو ہم کو اس پسند و موغظت کا کیا حق حاصل ہے۔ آپ کا یہ طعن مغرب کے خلاف صرف بیدست و بیا، جاہل و ناقابل، کاہل و مجہول غلامِ کاسا غصہ ہے جو اپنے ہاتھ پاؤں کی بیڑیاں کٹانے کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے صرف ظالم آقا کو گالیاں دینا ہی نہ یہ نجات سمجھتا ہے۔

پان اسلامزم کے متعلق آپ نے لائڈ جا ساج کا جو فقرہ نقل کیا ہے اس سے آپ کا یہ نتیجہ نکالنا کہ یورپ واقعی اس مفروضہ خطرہ سے خائف ہے (معاف فرمائے) انگریزی ذہنیت اور ڈپلومیسی سے آپ کے عدم واقفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ پہاڑ کو رانی بنا دینے کے لئے وہ کیونکر پہلے رانی کو پہاڑ بنا کر دکھاتے ہیں۔ ورنہ لائڈ جا ساج اس قدم حق نہیں

ہو سکتا کہ اپنی قوت کے مقابلہ میں ہمارے ضعف کو محسوس نہ کر سکے۔ پان اسلام ”بالقوة“ یقیناً نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی لحاظ سے لائبریرج نے یورپ کو اس سے متنبہ کیا لیکن جہانگیر ”بالارادہ“ کا واسطہ ہے، وہ اور سارا یورپ اب اسی طرح مطمئن ہے، جیٹھڑ ہم آپ مایوس ہماری عملی قوت کا امتحان کافی ہو چکا ہے، اب خواہ مخواہ کے ”تیوروں“ سے کچھ نہیں ہوتا، بندر بچانے والا جانتا ہے کہ جب تک ہاتھ میں ڈنڈا موجود ہے بندر کو ناچنے سے مفر نہیں، اور اس لئے وہ بندر کی ”بھیکوں“ کی ہی پروا نہیں کرتا اور جب چاہا ہے گردن کی رسی کو جنبش دیکر اپنی قوت کو تسلیم کر لیتا ہے۔

نیاز

الاحتجاج والاعتذار

مولانا نیاز فتحپوری نے اپنے اگست کے نگار میں مجھ پر تین نظم کئے ہیں۔ دو کی شکایت تو میں ان سے پرائیوٹ طور پر کر چکا ہوں ایک تو میرے مضمون مذہب اور النیات سے متعلق ہے جس کا زیادہ حصہ سہو یا اراداً حذف ہونے کے بعد تمام سلسلہ مضمون خطوط بے ربط ہو گیا ہے اور دوسرے یہ کہ مضمون مذہب اور نبوت میں کتابت کی نہایت فاض غلطیاں رہ گئی ہیں جو کتابت نبوت کو نبوت، اور قیامت کو قیامت یا مغز کو مغز لکھے ہیں اس کتاب کی جان کو روکوں یا سنگی طباعت کو یا اردو کے طرز تحریر کو بہر صورت مولانا نیاز اگر ایک نظر کافی کو دیکھ لیتے تو یقیناً بہت کچھ اصلاح کتابی غلطیوں کی ہو جاتی، غیر تیسری بڑی شکایت مجھے ان کے ”محکمہ“ سے ہے۔ اور اس کے متعلق میں پہلے طور سے پرائیوٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اپنے رسالہ کی آئندہ اشاعت میں اس کو جگہ دیدیں۔ اگر احتجاج کا مفہوم پرائیوٹ سے ادا ہو سکتا ہو (جو خود اہل زبان نہیں سمجھتے ہیں) تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میں محبت سے زیادہ اپنی معذوریوں پر نگاہ رکھ کر شکایت کرتا ہوں۔

افسوس ہے کہ مولانا نیاز نے اپنے محکمہ میں بہت عجلت اور بے تابی سے کام لیا۔ اگر وہ جوڑا اور انتظار کرتے تو آئندہ محکمہ مذہب اور عبادات کے عنوان سے جو مضمون ہوتا اس سیر ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں یا اگر وہ مذہب اور قومیت کے مضمون کو ذرا اور غور سے پڑھتے تو ان کا وہ اعتراض جو انہوں نے کیا ہے خود بخود اٹھ جاتا۔ کیونکہ میں خود اس کا قائل ہوں کہ مذہب کا ایک مقصود جمہلیت اجتماعی کی تشکیل و تنظیم بھی ہے۔ اور مجھے خیال نہیں پڑتا کہ میں نے اس مضمون میں عبادات و معاملات میں کوئی تاویل کی ہو۔ میرے مضمون کے تنقیح طلب در مسئلے تھے۔ آیا اسلام قومی مذہب ہے یا عمومی۔ دوسرے یہ کہ قرآن اسلام کے لئے کافی ہے یا نہیں، اگر وہ ان دو تنقیح طلب سئلوں پر محاکمہ کرتے تو میں اس کو سرانجاموں پر رکتا مگر اصل تنقیح طلب سائل کو جو پورے صرف سلسلہ گفتگو میں تازہ زار کان پر جو میں نے کچھ کلام کیا اس کی انہوں نے گرفت کر لی۔ اور اسپر دو تین ورق سیاہ کر ڈالے شاید وہ ان حضرات کے خاطر سے ایسا کرنے پر مجبور ہوئے ہوں جنہوں نے مجھ پر سب و شتم کرنے ہی پر اکتفا نہ کی ہوگی بلکہ خود مولانا

نیز کے بائیکاٹ کا نوٹس دیا ہو۔ مگر میں مولانا کو کم سے کم اپنی ذات سے یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ لہیت کی بنا پر اگر سب دشم
کیا بھی جائے تو میں اس کے سننے کے لئے بھی تیار ہوں اور جو حضرات اس کے لہیتاب ہوں ان کے لئے مضمون کے آخر میں
میں نے اپنا پورا پتہ دیدیا ہے کہ وہ خود براہ راست مجھ کو گالیاں دے لیں اور مولانا نیز کو مجھ تک پہنچانے کی تکلیف دیں
کیونکہ میں جانتا ہوں کہ جو حضرات اس بات کے خوگر ہیں وہ اس کے جواز کے لئے حضرت عباس عم رسول اللہ کا جناب علی
کرم اللہ وجہہ کو خالی الخادہ لکھیں کہنا یا عبد اللہ ابن زبیر اور ابن عباس کی ملوثی پر ہمت کہ جس کا ذکر صحاح ستہ میں بھی ہے
مثلاً پیش کریں گے اور جو شخص مذہبی اور لہیت میں تو جناب موسیٰ نے حضرت اہد کی داڑھی کھینچ لی تھی اور توبت
کی اوجہ کو اٹھا کر پھینک دیا تھا

مولانا نیاز نے مجھے خواندہ فہمی مسائل میں گھسیٹ لیا۔ حالانکہ نہ میں اس کا اہل تھا اور نہ میں قرآن سے باہر ضحاک و
کعب احبار کی پرواہ کرتا ہوں۔ مگر اس معاملے میں مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے ایک ابتدائی غلطی ضرور ہوئی اور یہ کہ مذہب
اور فریٹ کا مضمون وہیں ختم کر دینا چاہئے تھا۔ جہاں تک جون کے پرچے میں چپ چکا تھا۔ اور بقیہ حصہ جو جولائی کے
پرچے میں شائع ہوا ہے۔ وہ درحقیقت مضمون کے سلسلہ میں نہ تھا۔ بلکہ آخر میں ایک نوٹ تھا جو بارہا یک حرفوں میں
نیچے لکھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اور چونکہ وہ نوٹ نہایت سرسری طور سے لکھا گیا تھا۔ میں نے مسائل حدیث اور فقہ کو قرآن سے
دائد دکھانے کے قصد سے۔ یہاں تک میں اتنا بڑھادیا تھا کہ چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لہذا انہوں نے یہ ایک ایسی جنگاری تھی
جس نے مصلوٹوں کے دل و جگر میں ایک آگ لگا دی میرا خیال تھا کہ جب میں دوسری کتاب تشریل القرآن لکھو گا تو
اس میں ہر ایک مسئلہ اعتقادی اور اعمالی پر جو قرآن سے باہر حدیث میں ہے اس کی لغویت کی حیثیت سے ثابت کرتا
اور دکھاتا کہ ایسی تمام حدیثیں موضوعات اور اسرائیلیات ہیں۔ مگر میں نے جو ش میں اس نوٹ کو لکھ کر ڈالا
اور اس کو میں اب واپس لینے کیلئے تیار ہوں۔ اس لئے کہ میں ابھی اس مسئلے کی پوری منصفی کے قابل نہیں ہوں۔
ہاں میرا شک اب بھی یہی قول ہے کہ نماز اگر دنیاوی مشاغل کی انتہا میں آدھی جائے تو اس سے بہتر ہے کہ نماز کو حرکت
کر دیا جائے کیونکہ جو نماز یکسوئی اور حضور قلب سے نہ پڑھی جائے وہ نماز ایک تم کا تس ہے۔ محض منہ سے چند الفاظ
کو بڑ بڑا لینا اور چند بار اٹھک مٹھک کر لینا نماز کا مقصد نہیں۔ لیکن اس قسم کی نماز ہمیشہ سیوت عادات کی جا بگلی جو
اوقات قرآن سے باہر ہے یکسوئی اور حضور قلب کا سب سے بہتر وقت وہ ہے جب کہ آدمی صبح اٹھتا ہے اور جب رات کو
وہ آرام کرنے جاتا ہے۔ اور جب وہ اپنے کاروبار سے فراغ ہو کر اپنے گھر آتا ہے۔ قبل طلوع الشمس و قبل غروب ہوا میں اٹھ لیں
اس وقت اگر کوئی خدا کی طرف منہ نہ کرے تو نہایت بد بخت ہے۔ ہاں یوم جمعہ کو اگر مسلمان اسلامی سلطنت میں ہو جائے
اس کو اس روز چٹی مل جاتی ہے تو اس روز جمعہ کی نماز دو پہر کو جماعت پڑھنا فرض ہے۔ یہ جو قرآن کا حکم۔ میں
یہی کہتا ہوں کہ قرآن مجید میں سوائے ان تین موزوں اور فطری اوقات کے اور کسی وقت کی نماز ثابت نہیں۔

حقاً کہ صاحب ہدایہ کہ جب پانچ وقت کی نماز ثابت کرنی پڑی تو انہوں نے مجبور ہو کر ”فصلین الذی حین ہستون وحین قطھون کی تاویل کی مگر تاہم صاحب ہدایہ اپنے دل میں کبھی خود اپنی تاویل سے مطمئن نہ ہوئے ہوں گے، مولانا عبدالقادر اور ان کی تقلید میں مولوی نذیر احمد دہلوی نے ”اطراف النہار“ سے دو ہر کے معنی لئے ہیں۔ مولوی نذیر احمد نے اطراف النہار کے معنی دن کے لگ بھگ کئے ہیں۔ لیکن اگر وہ کذاب اور بیضادی کی تفسیر دیکھیں تو اطراف النہار کے معنی محض صبح اور شام کے وقت کے ہیں اور یہی اصطلاح عرب کی ہے۔ عرب کو میں نے کبھی اطراف النہار سے ظہر مراد لیتے ہوئے نہیں سنا۔ ”لوک الشمس الی غسق اللیل“ محض قبل طلوع الشمس و قبل غروب ہا کی تفسیر ہے اور جنہوں نے اس سے پانچ وقت کی نماز کی تاویل کی ہے۔ وہ مولانا محمد علی احمدی صاحب ہیں ظاہر ہے کہ ان کے دہم کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ پھر اگر آپ قرآن کو غور سے پڑھیں تو آپ کو اس آیت پتہ چل جائیگا کہ ظہر کی نماز کو فرض کرنے کا خیال ہی قرآن حکیم کو نہ تھا یعنی پہلی بیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم دوسروں کے غفلت میں جانے سے پہلے فلاں اوقات میں اذن لے لیا کرو۔ ایک وقت کا ذکر اس میں اس طرح ہے کہ بعد صلوٰۃ النسا لکھ دوسرے وقت میں محض ظہیر یعنی دوپہر کے وقت۔ اگر ظہر کی نماز قرآن سے ثابت ہوتی تو جس طرح صلوٰۃ النسا کیا گیا ہے۔ اسی طرح صلوٰۃ الظہر کہہ سکتے تھے علاوہ اس کے یہ سب جانتے ہیں کہ جمعہ کے روز ظہر کی نماز نہیں پڑھی جاتی کیوں؟

اب آپ روایات پڑھ لے۔ اسد الغابہ میرے پاس اس وقت موجود نہیں۔ مگر میں اپنے حافظہ پر اعتماد کر کے لکھتا ہوں کہ اسد الغابہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہجرت سے قبل آنحضرت دو نمازیں صبح و رات کی ادا کرتے تھے اور یہی فرض ہیں، بعد ہجرت نماز دو سطلے یا نماز عصر فرض ہوئی۔ خود دو سطلے کے معنی یہی بتا رہے ہیں کہ وہ تین کے بیچ میں ہو اور عین کے بیچ کو ہی وسط کہتے ہیں یعنی اول اور آخر دو سطلے۔ مسلم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ آنحضرت نے ظہر و عصر اور مغرب اور عشاء کو بلا عذر و بلا خوف و بلا سفر جمع کہا ہے۔ نسائی، ابن سعد حدیث کو نقل کرنے کے بعد تعجب سے لکھتا ہے کہ یہی ایک سنت ہے جو چارے زمانے میں لوگوں نے ترک کر دی ہے اب سوال یہ ہے کہ آنحضرت نے بلا عذر کیوں جمع کہیں میرے نزدیک تو اس کی سیدھی سادھی تاویل یہ ہے کہ آپ نے تین وقت کی نمازیں ادا کیں اور آپ نے وقفہ دیکر نمازیں پڑھیں راوی نے اس کو دو وقت کی نماز سمجھ لی۔ اب اگر آپ حدیث پڑھیں تو عصر و ظہر کے اوقات میں اس قدر اختلاف ہے کہ ذرا غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عصر و ظہر کو ایک ہی وقت سمجھا جاتا تھا۔ یہ حدیث کہ آنحضرت ہر شب معراج میں بیچاس وقت کی نماز فرض ہوئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس حدیث کو میں قطعی موضوع سمجھتا ہوں اور اگر موضوع نہیں ہے تو وقوع ضرور ہے۔ اس واسطے کہ اس کے راوی انس ہیں اور انس کی عمر آنحضرت کے وفات کے وقت انیس برس کی تھی۔ اور آنحضرت کو معراج اس وقت ہوئی ہے۔ جبکہ انس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہوگی۔ اور ابو ہریرہ اور ابن عباس کا تو اس وقت پتہ بھی نہ تھا۔ یہ روایت اگر ابو بکر صدیق یا حضرت علی کی ہوئی۔ تو اور بات تھی علاوہ اس کے اگر معراج

کا یہ واقعہ صحیح ہو تا تو قرآن کے سورہ معراج یا سبئی اسرائیل میں اس کا ذکر ضرور ہوتا مگر وہاں ہم کیا پاتے ہیں؟ اقامت الصلوٰۃ لعلک الشمس لی عشق اللیل ”قرآن الفجر“ میں کہتا ہوں کہ معراج کہ آسانی خود ایک معارضہ جو در نہ نماز کی تعین اس بھونڈے طریقہ سے اندر میاں کے ہاں ہو جیسے نمود یا تشدد نہ بنے کا سودا تھا۔

اب اجماع امت کا سوال باقی رہ گیا۔ مجھے خوف ہے کہ اگر اس کے متعلق میں کچھ کہوں گا تو وہ ہمزما (Homonym) گولڈزہر (Goldzher) اور دلہان (Wellhausen) کی تحقیق کا نتیجہ ہو گا اور لوگ مجھے مقلد فرنگ سے مطعون کریں گے۔ مگر دل کی بات ہو کہتا ہوں۔

تمام سامی مذاہب میں انھیں تین اوقات کی نماز فرض تھی اور قرآن کا تعین اوقات کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ بہت سے اکان جو ہمارے یہاں فرائض میں داخل ہیں وہ یہودیوں کی کتاب تالمود میں ملتے ہیں مجوسیوں میں نماز کے پانچ وقت ہیں جو نماز پنجگانہ کہلاتی ہیں (نماز اصل عجمی لفظ ہے اور نشتے کا سنسکرت لفظ اسی لفظ سے نکلا ہے) قرآن اولیٰ کے مسلمانوں پر ایک دور ایسا گزرا ہے جب کہ انہوں نے عرب سے نکلنے کے بعد اپنے ماتحت قوموں جیسی دیوں کے مذہب اور عبادات کا موازنہ اپنے مذہب سے کیا ہے۔ اور چونکہ اس وقت مسلمانوں کو شدت سے جوش مذہبی تھا وہ یہ دگوارا کرتے تھے کہ وہ مذہبی غلو اور تشدد میں ذمی قوموں سے کم رہیں۔ اس لئے جب یہودیوں کے ہاں انھوں نے حجم زانیہ اور ساحرہ اور مزید دیکھا تو انہوں نے خیال کیا کہ قرآن کا اس بارے میں سکوت کہیں ان کو دوسرے مذاہب کے آگے خفیف نہ کرے، انھوں نے فوراً یہی احکام اپنے ہاں لے لئے۔ حتیٰ کہ حجم زانی میں تو انھوں نے قرآن کے مخرف ہونے کا دعویٰ ہی کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے جب مسیحی راہبوں کو ہر وقت نماز پڑھتے دیکھا اور کو نماز پنجگانہ ادا کرتے ہوئے دیکھا تو ان کو حوصلہ ہوا کہ تین وقت کی مختصر نماز قرآن سے بڑھ کر ذمی قوموں کو نماز دکھلائی جائے۔ اسی زمانے میں ایک فرقہ عرب میں عراق کی سرحد پر پیدا ہوا جس نے اپنے اوپر پنجاس وقت کی نماز فرض کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے کھیت جو تنہا چھوڑ دیا مزدوروں نے کام کرنا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں بتری پھیل گئی۔ امیر خلیفہ نے اس فرقے پر فوج کشی کی اور ان کو منتشر کر دیا۔ مفسرین اور محدثین عجمی ہیں شکل سے ایک فیصدی اس میں عرب تھے، وہ لوگ اور خود امام ابو حنیفہ یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ وہ مسلمان ہو کر مجوسیوں سے بھی نماز کم رکھیں اور انھوں نے اسکے لئے حدیثیں وضع کیں اور مسلمانوں پر پانچ وقت کی نماز لا ڈالی میں نے یہ مختصر لکھا ہے۔ مخالفین اس کی تحقیق کے لئے () کا مطالعہ کریں۔

ارکان نماز میں میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ کیوں نہ یورپ کا ابو حنیفہ نماز کو ان کی عادت کے مطابق اجتہاد کرے جبکہ قرآن ارکان و تعدیل سے خاموش ہو اس سلسلے سے میرا مطلب یہ نہ تھا کہ تمام مسلمان اپنے طریقہ عبادت کو بدل دیں۔ لیکن جب ارکان و تعدیل میں خود حنفی و مالکی جعفری وغیرہ میں اس قدر اختلاف ہو اور پھر صاحب فرائض رضی

اور سوار کی نمازیں ارکان و تعدیل پر تشدد تھیں اور حالت جنگ کی نماز کی اور صورت پیدا کی گئی تو اگر میں نے اوپر کا یہ جملہ لکھ دیا تو (بقول اکبر) ڈاکہ تو نہیں مارا جو ری تو نہیں کی ہے۔ وضو کے متعلق تو ابن عباس نے بھی یہی کیا ہے اور تعجب ہے کہ میں قرآن سے مسح پاتا ہوں مگر مسلمانوں کا عمل پیرا ہونے کا ہے۔

مولانا نیا ز نصاب زکوٰۃ کے باقاعدہ بتاتے ہیں۔ میں ان سے یہی کہہ چکا کہ وہ قرآن کو پڑھیں اور بغور اسکا حکم دیکھیں۔ کیا قرآن میں یہ نہیں آیا ہے کہ لوگ تم سے پوچھتے کتنی زکوٰۃ دیں۔ کہہ دو کہ جس قدر ہو سکے۔ اسلامی سلطنت میں تعین زکوٰۃ کی مصلحت خواہ کچھ ہو مگر یہ کیسے انھوں نے اس کی بات ہے کہ ایک شخص اس سے زیادہ صدقہ و خیرات کر سکتا ہے جتنا فقہاء کے نصاب میں ہے۔ مگر اس کو ایسا کرنے پر منحرف اسلام سمجھا جائے۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ سارا نصاب زکوٰۃ اور عشر (جہاں بھی قرآن میں نہیں آیا) وہ سب ہم کو یہودیوں کی ”قارلمزم“ سے ترک میں آیا ہے۔ اور میں قارلمزم کو قومی مذہب کے لئے جائز سمجھتا ہوں مگر عمومی مذہب کے لئے نفوذ الاعمیٰ کو نکالیں طرچ مذہب صرف جن حرکات جہانی کا نام ہو جاتا ہے آخر میں کچھ میں اپنے ذات کے متعلق کہنا چاہتا ہوں۔ ابتدا میں مولانا سید اصفہان حسین صاحب دیوبند ہی کے دس میں جب کہ میری عمر ۱۰ برس کی تھی شامل ہوا۔ وہ اس وقت مسجد اطالہ جنپور میں معلم تھے۔ ان کا قاعدہ تھا کہ ابتدائی اور انتہائی طالب علموں کو بلا لحاظ ان کی تعلیم اور قابلیت کے صبح کے وقت سب کو اپنے گرد ایک حلقہ میں جمع کرتے تھے ہر ایک کے ہاتھ میں قرآن ہوتا اور ایک قرآن ان کے سامنے کھلا ہوتا تھا۔ ایک طالب علم باؤ از بلند قرآن کی ایک آیت پڑھتا تھا۔ اس کے بعد مولانا اس کے معنی اور تفسیر عام نعم عبارت میں بیان کرتے۔ میں نے ہی ان کے اس طریقہ سے فائدہ اٹھا اور قرآن کی یہ چنگاری میرے دل ایسے وقت ڈالی گئی کہ اگر مسلمان مجھے ماہی ڈالیں کہ تم قرآن روایات سے سمجھا دو تو مجھ سے یہ ممکن نہیں۔

سید مقبول احمد (بی اے)

۴۔ سول لائن میرٹھ

(نگار) مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے میری رائے پر ”اعتذار و احتجاج“ تحریر فرمایا اور آپ کا جو مدعا تھا اُسے زیادہ واضح الفاظ میں بیان کر دیا۔ ”فلسفہ مذہب“ کے سلسلہ میں آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس سے مجھے بڑی حد تک اتفاق ہو، اور میں اس مضمون کو آپ کی دینی خدمت سمجھتا ہوں، لیکن اگر کہیں کہیں مجھے آپ سے اختلاف ہو تو یہ ضروری نہیں کہ آپ کو اُسے صحیح سمجھنے پر مجبور کروں جس طرح آپ سے میل اتفاق کرنا ہر مسئلہ میں اور لوگوں کیلئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اپنے مذہب و قومیت کے سلسلہ میں فقہی مسائل کو چھوڑنے میں جس عجلت سے کام لیا اس کا اعتقاد تھا کہ میں بھی قبل از وقت اپنی رائے کا اظہار کرتا، لیکن آپ کے ”اعتذار و احتجاج“ پر اپنی رائے ظاہر کرنے میں جلدی سے کلام نہ لوں گا، کیونکہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اوقات نماز کے متعلق اسی اشاعت میں یہ سلسلہ استفسار میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اُسے ملاحظہ فرمائیے۔

نیاز

باب الاستفسار

نماز پنجگانہ ہے یا سہ گانہ

(جناب سید محمد اطہر صاحب - خیر پور)

آپ نے اگست کے رسالہ میں سید بقول احمد صاحب کے مضمون فلسفۂ مذہب پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے اوقات نماز کے متعلق بہت مجمل سی بات لکھی ہے نہ صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہئے یا تین وقت کی، ہر چند آپ کا رجحان یہی ہے کہ نماز پنجگانہ پڑھنا چاہئے۔ کیا آپ تکلیف فرما کر اس باب میں تفصیل سے اپنی رائے دیں گے۔

(نگار) اوقات نماز کے متعلق نص قطعی یا کلام مجید کا جو حکم ہے وہ نہایت صاف و صریح ہے اور اس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں یعنی قرآن سے صرف تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔

سورۃ ہود میں ارشاد ہوتا ہے:-

”واقم الصلوۃ طرفی النہار و زلفا من اللیل“ (یعنی نماز ادا کرو دن کے دونوں کناروں میں اور کچھ رات گئے) اس آیت میں ”طرفی النہار“ کے معنی میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہوا کیونکہ جس طرح طرف کے معنی کنارہ اور حد اخیر کے ہیں اسی طرح وہ حصہ کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہ اختلاف تعدد اوقات پر موثر نہیں ہوتا اور اس آیت سے تین ہی وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ دوسری آیت سورۃ نبی اسر اسئل میں یہ ہے:-

اقم الصلوۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل و قرآن العجیز۔ ان قرآن العجیز کان مشہودا من اللیل فتحیٰ نافلہ
اس آیت میں ”لدلوک الشمس الی غسق اللیل“ کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ ”نماز ادا کرو“ آفتاب ڈھلنے کے وقت سے آغاز شب تک۔ لیکن یہ ترجمہ میرے نزدیک صحیح نہیں، کیونکہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ زوال آفتاب سے آغاز شب تک برابر نماز پڑھتے رہو حالانکہ یہ مقصود نہیں ہو سکتا۔ میری رائے میں اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہئے کہ:- نماز ادا کرو زوال آفتاب کی شام تک۔ یعنی دوپہر ڈھلنے کے بعد ایک نماز پڑھنا چاہئے۔ جس کا وقت غروب آفتاب تک ہے۔ اور دوسری نماز صبح کی ادا کرو اور اور تیسری رات کی۔ الغرض اس آیت سے بھی تین وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے۔ جن میں سے دو وقت کی تو بالکل صراحت ہے۔ فجر اور عشاء و علاوہ ان آیات کے سورۃ نور کی ایک اور آیت سے نہایت صریح طور پر ان دو وقتوں کی تعیین ہوتی ہے۔ رسول اللہ کے اوقات خلوت کا تعیین کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:-

یا ایہا الذین امنوا لیبتاؤنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحکم منکم ثلاث مرات -

من قبل صلوة الفجر حين تصنعون ثيابكم من الظهيرة ومن صلوة العشاء الخ

اس آیت میں نماز فجر اور عشاء کا نہایت صراحت کے ساتھ ذکر ہے اور اس لئے اب بحث صرف یہ رہ جاتی ہے کہ تیسری نماز جسے ”صلوة وسطے“ سے ہی تعبیر کیا گیا ہے اور جو ”لذلول الشمس المغنی اللہ“ سے بھی ظاہر کی گئی ہے اور جو ”طوفی النهار“ میں بھی موجود ہے کو نہی ہو سکتی ہے اور کس وقت تک اس کو ادا کرنا چاہئے۔ سو وہ میرے نزدیک صرف نماز عصر ہو سکتی ہے کیونکہ یہی ایک نماز ہے جو نہار کا ایک طرف بھی ہو سکتی ہے اور جو غروب آفتاب تک ادا کئے جاسکے کے لحاظ سے ”الی غنق اللیل“ کی صراحت کو بھی بیکار نہیں جانے دیتی۔

اب رہا یہ امر کہ پانچ وقت کی نمازیوں اور کب رائج ہوئی یہ بیشک زرا دشوار امر ہے۔ صحاح ستہ کی رو حدیثیں ایسی ہیں جو صراحتہ ”نماز کے بچکانہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک حدیث وہ جو بسلسلہ معراج پچاس وقت کی نماز کو پانچ وقت تک گھٹا دینے کو ظاہر کرتی ہے اور دوسری وہ جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ جبریل آئے اور رسول اللہ کے سامنے پانچ وقت کی نماز ادا کی جس کا نتیجہ ہمیشہ رسول اللہ نے کیا۔ روایتاً ان دونوں حدیثوں میں کوئی سقم ہو یا نہ ہو لیکن درایتاً ناقابل قبول ہیں علی الخصوص اس وقت جبکہ بعض حدیثیں ان کی معاض ہیں۔ ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ نے بحالت قیام دامن صرف تین وقت کی نماز ادا کی دوسری روایت

سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ کے زمانہ میں دو دو نمازیں ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ الغرض یہ امر فقہین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ رسول اللہ کے زمانہ میں تعین اوقات ہو گئی تھی، کبھی آپ نے پانچ مرتبہ ادا کی اور کبھی صرف تین مرتبہ البتہ اس کے بعد جب شریعت منضبط ہوئی اور قانون مرتب ہوئے تو پانچ نمازیں فرض مقرر کی گئیں جن کے اوقات خفیوں کے نزدیک پانچ اور شیعوں کے نزدیک تین ہیں یعنی نمازیں تو ان کے ہاں بھی وہی پانچ ہیں لیکن دو کو وہ ملا کر پڑھتے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں یہ کوئی ایسا امر نہیں ہے جسے داخل ایمان و اسلام سمجھ لیا جائے اور نہ اس پر زیادہ اعتنا کرنا چاہئے۔ اگر کوئی شخص پانچوں وقت کی نماز علیحدہ علیحدہ اوقات میں پڑھتا ہے تو اس کے مسلمان ہونے میں بھی کلام نہیں اور جو ظہرین و مغربین پڑھتا ہے وہ بھی یقیناً مسلم ہے۔ میں نے سید مقبول احمد صاحب کے مضمون پر تنقید کرتے ہوئے جو خیال ظاہر کیا تھا اس کا مدعا یہی تھا کہ ایسے مسائل میں اختلاف و تنقید کی زیادہ ضرورت نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اس کی کوئی تاویل کسی قوم کی عادات و مشاغل کے خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر نہ کرنا چاہئے کہ اس طرح ہمیشہ کے لئے تاویل کا روزہ کھل جائیگا اور کبھی کسی مسئلہ شرعی کی تعیین نہ ہو سکے گی۔

قرآنی پردہ

(جناب سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے۔ میرٹھ)

پردہ کے متعلق آپ کا نژد مجھے بھی شجب کوئلے والا تھا مگر جب میں نے فلسفہ مذہب پر آپ کے نوٹ کو پڑھ لیا تو خاموش ہو گیا

خدا نہ کرے کہ آپ قرآن سے اس بدنامہ برقع کو ثابت کریں جو ہماری عورتوں کو عجب زمانہ بنا دیتا ہے۔ ورنہ پھر خدا کا حکم ”یغضون البصا دہم“ کی ضرورت ہی باقی نہ رہی کیونکہ اس خوفناک ہستی کو دیکھ کر خود آدمی کراہت سے اپنی نظر ہنجی کر لینگا۔ مولانا عبد الماجد صاحب کا جو قول ہے وہ غالباً ہدایہ کا مشہور مسئلہ ہے اور ابو حنیفہ کی رائے تو یہی ہے کہ چہرہ ستر میں داخل نہیں۔ اس کے علاوہ مسلم میں سب سے واضح حدیث پر وہ کے خلاف ہے جو کہ رسول اللہ نے اپنی بیویوں کو عیدین میں نکالا اور مسلمانوں کو اپنی بیویاں بیٹیاں نکالنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ مواظف بنوی میں عورتیں مساجد میں جمع ہوتی تھیں اور آپ نے ان کو مخاطب کر کے کلام کیا۔ (کتابیں برکتوں میں)

(نکار) اس وقت تک پردہ کے متعلق اور عبد الماجد صاحب دریا بادی کے مضمون کے خلاف جو کچھ میں نے لکھا ہے، اس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ :-

(۱) میرے نزدیک کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ثابت ہوتا ہے اور عبد الماجد صاحب کے نزدیک نہیں
(۲) پردہ کا میں مخالف ہوں اس لئے نہیں کہ کلام مجید اس کا مخالف ہے بلکہ اس بنا پر کہ موجودہ ضروریات زمانہ و تمدن کا اقتضا ایسی ہے۔ اب آپ اگر اس کی مخالفت میں یہ فرمائیں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں عورتیں باہر نکلتی تھیں، مساجد میں جاتی تھیں، مواظف بنوی میں شرکت کرتی تھیں، تو اس سے میرا قول رد نہیں ہوتا کیونکہ عورتوں کے باہر نکلتے سے میں نے انکار نہیں کیا۔ بلکہ ممکن ہے کہ وہ غلطی ہوں لیکن چہرہ کو چھپا کر اور گونگھٹ کی اوٹ کر کے۔ عورت کا چہرہ چھپانا علیحدہ امر ہے اور گھڑے باہر نکلنا دوسرا امر آپ ان دونوں کو کیوں ملا دیتے ہیں۔ رہا موجودہ برقعہ اور اس کی بدنامی، سو یہ بھی بالکل خارج از بحث امر ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ہندوستان و مصر ایران و ترکی کا کوئی برقعہ ایسا نہیں ہے جو بدنامی سے بچائے تو آپ کو اختیار حاصل ہے کہ کوئی اور حسین و جمیل اختراع کر کے عورت کے چھپے ہوئے چہرہ کا بدل پیش کیجئے اور لوگوں کی دعوتِ نظر کا سامان پیدا کیجئے، کون منع کرتا ہے۔ لیکن اس کو اصل مسئلہ کہیٹا ملاکر مغالطہ نہ پیدا کیجئے۔

اب میں پھر اصل مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں، ابو حنیفہ چہرہ کو کھلا رکھنے کے قائل ہوں یا نہ ہوں، حدیثوں میں خواہ کچھ ہو میں ان سے بحث نہیں کرتا، میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ کلام مجید میں ضرور چہرہ چھپانے کا حکم موجود ہے۔

اگست کے ملاحظات میں، عبد الماجد صاحب کی رائے کے خلاف میں نے مختصر اظہار کیا تھا کہ ”یذنبین علیہن من جلابیہن“ سے چہرہ پر نقاب ڈالنے کا حکم صراحتہً ثابت ہوتا ہے۔ اور آج بھی یہی کہتا ہوں۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس باب میں میری مخالفت کرے تو اس کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ احادیث کا حوالہ دے یا قول ابو حنیفہ سے تمسک کرے بلکہ اس کو چاہئے کہ کلام مجید ہی سے میری غلطی کو ظاہر کرے۔ افسوس ہے کہ آپ نے بھی یہ نہیں کیا اور اسی قسم کا جواب دیا جو میرے استدلال کو کسی طرح رد نہیں کر سکتا۔

کلام مجید کی اس آیت میں لفظ ”جلباب“ کا آیا ہے جس کے معنی اگر آپ نقاب کے نہ ہیں تو کم از کم اوڑھنی یا سر کی چادر کے تو مزد میں گئے جسے عربی میں خمار کہتے ہیں، اچھا اب خمار کے متعلق بھی ملاحظہ کیجئے کہ سورہ نور کے جو تختے رکوع میں کیا ارشاد ہوتا ہے۔ ”قل للمؤمنات یغضضن من البصائر..... ولا یدین زینتھن الا ما ظہر منھن والیض بن یخمرھن علی حیوہن الخ

اس آیت میں تین باتوں کی ہدایت کی گئی ہے، ایک تو یہ کہ راستہ چلنے میں اپنی نگاہ نیچی رکھیں اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر وہ حصہ جو مجبوراً ظاہر ہو جائے اور اپنی اوڑھنیاں سر سے گر بیان تک لٹکا لیا کریں۔

پہلا حکم نگاہ نیچی کرنے کا اس لئے ہے کہ جس طرح مردوں کو غیر محرم عورتوں کا دیکھنا درست نہیں اسی طرح عورتوں کو بھی چاہئے کہ وہ مردوں کو نہ دیکھیں، دوسرا حکم زینت کے چھپانے کا ہے مگر وہ حصہ زینت کا مستثنیٰ کر دیا گیا ہے جس کا چلنے میں ظاہر ہونا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ ”الما ظہر منھا“ سے استثناء زینت کا کیا گیا ہے نہ کہ کسی عضو یا حصہ جسم کا مقصود یہ ہے کہ میناؤ سنگھار نہ دکھائیں مگر اس قدر جس کا چلنے میں ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے، خواہ وہ ہاتھ پاؤں کا زیور ہو، قامت کا حن ہو، یا وضع و لباس کی چمب ہو اس استثناء سے چہرہ یا ہاتھ پاؤں کی بحث پیدا کرنا ہی میرے نزدیک بالکل خلاف اصول ہے۔

سورہ نور کی اس آیت میں الفاظ ”الیض بن یخمرھن علی حیوہن“ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ خمر جمع ہے خمار کی دو رخسار عربی زبان میں اس چادر یا اوڑھنی کو کہتے ہیں جو سر پر ڈالی جاتی ہے۔ اوڑھنی کا عام اور فطری طریق صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پشت سے اس کو لاکر سر پر ڈال لیا جائے نہ یہ کہ چہرہ کی طرف سے اُسے لایا جائے اور پیچھے کو ننگا کر دیا جائے۔ پھر جب اوڑھنی اوڑھنے کا طریقہ یہی ہے کہ پیچھے کی طرف سے لاکر اسے سر پر ڈالا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس کے لٹکانے کا حکم اگر ہو سکتا ہے تو صرف چہرہ ہی کی طرف جو کھلا ہوا تھا نہ کہ پیچھے جو پہلے ہی سے ڈھکی ہوئی ہے۔ علاوہ اس کے اگر حیوہن (گر بیانوں) کو مراد موجودہ فراک کا وہ گر بیان نہیں ہے جو پشت کی طرف ہوتا ہے اور جسے عام طور سے انگریزوں کے بچے استعمال کرتے ہیں، بلکہ وہ قمیص کا گر بیان ہے تو یہ امر آپ سے بھی مخفی نہ ہو گا کہ وہ گر بیان آگے ہی کی طرف ہوتا ہے اور جب اوڑھنی وہاں تک لٹکانی جائیگی تو چہرہ خواہ مخواہ چپ جائے گا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ چہرہ کو کھلا رکھتے ہوئے صرف اوڑھنی کا آئینل گر بیان اور سینہ تک لٹکایا تو اس کی تردید سورہ احزاب کی اس آیت سے ہوتی ہے جس میں الفاظ ”یدنین علیھن من جلابیھن“

استعمال کئے گئے ہیں اور جن میں ”یدنین“ کا لفظ لٹکانے کے مفہوم میں صراحت موجود ہے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ہر وہ کام مقصود صرف مرد و عورت کے باہم اختلاط یا اس کے محرکات کو روکنا ہے کہ اس میں اندیشہ فساد اخلاق کا ہو اور یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ عورت ہو یا مرد اس کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جس کو دیکھنے کے بعد جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے، اس لئے اوڑھنی سے اگر کسی حصہ جسم کے چھپانے کا حکم ہو سکتا تھا تو اُسی حصہ کا جو سب سے زیادہ باعث فتنہ و فساد ہے، نہ کہ گر بیان یا پشت یا ہاتھ پاؤں وغیرہ جن پر مرد کی نگاہ بھی نہیں پڑتی۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جبرہ کو داخل ستر کرنے کے بعد باہر نکلنے کی اجازت بیکار تھی کیونکہ اس صورت میں وہ راستہ کیونکہ کھڑے کر سکتی تھیں تو اس کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس وقت ہندوستان میں اکثر ہندو عورتیں باہر گھونگٹ ہی کر کے نکلتی ہیں اور تمام کام انجام دیتی ہیں۔ یا اگر موجودہ چار شرف ہی کو لے لیا جائے جس میں صرف ایک ہلکا سا رہتی نقاب جبرہ پر بڑا رہتا ہے تو بہت کچھ عورت کی چھب ہی ظاہر ہو سکتی ہے، جس کے چھپانے پر آپ رہتی نہیں اور ”یہ ذہنی علیہن میں جلا بیعت“ کی بھی تعمیل ہو جاتی ہے۔

یہاں تک تو بحث ہوئی حصہ اول سے۔ اب رہا دوسرا حصہ کہ میں کلام مجید میں یہ احکام تسلیم کرتے ہوئے کیوں اس وقت پر وہ کا مخالف ہوں، اس کے متعلق میں ایک سے زائد بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ اور اسپرکپ کا کوئی اعتراض بھی نہیں ہے۔ اس لئے اسپرکٹنگ کو نالے عمل ہے۔

نیا

تصویر زیب لسا بیگم
قیمت صرف ۸/- نیچر نگار پریس لکھنؤ
تصویر پر قصہ
قیمت صرف ۴/- نیچر نگار پریس لکھنؤ

محبوب عاشق کے قدموں پر

میری عمر کا بہترین حصہ صرف محل محبت کی تلاش میں گزرا۔ اور میں نے اس کی تلاش و جستجو میں جس قدر سرگردانی اور مصیبت چھٹی اس کا اندازہ سوئے میرے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ہزاروں روپیہ صرف کر کے بڑے بڑے جادو گردوں اور مشہور عالموں سے ملا کر کسی سے وہ مقصود حاصل نہ ہوا۔ سینکڑوں دھنپے پڑھو اڈے لے کر کام کیا۔ میرے عقیدت مندوں میں ایک بنگالی نے ایک بزرگ کا پتہ بتلایا جو دہرہ از ملک کے رہنے والے تھے۔ اور مجھے یقین دلایا کہ وہ اس فن میں پورے ماہر ہیں۔ مگر کسی کو بتاتے نہیں۔ میں خدا کا نام لیکر ملک آسام کو روانہ ہو گیا۔ تھوڑے ہی وقت میں ایک سال ان کے در دولت پر بڑا ہتھوڑے کے بعد جب انہوں نے ہر طرح اپنی کسوٹی پر کس اور مجھے اپنی دہن میں بچا پایا تو انہوں نے دو عمل رحمت فرمائے تھے میں نے کامل میں سال تک ان سے کام لیا کبھی سرخو خطائیں کی اب میں نے خیال کیا کہ ان کو اہرات بے ہمتے کچھ مالی فائدہ اٹھایا جائے جبکہ میں اپنی تلاش میں ہزاروں روپیہ برباد کر چکا ہوں اس لئے میں خدا کو حاضر ناظر جاعہ اور گواہ بنانے کے بعد کمر کا ست قلیل ہی پران کا دہرہ کرنا ہوں جن بھائیوں کو میری گزارش پر اعتبار ہو اور ساتھ ہی اس کے ایک حلقہ میں رہی اس اقرار کا ارسال کر کے اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے کو نہ بتلائیں گے اور نہ ان استعمال کسی ناجائز عہد کریں گے طلب فرمائیں اور تجربہ کریں کہ دنیا میں طلب صادق و کون والوں کے لئے اب بھی فیاض لوگ موجود ہیں اور میری محنت کی داد دیں۔ عمل پیرا۔ اس عمل کے پڑنے میں پندرہ منٹ صرف ہوئے ہیں۔ سال بھر تک اس کا عامل اسپر کاغذ و پتہ سال آئندہ کے لئے دوبارہ پندرہ منٹ صرف کر کے عمل پڑھنا ہو تا ہے صرف تین مرتبہ پڑھنے سے مطلوب کو تاجدار بنا سکتا ہے۔ جس عمل کا سرخو بکا آدمی عامل بن سکتا ہے۔ دہرہ صرف صبر۔ عمل پیرا۔ اس عمل میں ایک آیت قرآنی ہے۔ جو صرف ایک سطر ہے۔ اکتائیس مرتبہ ایک سیاہ مہرچ پڑھتی جاتی ہے اس طرح اکتائیس مرتبہ ستر کی جاتی ہے کل سات دن کے اندر مطلوب قبضہ میں آجائے گا۔ یہ عمل صرف مسلمانوں کیلئے ہے دہرہ صرف دہرہ ہے آٹھ تے۔ یاد رکھئے کہ ہر دو جو اہرات بے ہمتے پانچ سو روپیہ صرف پہنچی آپ کو میسر نہیں آ سکتے۔ ایک مقررہ مقدار تک یہ فروخت کئے جائیں گے۔ ہر دو عمل طلب کوئے والوں سے دہرہ چھ روپے۔ نوٹ :- جو صاحب بددیہہ منی آرڈر روپیہ روانہ کریں گے ان سے حصول ڈاک نہیں لیا جائے گا۔ بددیہہ رجسٹری نفاذ میں ان کو عمل روانہ کیا جائیگا۔

فصل شاہ عامل چھتہ لال میان نمبر ۶۴ دہلی

لئے کا پتہ :-

فردوسی شہزادی

سن لے فردوسی شہزادی عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو کمرؤں کے جوسے میں
گاتے گاتے اکتا جائے
دنیا کے افسانے سن کر
تیرا دل کھویا سا جائے
جب انسانوں کی محفل کا
منظر چمکے یاد آ جائے
میری ہنگامہ گرہ فطرت
تمہائی سے گھبرا جائے!

میرے گلشن میں آ جانا عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے چمکو؟ میرا گلشن
تیری جنت سے بھی پیارا
عشق کی لہریں ذوق کی مچھیں
پریم کی نہریں بریت کے دریا
زریں بھولوں کی اک محفل
رنگیں کلیوں کی اک دنیا
پاک نضا۔ معصوم ہوا میں
حسن کی عصمت کا گہوارہ

عشق کی عظمت کا کاشانہ عہد وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے چمکو اس گلشن میں
گھوما کرتے تھے ہم دونوں
مست بادۂ الفت ہو کر
جھوما کرتے تھے ہم دونوں
پھر ان پاکیزہ کلیوں کو
چوما کرتے تھے ہم دونوں

وہ دل جل کر نفیے گا نا عہد وفا کو بھول نہ جانا

ان باتوں کا ذکر ہی اب کیا

خواب تھا — ااد کیا خواب کی وقت
ہاں — دیر قدس کی دیوی
ہے گر کچھ احساس محبت !
آ — اکرے قدموں میں لٹاؤں
ذوق کی رقت شوق کی عظمت
باغ میں دیکھو گنگا تیرا رستہ
شام ہی سے اے سلی الفت

صبح سے پہلے ہی آ جانا عہد وفا کو بھول نہ جانا

اس گلشن کے سروازے پر
اک خوش قسمت مانی ہو گا
دل میں ہو گا جوش محبت
ہاتھ میں ہو گا بریم کا گجرا
شرم سے جہک جائیگی آنکھیں
تو نے گزشتہ سے دیکھا
اٹے گا دامن میں لیسکر
پریم کا گجرا — نذر تمنا

خدمت کرنا دل نہ دکھانا عہد وفا کو بھول نہ جانا

جب تو گجرا بہن چلے گی
وہ تیرے قدموں میں جھکے گا
تو نے گزشتہ سے دیکھا
وہ تجھ سے کچھ عرض کرے گا
ہاتھ بڑا دینا شہزادی
وہ خوش ہو کر بوسہ دے گا

اس شوخی پر مت شرمانا عہد وفا کو بھول نہ جانا

وہ مانی ہو پریمی تیرا
میں کیوں اس کا نام بتاؤں
ہاں جو کوئی ”دنگین دھڑ“ ہو
شاید ! میں پھر کچھ نہ چھپاؤں
کمدوں — میں تیرا ہی رشتہ ہوں
اور وہی مانی بہن جاؤں
تو جو گناہ ناز سے دیکھے
تیرے دامن میں چپ جاؤں

ہنس دینا باتوں میں لگانا عہد وفا کو بھول نہ جانا (رشد صدیقی)

دین کے مبلغ

اک زمانہ تھا کہ یورپ میں مبلغ دیں کے لغو اقوال کو آیات خدا کہتے تھے انکو تاویل مسائل میں جو حاصل تھا کمال فرقہ بندی بھی کی اور تفرقہ اندازی بھی قبضہ دین سومرا دان کی تھی دنیا طلبی نذر آتش کیا لاکھوں کو نظر نے ان کی پھر حکومت کے ہر اک شعبہ میں رہبر بن کر دین کی طرح حکومت کو کیا زیر و زبر دام تہذیب میں انسا کو پھنسا رکھا تھا جب جہالت سے ہوئی فطرت انسا آزاد چشم انسا کو ہوئی راہ حقیقت کی تلاش تنگ مذہب یہ عقائد ہیں عیاذ باللہ ہاتھ میں واعظ دین کے نہیں جنت کی کلید آتش غیض و غضب ملیں ہوئی شعلہ فروز

وضع کرتے تھے مذاہب کے خطرناک اصول نہ کوئی جنگی سند تھی نہ کوئی شان نزول طبقہ ملک میں ہونے لگے اکثر مقبول مختصا وہ بھی پیدا کئے دنیا میں فضول کہ کسی طور سے ملتی رہے دولت معقول اور فتموں سے ہو کر ان کے ہزاروں مقتول بادشاہوں کی خوشامد کو بنایا معمول کیونکہ انیس نہ فراست تھی نہ دانش اصول اور وہ قسمت ہی پہ کرتا رہا اسکو معمول کر چکے تھے یہ خرافات طبیعت میں حلول ہوئے افراد کو خود ساختہ ہیں کے اصول خواہ کچھ ہو مگر ہم ان کو کرینگے نہ قبول عرش و اسکا جہانیں نہیں ہوتا جو نزول کیونکہ ہر شخص تھا ان نفس پرستوں کے ملول

حق و باطل میں جو ہونے لگی انسا کو تمیز پھر کسی پر نہ ہوئی ان کی توجہ مبذول

محمود اسرائیلی

غزلیت

اثر راپوری

گر بے نقاب جن خود آکرے کوئی / دنیاے عشق کو تہ وبالا کرے کوئی
 پھر دل میں کو نظارہ یتیم کی آرزو / پھر دل پہ بجلیاں سی گرایا کرے کوئی
 رسوا کریں نہ میری نگاہیں مجھے خدا / دیکھوں میں جب کسی کو نہ دیکھا کرے کوئی
 ہنستی ہر عقل ہی مردی حال تباہ پر / پہنکتا ہو گھر کسی کا تاشا کرے کوئی
 یکساں ہو مضطرب میں دل غم فراق / کس طرح چارہ دل شیدا کرے کوئی
 دیدار ہو اگر تڑا ممکن تو بے خطر / سو عزت نفس اکڑے کوئی
 بس اسے ہجوم یاس کہ ولس تو ان میں / تلکے امید وعدہ فردا کرے کوئی
 سویا ہوں گور میں توے غم کئے ہوئے / ٹھوکرے اپنی شہر نہ بربا کرے کوئی
 یاس ادبے جرات اظہار گو نہ ہو / صورت ہو خود سوال تو بچا کرے کوئی
 دل میں ہو نو عشق تو سینہ ہو کوہ طور / رگ رگ میں دید برق تجا کرے کوئی

دنیاے آرزو میں نہ پہل پڑے اثر

ہم کو نہ ایسے ناز سے دیکھا کرے کوئی

تبسم نظامی

عشق حقیقی غالب ہے عشق مجازی کون کرے / اپنی فطرت عالی ہے دنیا سازی کون کرے
 عیسیٰ ہیں اور گردوں پر حسن ہوا سو پرودہ نہیں / الفت کے پیاروں کی چارہ سازی کون کرے
 نہمت گل کی سرگوشی باوصا کو بار نہیں / اب غمازی مشکل ہے اب غمازی کون کرے
 طور اولن کی جلوہ گری جلوہ گری اور چشم کلیم / تاب کی سادی باتیں ہیں ہرزہ تازی کون کرے
 مفت کامیری آنکھوں کو رونادھونا نہ تھا ہے / آنکھ میں ان کے لطف نہیں اشک فوازی کون کرے
 بستی کی اس بستی میں کوئی خدا بھی بن جاتا / سب بندے ہی بندے ہیں بندہ فوازی کون کرے

ہائے تبسم و حشر نے ننگ تو تم چھین لیا
 گلشن میں شاخ گل پر نغمہ طرازی کون کرے

حافظ غازی پوری

میری نظریں ہر دہی جن طلسم خواب کا یاد ہو آج تک مجھے، دور ترے شباب کا
گرم رو صراط عشق، دیدہ تر بخوار کر تشنگی الم بجھا، خوف نہ کر سراب کا
پھیل گیا فنائیں جو، صوت شکستہ کی طرح درد کی اک صدا ہو وہ، نغمہ نہیں رباب کا
چشم خمار آفتاب، وقف تجرات ہے جوش شباب جن میں، کیف ہو کک شراب کا
حافظ درد آشتنا، ختم کر اپنی داستان
قابل اعتنائیں حال دل خراب کا

حسام کا کوروی

مے الفت کبھی برباد کن ہوش نہیں کو یہ وہ صہبا ہے جنت کش مے نوش نہیں
اسہ بگڑے ہوئے ہو ضبط فغاں نہ ہو سکا میں خطا کا رسی تم بھی خطا پوش نہیں
تم مجھے بھول چکے ہو تو مجھے کیا حاصل مجھ کو میرا ستم آرا - تو - فراموش نہیں
میری آنکھوں سے تر جلوہ کبھی چہنچ سکا حسن جو شے ہے پس پردہ بھی رو پوش نہیں
شوق خود شعلہ نوازی کا سزاوار تو ہو آتش جن ضیاء پاش ہے رو پوش نہیں
بزم میں آنے تو دو - شکر جفا کرنا ہے اور جو کچھ بھی ہوں احسان فراموش نہیں
خیر میخانہ کی لبریز ہیں جلوہ لاکھوں کون قطرہ ہے کہ جو میکدہ بردوش نہیں
نشد احمد کہ دل سوز بھی باقی ہو حسام
شیع تربت سر تربت ابھی خاموش نہیں

فرخ بنارسی

حسن محشر خیر جنب پیدا ہوا ہوا ذرہ ذرہ خاک عاشق کا سہلکار ہوا
دیکھنے کو یوں تو دیکھ لے نقاب کو مگر چشم حیران سے کوئی پوچھے کہ کیا حال ہوا
ذوق عصیان اب زیادہ بچ محمدی ندو جس قدر حسن عمل تھا دفتر باطل ہوا
ضبط آئین محبت ہو محبت میں مگر ادنیٰ ہی راحت ملی شباب بقنادل ہوا

جو محیط عشق میں ڈوبنا اُبھارِ شکر
آشنا ساحل سے کب بیگانہ ساحل ہوا
عام ہو جلوہ مگر انکو بھی سحرِ حجاب
شکر ہے ان کی نظر میں یہ بھی قابل ہوا
کام آئی ایک دن فرخ مری اتنا دگی
صنعت، راہ طلب میں ہر قدم منزل ہو

جناب محمود علی خاں صاحب محمود رئیس الہ آباد

دل کی سب راحتیں مٹتی ہیں تو مٹ جاتے دو
نقشِ الفت کو تو دستِ اُبھرتے دو
حشر ہے حشر، پلٹ آؤ شہیدانِ وفا
کچھ ذرا اور اتنی آج تو شریکِ وفا
خود کل نہ لگی ہر موج سے اک راہِ فنا
کشتیِ عمر کو ساحل سے تو مکرانے دو
جوشِ الفت میں کٹی جاتی ہیں خود دگی گریں
دہا رتوار کی مڑتی ہو تو مڑ جاتے دو
اک مرا قتل ہو اور بعد میں انکی حیرت
بزمِ غم کے ہیں یہی خلقِ میں غنائے دو
دیکھنا دیکھنا اس راہ سے جاننا ابھی
شیشہ دل کو مرے ادھر بھی پس جانے دو
بتیاں بھولوں کی خود بھولیں گی محمود
ان کے ہاتھوں میں ذرا انکو بھر جانے دو

خاک پروانہ

یعنی ہندوستان کے مشہور خاندان نویس ”پریم چند“ کے
افسانوں کا مجموعہ جو فاضلِ فسانہ نگار کے دورِ فسانہ نگاری
کی اہمائی ارتقائی یادگار ہے۔

پریم چند کے افسانے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی
میں بھی کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ یہاں تک کہ چینی زبان
میں بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول ایک روپیہ (عمر)

”منہجر نگار“ لکھنؤ

ظریف شاعروں کا تذکرہ

تذکرہ خندہ گل

جو دارالاشاعت بخارہ سے شائع ہونے والا ہے اور جس کی طباعت
شروع ہو گئی ہو۔ فارسی اردو کے تمام ظریف شعراء، ماضی و حال کے
حالات مع نمونہ کلام اس کتاب میں یکجا کر دئے گئے ہیں۔ کتاب کی
ضخامت ۴۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگی اور قیمت علاوہ محصول
ابھی سے دو روپے بھیج کر اپنا نام درج کرالیں گے ان سے بعد اشاعت
کو فی زاید رقم نہ لی جائیگی۔

”منہجر نگار“ پریس لکھنؤ

اقتباسات علیہ

اعادہ شباب | اس وقت تک یہ امر حقایق ثابتہ میں داخل تھا کہ

جو آگے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا

جو آگے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

لیکن عہد ماضی کے جن طرح اور بہت سے نظریے اب معرض بحث میں ہیں اسی طرح یہ بھی ہے اور بڑی حد تک غلط ثابت ہو چکا ہے
ایشیا اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کا انسان صرف یہ سوچتا رہتا ہے کہ خدا معلوم کس وقت موت آجائے اور یورپ کا انسان
ابھی تک قدرت کے فیصلہ و شیب ہی پر قانع نہیں۔ اور جس وقت وہ دیکھتا ہے کہ بعض درخت سو سو بلکہ ہزار سال تک قائم رہتے
ہیں، بعض حشرات آبی (مثلاً گھونگھا) دو دو سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ لیکن انسان جسے اشرف المخلوقات ہونے کا فخر حاصل
ہے ۴۰ سال کی عمر سے ضعیف ہونا شروع ہوتا ہے اور ساٹھ، ستر تک پہنچ کر فنا ہو جاتا ہے تو اس کے حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور قدرت
کے اس اصول کے خلاف ایک قسم کی بغاوت محسوس کر کے اسے سنجوید، لگ جاتا ہے کہ بڑھاپے کی حقیقت معلوم کرے اور قدرت
کا مقابلہ کر کے اپنی عمر طبعی کو بڑھائے۔

بھکار کے صفحات میں اس سے قبل بار بار اعادہ شباب کے نہ صرف امکان بلکہ اس کے وقوع کا ذکر آچکا ہے اور بعض
غدد کے بدل دینے سے جو کامیابی یورپ کے ڈاکٹروں نے حاصل کی ہے اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

حال میں ڈاکٹر (د) (Sew) نے جو علمی و ادبی بحث اس موضوع پر پیش کی ہے وہ بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر فرسٹو
لکھتا ہے کہ ”انسان بھی ہر جاندار کی طرح ایک جھوٹے سے جبر ٹومہ (کیرٹے) سے پیدا ہوتا ہے جسے غذا آہستہ آہستہ بڑھاتی ہے،
ایک خاص شکل و صورت دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک پورے انسان کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد ترقی کرتے کرتے
ایک ذمی عقل و ہوش، صاحب علم و فراست فرد ہو جاتا ہے، پھر اس کے بعد اس کا نورک جاتا ہے، علامات شیب ظاہر ہونے لگتے
ہیں تو عقل ضعیف ہو جاتی ہے اور رفتہ رفتہ حیات و اعمال حیات محدود ہو جاتے ہیں۔ ایک جاندار جسم کے اندر ہمیشہ خلا یا مٹتے
اور پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ شباب میں جینے خلا یا مٹتے ہیں، س سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں اور شیب میں اس کے
بالکل برعکس ہوتا ہے یہاں تک کہ جب جدید خلا یا مٹنا بند ہو جاتے ہیں تو فنا ہو جاتی ہے۔

اب یہ رائے مسلم ہے کہ جسم میں جدید خلا یا کا نہ بننا نتیجہ ہو اگر تاہم۔ نہ رہے، وہ کا جو جسم میں پیدا ہوتا ہے وہ اس کا سبب
یہ ہے کہ وہ اعضا و جہیم کے تکلیف مادہ کو خارج کرتے رہتے ہیں (مثلاً اعصاب، پھیپھڑے، رے، جلد) اپنا پورا کام نہیں کرتے اور زہر
جمع ہو کر خلا یا کو زیادہ فنا کرنے لگتا ہے۔ پھر جب غور کیا جائے کہ یہ اعضا اپنا پورا کام نہیں کرتے تو علامہ خون کی روانی کی طرف نگاہ

جانی ہے جس پر انحصار ہے تمام اعضاء کے افعال کا، یعنی خون صالح جب قدر وسعت و کثرت کے ساتھ اعضاء کو پہنچنا ہیگادہ اتنی ہی تکمیل کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے، لیکن خون صالح کا انحصار ہے ان غدد پر جو جسم کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے کوئی خاص مادہ نکل کر خون میں ملتا رہتا ہے اور اس کو صاف رکھتا ہے

یہ غدد کون کون سے ہیں: غدہ درقہ، غدہ صغریہ، غدہ مخاعیہ، غدہ صنوبریہ، گردوں کے اوپر کے غدد اور غدد جینیہ (یعنی خصیتیں) ان تمام غدد سے ایک خاص قسم کا کیمیائی مادہ پیدا ہو کر خون میں ملتا ہے اور خون کے ذریعہ سے تمام اعضاء میں پھیل جاتا ہے اس کا تجربہ غدد کے نکالنے اور پھر ان کی جگہ قائم کر دینے سے کافی طور پر ہو چکا ہے۔

پھر جس طرح اور امراض ان غدد کے ضعف سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح بڑھاپا بھی جو یقیناً ایک مرض ہی ہے، پیدا ہوتا ہے اور اس کا علاج ان غدد ہی کی تبدیلی سے ہونا چاہئے۔

سب سے پہلے سائنس دانوں میں ایک حضی مرغ پر اس طرح کا عمل جراحی کیا گیا اور ایک دوسرے مرغ کے خبیہ اس میں لگاؤ گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضی مرغ نے پھر نہ حالت اختیار کر لی اس کے ۴ سال بعد فرانس کے ایک ڈاکٹر نے جن کی عمر ۲۷ سال کی تھی جانوس کے خبیہ کا جو ہر نکال کر اپنے جسم میں پکڑا دی کے ذریعہ سے بھونچا یا تو اس کی قوت حیوانی و دماغی میں بہت اضافہ ہو گیا جب اس نے اپنے اس تجربہ کا اعلان کر دیا تو اس قدر حیرت و حیرت کا اس کے پاس ہوا کہ گھبرا کر لندن چلا گیا ہر چند اس بیان میں صحت کا شائبہ کم ہے کیونکہ اول تو خبیہ کا جو ہر حاصل کرنا آسان نہیں، دوسرے یہ کہ پکڑا دی کے بعد ہی فوراً اس قدر فائدہ مترتب ہونا خلاف اصول ہے، اس کے لئے کچھ زمانہ گزرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس واقعہ سے یہ ضرور ہوا کہ ایک اصولی بحث شروع ہو گئی اور ڈاکٹر دل کو اس طرف توجہ ہوئی۔ اس سلسلہ میں عملی صورت سے جو نتائج پیدا ہوئے وہ یہ تھے کہ اگر کسی ضعیف جانور میں مادہ منویہ کی دونوں رگیں بدل دی جائیں تو وہ جوان ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر غدد سے اس کا مادہ کیمیادی نکلتا بند ہو جائے یا کم ہو جائے تو دوسرے غدد بدلنے سے پھر اصلی حالت عود کر آتی ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر نے چھوٹے چوہوں کو حضی کیا اور وہ بیکار ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے چوہوں کے خبیہ پھر پیوند کئے اور پھر اصلی حالت بر آئے۔ اسی طرح اس نے چوہیاں لیکر ان کے خبیہ (مادہ کے خبیوں کو بیضہ کہتے ہیں) نکالے تو ان کا میل جنسی جاتا رہا۔ اور جب پھر بیضہ پیوند کئے تو وہ اصلی حالت پر آ گئیں اس کے بعد نر کے خبیہ مادہ کے بیضے نکال کر اس میں پیوند کئے تو اس میں نر کے صفات پیدا ہو گئے اور مادہ کے بیضے نر کے خبیہ نکال کر اس میں لگائے تو وہ مادہ ہو گیا۔ اسی طرح اس نے بفر خبیہ اور بیضے نکالے ہوئے نر میں مادہ کے بیضے اور مادہ میں نر کے خبیہ لگائے تو وہ مخت ہو گئے بعض ایسے آدمیوں پر بھی تجربہ کیا گیا جن کے خبیہ جنگ میں جاتے رہے تھے تو وہ پھر باکار ہو گئے

ان مباحث و امثال پر نیا درک کر اسٹنڈرڈ اور درونوف دونوں ڈاکٹر جنسیت سے تجربے کے اول الذکر جن غدد پر ملاحظہ فرمائی گئی تھیں ان کے دوسرے نے خبیہ تبدیل کئے لیکن اسٹنڈرڈ کا طریق عمل زیادہ آسان تھا کیونکہ جانوروں کے غدد آسانی سے مل سکتے ہیں۔ یہ ذکر اب سے ۲۵ سال قبل کا، لیکن گزشتہ ربع صدی کے اندر جہاں اور بہت سے جدید علمی تجربات تکمیل کو پہنچ چکے ہیں

انہیں میں سے ایک یہ بھی اور اب غدد بدل کر عادۂ شباب کا عمل نہایت معمولی عمل جراحی ہو گیا ہے۔

ہر چند ابھی تک اتنی کامیابی نہیں ہوئی کہ غدد بدل جانے کے بعد ایک ضعیف جمیتہ کے لئے جوان ہو جائے اور پھر اس کو دوسرے غدد کی ضرورت نہ ہو، لیکن یہ یقینی ہے کہ ایک مرتبہ غدد کی تبدیلی سے انسان میں سال پہنچے ہٹ جاتا ہے اور میرے خیال میں فطرت کے خلاف انسان کی یہ جنگ کچھ کم کامیاب نہیں ہے۔ لیکن یہ کہ آئندہ جیکر اس میں اور زیادہ ترقی ہو اور انسان اپنی ۱۲۰ سال کی عمر طبعی کو پہنچ سکے۔ (تھیں نے درجہ ۱۲۰ سے بڑھ کر دیا ہے)

اب سے ۱۸ سال قبل ۱۹۱۱ء میں سینما بالکل ابتدائی حالت میں تھا اور صرف لہو و لعب سمجھا جاتا تھا لیکن دس سال کے اندر ہی اس صنعت نے اس قدر ترقی کی کہ اب امریکہ میں موٹر کی صنعت کو چھوڑ کر اس کا چوتھا درجہ ہے اور اس کی کمپنیوں کے حصے نہایت گراں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

۱۹۲۰ء تک دنیا میں ۴۰۰۰۰ متقل عکاس خانے (Cinema Houses) قائم ہو چکے تھے، ۱۹۴۰ء امریکہ میں ۵۰۰۰۰، بلا د انگلستان میں ۲۰۰۰۰، جرمنی ۲۰۰۰۰، فرانس میں ۱۰۰۰۰، اٹلی میں ۱۰۰۰۰، اسپین میں ۸۰۰۰، سوڈان میں ۶۰۰ اور جاپان میں تھے۔ لیکن اب مغرب میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں کوئی عکاسخانہ نہ ہو، خواہ وہ مرکز تہذیب و مدنیت سے کتنی ہی دور کیوں نہ واقع ہو۔

جنوبی امریکہ میں یہ حالت ہے کہ ہر وہ گاؤں جس کی آبادی ایک ہزار تک پہنچتی ہے، ایک عکاسخانہ رکھتا ہے۔ یہ مختصر سا بیان تھا اس کی صنعت کی وسعت کا۔ اب رہی اس کی مقبولیت سو اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں امریکہ کے اندر روزانہ ایک کروڑ آدمی عکاسخانوں میں جاتے تھے اور اب ستر دہائی سنہ کمپنی کا ایک ڈائریکٹر کہہ رہی ہے کہ ۱۹۲۰ء میں سینما کی آمدنی گیارہ کروڑ گنی ہوئی تھی اور ۱۹۲۵ء میں ۴۴ کروڑ گنی۔ اس صنعت میں جو سرمایہ ۱۹۲۵ء تک لگا تھا اس کا اندازہ کروڑ گنی کیا جاتا ہے۔ اس صنعت کے اشتہار پر صرف ایک سال میں ایک کروڑ بیلا لاکھ گنی کمپنیوں نے صرف کئے اور ۵۰ لاکھ پیدا آدمی ان میں کام کرتے ہیں۔

اب سینما سے صرف لطف و تفریح کا کام نہیں لیا جاتا بلکہ اب وہ بہترین ذریعہ تعلیم اطفال کا، سیاسی پروپیگنڈا کا اور تجارتی اشتہاروں کا ہے۔ امریکہ کی وسعت تجارت و صنعت کا ایک بڑا راز اس کی صنعت سینما بھی ہے۔ جس کے ذریعہ سے تمام دنیا کو اس کے ملک کی پیداوار، اس کی صنعت و تجارت کا حال معلوم ہوتا ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ بننا روں میں دباؤ کی اشیاء ہو چکر مقبول ہو رہی ہیں۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ۵۰ فی صدی فلم (Film) امریکہ کی کمپنیوں کے رائج ہیں اور اور اس لئے نہایت آسانی سے بیرونی ملکوں کو لایا جاسکتا ہے کہ اس وقت امریکہ ۵۰ فی صدی دنیا کے بازاروں پر بھی قابض ہے

یہ غالباً سب کو معلوم ہو گا کہ زمین ایک کرہ ہے جو فضا میں معلق ہے اور اس کے شب و روز پیدا ہونے کی صورت یہ ہے کہ وہ ۲۴ گھنٹے میں اپنے محور کی گردش پوری کر لیتا ہے اور اس کا سال اور فصلوں

کائنات کی عظمت

بنی ہیں کہ ۳۶۵ اور تقریباً چوتھائی دن میں آفتاب کے گرد اس کی گردش پوری ہوتی ہے۔ خود زمین کا کمرہ ۲۴ ہزار میل کے دور کا ہے یعنی اگر ۸۰۰ میل روزانہ کے حساب سے سفر کیا جائے تو ایک مہینے میں اس کو طے کر سکتے ہیں۔ لیکن آفتاب زمین سے ۳۱۰۰۰ گنا زیادہ بڑا ہے اور زمین ایسے ۳۰۰۰۰ گنا سے بن سکتے ہیں۔ لیکن عالم کون میں آفتاب بھی باوجود اتنی عظمت کے ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آسمان سے نظر آنے والے ستاروں کی تعداد صرف ۶۰۰۰ ہے، لیکن بڑی بڑی دوربینوں کی مدد سے جن ستاروں کی تصویر لی جاسکی ہے ان کی تعداد ۲۲۴ ملین ہے اور یہ سب کے سب اس نظام کے ہیں جسے کہکشاں کہتے ہیں۔ کہکشاں میں بظاہر ستارے بہت قریب قریب معلوم ہوتے ہیں، لیکن بعد کی وجہ سے ایسا نظر آتا ہے درنہ حقیقت میں ان کے درمیان باہم بہت بڑا فاصلہ ہے۔

ڈاکٹر ہبل نے لوح تصور میں جو ۱۰۰۰ بجے کا شیشہ رکھنے والی بڑی دوربین میں لگائی گئی تھیں دو ملین اجرام سدیم کا شمار کیا ہے جو ۱۴۰ ملین نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہیں (یعنی ان کی روشنی ایک کروڑ ۴۰ لاکھ سال کے بعد ہم تک پہنچی ہے) یہ اجرام کہکشاں میں ایک دوسرے سے اس قدر بعید واقع ہیں کہ ایک کی روشنی دوسرے تک ۱۸ لاکھ سال کے بعد پہنچتی ہے، ان میں ہر سدیم میں اتنا مادہ پایا جاتا ہے کہ ہمارے آفتاب کے برابر لاکھوں آفتاب اس سے بن سکتے ہیں۔ (یہ واضح رہے کہ ہمارا آفتاب بھی نجوم کہکشاں ہی میں سے ایک تارہ ہے) اور تمام وہ ستارے جن کی تعداد ۲۲۴ ملین بتائی گئی ہے وہ بھی سب اسی کہکشاں سے تعلق رکھتے ہیں اور کہکشاں خود ایک سدیم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

ڈاکٹر ہبل نے ان سدیموں کی رصد کے معلوم کیا ہے کہ وہ حالت نشو و ارتقا میں ہیں اور تند بھی طور پر ایک صورت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ چونکہ ان کا مادہ بھی ایک ہی ہے اور باہم بعد بھی یکساں ہے (یعنی ۱۸ لاکھ نوری سال کا فاصلہ) اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام سدیم کسی ایک ہی سدیم سے پیدا ہوئے ہیں۔

غذا کا اثر قامت پر | غذا اسے حسب در انسان کی صحت و دھوکا تعلق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں حال ہی میں علماء کی ایک جماعت نے پوری طرح تحقیق کر کے اس کو ثابت کیا ہے کہ غذا انسان کی قد و قامت پر بھی بہت اثر کرتی ہے۔ چنانچہ اہل چین، جاپان، کوریا، جاوا وغیرہ کا پست قد ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کی غذا اجالہ ہے اور اہل افریقہ و یورپ کا دراز قد ہونا بھی ان کی مخصوص غذا کی وجہ سے ہے۔ اس لئے اب سوال یہ ہے کہ اگر موجودہ لوگوں کی غذا بدل دی جائے تو کیا ان کی قد و قامت میں تغیر ہو سکتا ہے؟

اس امر کے تجربہ کے لئے جو ہے پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کا جسم اور صفات زندگی بہت کچھ اس کے طعام کی سیاق و سیر کی ترکیب پر منحصر ہیں۔ اور غذا اور اس کے اثر کے متعلق جو تجربے کئے جاسکتے ہیں ان کا اظہار اس کی حالت سے بہت کچھ ہوتا ہے۔ پھر چونکہ وہ ایسا جانور ہے جو گوشت بھی کھاتا ہے اور نباتات بھی اس لئے وہ اس باب میں انسان سے بہت مشابہ ہے اس کے

ساتھ ہضم وغیرہ کے لحاظ سے بھی وہ ہضم انسانی سے مماثل ہے۔ اس لئے اس کو تجربہ کے لئے زیادہ موزوں سمجھا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ غذا کی تبدیلی سے اس کے اندر بہت سے تغیرات پیدا ہوئے۔ ایک مرتبہ آٹھ چوہیاں لیکر ان کے دو حصے علیحدہ علیحدہ کئے گئے ایک کو معین مقدار پانی اور گیہوں کی دی گئی اور دوسرے کو اسی غذا کے ساتھ شلغم کی جی بھی دی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ اول جماعت بڑے چوہوں کے برابر ہو گئی اور دوسری ان سے دو چاند حساب مت کی ہو گئی۔

اس مسئلہ میں علماء جاپان نے بھی متفرق تجربے کئے۔ بعض مدرسوں کے طلبہ کو وہی غذا دی گئی جو یورپین ممالک میں دیکھائی ہے اور جو جاپانیوں کے مخصوص ملکی غذا سے بالکل مختلف ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان طلبہ کا قد کئی انچ بڑھ گیا اور اسی طرح وزن بھی زیادہ ہو گیا۔ کرنل ماربین لکھتا ہے کہ ہندوستان میں ایک طرف سکھوں اور پٹھانوں کی قد و قامت کو دیکھئے اور دوسری طرف مدراسیوں کے جسم کو تو تعجب ہوگا، حالانکہ معیشت و معاشرت یا افلاس و عسرت میں یہ سب برابر ہیں اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کی غذاؤں میں فرق ہے۔ چنانچہ کرنل ماربین نے بعض چوہوں کو علیحدہ رکھ کر وہ غذا دینی شروع کی جو سکھ اور پٹھان استعمال کرتے ہیں اور بعض کو وہ جو مدراسی کھاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ چوہے مدراسی چوہوں سے جسم میں بڑھ گئے اس کے بعد چوہوں کی متعدد جماعتیں کر کے مختلف ممالک کے لوگوں کی غذا علیحدہ علیحدہ دی گئی تو نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کی غذا کھانے والے چوہے بڑے جسم کے ہو گئے اور ان کی جلد نرم نرم ہو گئی، اور جن چوہوں کو جاپان کی غذا دی گئی ان کے جسم جھوٹے رہ گئے۔

بہر حال یہ امر تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ غذا کا افراد انسان کی جسم و صحت اور اس کے دماغ پر بہت کافی پڑتا ہے اور اگر اس پر توجہ کی جائے تو بہت سے امراض بھی دور ہو سکتے ہیں۔

آفتاب کے متعلق ایک جدید رائے

یہ ہے کہ آفتاب ہر جہت میں یکساں نور و حرارت و کمر بائیت نہیں پیدا کرتا بلکہ یہ منحصر ہے دوسرے سیاروں کے اجرام پر، ان کے اجتماع و تفرق پر اور اس قوت جذب پر جو آفتاب در اس کے تابع ستاروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ کیونکہ شعاعیں بھی بالکل مادی چیز کی طرح قوت جذب سے متاثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ جب زمین، مشتری سے قریب ہوتی ہے تو آفتاب اور زمین کے درمیان تجاذب بہت بڑھ جاتا ہے۔ اور اس وقت روشنی، حرارت اور کمر بائیت ہر چیز میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ اثر ان بارہ سال میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔

علماء ہئیت واقف ہیں کہ ہر گیارہ یا بارہ سال کے بعد آفتاب میں بہت بڑا داغ نمایاں ہوتا ہے جو کرہ زمین کی فضا میں نمایاں اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ جب زمین اور مشتری کا قریاں ہوتا ہے اس وقت یہ داغ نمایاں ہوتا ہے چنانچہ ۱۹۰۳ء، ۱۹۰۵ء، ۱۹۰۷ء میں کرہ زمین اور مشتری کا قریاں ہوا اور آفتاب کا داغ بھی انہیں سالوں میں نمودار ہوا۔ اسی طرح ستاروں کی روشنی میں بھی بہت اختلاف محسوس کیا جاتا ہے۔ وہی ایک ستارہ جو ایک زمانہ میں بہت روشن نظر آتا

دوسرے زمانہ میں دہندہ ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت کسی ستارہ کے گرد کوئی تاریک ستارہ گردش کرنے لگتا ہو تو وہ درمیان میں آکر کسوف پیدا کر دیتا ہو لیکن یہ تاویل تمام ستاروں میں کام نہیں دے سکتی، اس لئے جدید نظریہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ جب کسی ستارہ کے تحت ستارے اس کے گرد زیادہ جمع ہو جاتے ہیں تو آفتاب سے زیادہ لوہہ و حرارت جذب کرنے لگتے ہیں اور اس لئے وہ ستارہ زیادہ روشن نظر آنے لگتا ہے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو اس کی روشنی کم معلوم ہونے لگتی ہے۔ اسن کا استعمال جس طرح اب کیا جاتا ہے، اسبطرچ زمانہ قدیم میں بھی پایا جاتا تھا۔ کیونکہ تربت سے اسن کے فوائد بنی اسرائیل کا اس کو استعمال کرنا ثابت ہوتا ہے اور ہیرودوٹس کہتا ہے کہ جب مصر میں ہرم اکبر بن رہا تھا تو محدود اسن کھاتے تھے۔ فرجیلیوس میں بھی وصف ہے کہ یونانی اور رومانی سپاہی اس کا استعمال کرتے تھے۔ بارہویں صدی کے ایک مصنف کا قول ہے کہ کھیتوں میں حرارت آفتاب سے بچنے کے لئے کا شکار اس کو کھاتے ہیں۔ عرب کے اطباء اور فلاسفہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۲۱ء میں جب شہر مرسیلیا میں وبا پھیلی اور بہت سے لوگ مرنے لگے تو قید خانہ کے چار قیدیوں کو جنھیں بھانسی کی سزا دی جانے والی تھی حکم دیا گیا کہ وہ مردوں کو اٹھائیں لیکن ان پر وبا کا افونیس ہوا حکومت نے ان سے کہا کہ اگر وہ اس کا راز بتا دے گا تو غشی ہو جائیگی۔ انھوں نے کہا کہ وہ دوا اسن کا استعمال کرتے ہیں۔ بہر حال یہ قصص صحیح ہو یا غلط اسن میں بہت سے طبی فوائد مضمر ہیں۔ ابن رشد، ابن سینا، رازی، ابن بیطار وغیرہ نے لکھا ہے کہ اس سے بہت سے امراض کا علاج ہو سکتا ہے اور خود انھوں نے استسقاء، سینہ کے امراض، دانت کا درد، گردہ کا سنگریزہ اس سے دور کیا۔ ویدک میں بعض قسم کے بخاروں کا علاج اسن سے کیا جاتا ہے، مارگویدہ کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے اور شہد کے ساتھ ملا کر اس کا استعمال جلدی امراض کے لئے بھی مفید ہے۔ طب میں اس کا استعمال اس لئے کم کر دیا گیا تھا کہ اس کی بو بہت خراب ہوتی ہے اور اس کی تیزی بعض غلایاے جسم کو نقصان پہنچاتی ہے۔ لیکن مسٹر کلنٹ لیک کیساوی نے اسن کا تیل نکالا ہے اور یہ دونوں عیب اس کے دور کر دیئے ہیں۔ سات سال تک مسلسل اس کا استعمال کرنے کے بعد اس درد کو اس نے پیش کیا ہے۔ اور اس کا نام اس نے یادل (Yadol) رکھا ہے اس کے استعمال سے سل، انفلونزا، اسہال، صفائی دھم نزہ اور امراض عمدہ کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ایک ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اس نے یادل کے استعمال سے انفلونزائے بیماروں کا علاج کیا جنہیں سے ۷۷ دون کے اندر لپے ہو گئے۔

ضرورت ہے

اگر آپ کو خفیہ دریاں اور چری سامان کی ضرورت ہو تو فوراً آپس ایک کارڈ لکھئے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزانی سے دستیاب ہے۔ ہمارے بڑے رمانا ہمارے ہی یہاں سے سال منگاتے ہیں فرست اردو ہندی یا انگریزی کی ہنگامہ خفہ فرمائے ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا ہے محمد حسین اینڈ کمپنٹ مرحیت فتح پور (پنجاب)۔

